تدریسِ اردو

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ناشر

مکتبہ جامعہ تعلیم ملی ملیر سٹی کراچی

سول ایجنٹ

قمر کتاب گھر ۵۹/اے اردو بازار کراچی

تدریسِ اُردو

(ثانوی اور ابتدائی مدارس کے زیر تربیت اساتذہ کے لئے)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ناشر

مکتبہ جامعہ تعلیم ملّی، ملیر سٹی۔ کراچی

سول ایجنٹ :۔ قمر کتاب گھر ۵۹/اے اُردو بازار کراچی

ناشر ——— مکتبہ جامعہ تعلیم ملّی

طبع اوّل ——— ۱۹۶۲ء

طبع دوم ——— ۱۹۷۲ء

تعداد ——— ایک ہزار

طباعت ——— جاوید پریس کراچی

قیمت ——— [redacted]

فہرست مضامین

صفحات

اِنتساب

ملک کے ممتاز نقاد و محقق اور ماہر لسانیات
اُستاذی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ڈین فیکلٹی
آف آرٹس جامعہ کراچی کے نام۔

فرمان فتح پوری

کتاب سے پہلے

اُردو، اپنے علمی و ادبی سرمایہ کی بناء پر، ایشیائی زبانوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اپنے حلقۂ اثر اور قبولِ عام کے لحاظ سے ممتاز ترین ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ علم و فن کا شاید ہی کوئی شعبہ یا موضوع ہو جس کے متعلق کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود نہ ہو، ہاں اُردو کے تعلیمی و تدریسی مسائل پر البتہ بہت کم توجہ دی گئی ہے، نتیجتہً، مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اُردو کا یہ شعبہ بہت کمزور ہے، کتابیں ہیں لیکن اتنی کم تعداد میں کہ اُنہیں اُنگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ یہی کمی تھی جسے مجلسِ جامعہ تعلیم ملّیہ کے ارکان نے محسوس کیا اور اُردو کے تدریسی مسائل پر ایک کتاب کی تالیف کا کام میرے سپرد ہوا، میں نے ۱۹۶۲ء میں کتاب مکمل کر دی اور اُسی سال مکتبۂ جامعہ تعلیم ملّیہ نے اُسے شائع کر دیا۔

ہر چند کہ یہ کتاب مختصر تھی اور اُس کے موضوعات کا دائرہ بھی عام طور پر ابتدائی اور وسطانی مدرسوں کے اساتذہ یعنی پی، ٹی، سی اور سی، ٹی یا سی، ایڈ کے طلبہ کی رہنمائی تک محدود تھا۔ بایں ہمہ چونکہ اس کتاب میں زیادہ تر تدریسِ زبان کے اساسی مسائل ہی پر گفتگو کی گئی تھی اس لئے ثانوی مدارس کے زیرِ تربیت معلمین یعنی بی، ایڈ کے طلبہ کے لئے بھی اسے مفید سمجھا گیا۔ تربیتی اداروں کے ہر منزل کے اُردو نصاب میں اُسے جگہ دی گئی، اُردو کے سارے اساتذہ نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، مبصرین نے نہایت حوصلہ افزا آرا کا اظہار کیا، اور زبان و ادب کے پارکھوں نے اسے ایک معیاری کتاب قرار دے کر میرا دل بڑھایا۔

کتاب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے مجھے اس کی نظرِ ثانی پر مجبور کیا۔ نظرِ ثانی کے نتیجے میں اس کتاب میں

زبان اور تدریس زبان کے وہ سارے مباحث و مسائل جگہ پا گئے جو پہلے اڈیشن میں زیر بحث آنے سے رہ گئے تھے، اب یہ کتاب اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے پی، ٹی، سی۔ سی، ٹی اور بی ایڈ کے نصابوں پر حاوی ہے۔ اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں یہ پہلی جامع تالیف ہے جو تدریسِ زبان کے جدید تر اصولوں اور تقاضوں کے مطابق لکھی گئی ہے اور جس میں ہر منزل اور ہر سطح کے تدریسی طریقۂ کار سے بحث کی گئی ہے۔ کہنے کو تو تازہ اڈیشن، پہلے اڈیشن پر نظرِ ثانی کا نتیجہ ہے۔ لیکن حقیقتاً، اس میں اتنی تبدیلیاں اور اتنے اضافے کئے گئے ہیں کہ اسے یکسر تازہ تالیف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، بہت سے موضوعات اور عنوانات ایسے ہیں، جو پہلے بھی زیر بحث آئے تھے۔ لیکن زیر نظر اڈیشن میں ان بحثوں کو زیادہ مفصل، مدلل اور معلومات افزا بنا دیا گیا ہے۔

موجودہ صورت میں یہ کتاب فی الواقع کیسی ہے کیا ہے؟ اس کے جواب میں میری نہیں قارئین ہی کی رائے صائب ہوگی، مجھے تو اس جگہ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ یہ کتاب سی ٹی، یا بی ایڈ کے نصاب کی محض تشریح نہیں ہے، یہ اس غرض اور اس انداز سے نہیں لکھی گئی کہ زیر تربیت اساتذہ اس کے متن کو حفظ کر کے کسی نہ کسی طرح امتحان میں کامیابی حاصل کر لیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے حق میں یہ کتاب تدریسی مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنے اور علم و آگہی کے نئے اُفق دکھانے کا وسیلہ بن سکے، اس کتاب میں بتائے ہوئے اصولوں اور بحثوں کو اساتذہ و طلبہ اپنے تجربات کی روشنی میں پرکھیں۔ حسبِ ضرورت اُن میں ترک و اختیار سے کام لیں اور ترمیم و اضافہ کے عمل کے ذریعے اُردو کی تدریس کو زیادہ سے موثر اور کارگر بنانے کی راہیں نکالیں۔ یوں بھی کوئی اچھی کتاب حقیقتاً نصاب کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی جاتی بلکہ زبان کی تعلیم و تدریس کے مقصد و معیار کا لحاظ رکھ کر اس لئے لکھی جاتی ہے کہ وہ نصاب کی ترتیب میں معاون ثابت ہو مجھے یقین ہے کہ زیر نظر کتاب ایک طرف سی ٹی اور بی ایڈ کے نصابوں کی تدوین میں مدد دے گی دوسری طرف امتحان ہی میں نہیں بلکہ امتحان کے بعد بھی وہ اُن کی معلمانہ زندگی میں، زبان کے بعض مسائل و مباحث میں رہنمائی کرے گی۔

میں نے اس کتاب کی تسوید و ترتیب میں اُردو انگریزی کی متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کا مواد اور اس کی بحثیں محض کتابی استفادے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں میری طویل معلمانہ زندگی کے تجربات بھی شامل ہیں، ایک تربیت یافتہ استاد کی حیثیت سے میں نے کئی سال سرکاری ثانوی

مدارس اور اساتذہ کے تربیتی اداروں میں کام کیا ہے، پچھلے پندرہ سال سے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوں لیکن اس عرصے میں بھی میرا تعلق، ثانوی اور ابتدائی مدارس کی تدریسی منزلوں سے کسی نہ کسی طرح قائم رہا ہے، جامعہ ملیہ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اور جامعہ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے طلبہ و طالبات کو میں ہفتے میں ایک دو لیکچر، اعزازی طور پر دیتا رہا ہوں اور اب بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر باقی ہے واقعہ یہ ہے کہ اسی سلسلے کی بدولت مجھے زبان کے تدریسی مسائل اور اساتذہ کی مشکلات پر مسلسل غور و فکر کا موقع ملا اور اسی غور و فکر نے آخر آخر ارکانِ جامعہ ملیہ کے اشارے پر موجودہ کتاب کی صورت اختیار کر لی۔

اس کتاب کی ترتیب کے دوران میں بہت سے احباب نے میری مدد کی ہے اور بہت سے بزرگوں نے میری رہنمائی فرمائی ہے، یہ سب میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں، میں سب سے زیادہ احسان مند ہوں، مخدومی و محترمی ڈاکٹر محمود حسین صاحب صدر مجلس جامعہ تعلیم ملیہ کا جن کی تحریک و ترغیب کا نتیجہ یہ کتاب ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم، بلند پایہ عالمِ تاریخ اور صاحب الرائے دانشور ہیں، اُن کی ذات و صفات سے علم و فکر کے نہ جانے کتنے گوشے منور اور اُن کی خاندانی شرافت و انسان دوستی کی بدولت تہذیبی زندگی کی نہ جانے کتنی اعلیٰ قدریں زندہ ہیں۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت کے وقت وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، دوسری اشاعت کے وقت وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی صحت و عمر میں ارزانی فرمائے اور اُن کے منصب و اعزاز میں اضافہ کرے۔

گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹوٹ کراچی کے سابق پرنسپل خواجہ محمد صدیق، گورنمنٹ ٹریننگ کالج بہاول پور کے سابق پرنسپل پروفیسر چودھری عبدالغفور اور جامعہ انسٹی ٹوٹ آف ایجوکیشن ملیر کے ڈائریکٹر چودھری محمد علی کے مشوروں اور رہنمائیوں کا ذکر میں پہلے اڈیشن میں بھی کر چکا ہوں اور آج بھی میں ان بزرگوں کا شکر گزار ہوں، تازہ اڈیشن کے سلسلے میں ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد عبدالعزیز، اور جامعہ ملیہ ٹیچرس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر انوار خلیل، بطور خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کے قیمتی مشوروں سے کتاب کو جامع اور مفید تر بنانے میں بڑی مدد ملی ہے۔

جامعہ تعلیم ملیہ کے سکریٹری جناب عبدالحی صاحب کی توجہ اور دلچسپی کے نتیجے میں کتاب کی طباعت و

اشاعت کی منزلیں بہ آسانی اتنی تیزی سے طے ہو گئیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔
جناب محمد انوار صاحب اور جناب اختر حسین صاحب یوں شکریہ کے مستحق ہیں کہ کتابت و جلدبندی اور پروف ریڈنگ کے مرحلے، انہیں دونوں کی کوششوں سے بہ حسن و خوبی طے ہو سکے۔

فرمان فتحپوری
۲۵؍اکتوبر ۱۹۷۲ء

زبان اور اُردو زبان

"زبان" ہمارے جذبات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی کی بدولت انسان کو عام حیوانوں کے مقابلہ میں "حیوان ناطق کہا گیا ہے" اور دنیا کی دوسری جاندار وبے جان چیزوں سے بہتر وبرتر سمجھا گیا ہے سچ پوچھو تو زبان ہی نے دنیا میں تہذیب وتمدن اور مل جُل کر رہنے بسنے کی بنا ڈالی ہے۔ اگر زبان ایجاد نہ ہوتی تو انسانی معاشرت وتہذیب کا نام بھی سُننے میں نہ آتا۔

زبان کب اور کہاں ایجاد ہوئی۔ اس کے متعلق وقت اور جگہ کا تعین بہت مشکل ہے۔ بلکہ بولی جانے والی یا تقریری زبان کی قدامت سے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے وہ روزِ اول سے انسان کے ساتھ آئی ہے اس لئے کہ تاریخ کے ہر عہد اور افراد کے ہر گروہ میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ تاریخ کے محققین اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے مصر، عراق اور وادی سندھ کی تہذیبوں کو قدیم ترین بتایا ہے ان علاقوں میں جو نئی کھدائیاں ہوئی ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش سے ۵۰۰۰ سال پہلے جو لوگ یہاں آباد تھے وہ فن تحریر سے بھی واقف تھے۔ آج ہم اس زبان کو صحیح طور پر پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف تقریری صورت نہیں بلکہ زبان کی تحریری صورت بھی دنیا کے مختلف علاقوں اور زمانوں میں موجود رہی ہے اور اسی کی بدولت کسی مخصوص علاقے کے لوگ مہذب اور شائستہ کہلائے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ زبان کس طرح وجود میں آئی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے شروع میں انسان نے اپنی معاشی وسماجی ضرورتوں اور جذباتی کیفیتوں کے اظہار کے لئے کچھ آوازیں نکالی ہونگی لوگوں نے جسم کی حرکات وسکنات اور موقع محل کی مدد سے ان آوازوں کا مفہوم سمجھ لیا ہوگا۔ مثال کے طور پر آہ۔ اُف۔ تُف۔ ہائے۔ اُو۔ ارے۔ وائے وغیرہ کو لیجئے۔ یہ آوازیں آج بھی اپنے معنی رکھتی ہیں۔ اسی طرح ہر ضرورت ہر جذبے اور ہر خیال کے اظہار کے لئے مختلف آوازیں نکالی گئی ہونگی۔ رفتہ رفتہ ان آوازوں کے معنی متعین ہو گئے ہوں گے۔ اور باہم تبادلہ خیال کے لئے ایک بولی جانیوالی

زبان وجود میں آگئی ہوگی۔

جہاں تک زبان کی تحریری صورت کا تعلق ہے وہ بھی تقریباً اسی انداز سے وجود میں آئی ہے۔ آج بھی ہم منہ سے کچھ کہے بغیر اکثر ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی ہم چپکے سے کسی کی "انگلی دبا کر" یہ سمجھاتے ہیں کہ اسے خاموشی سے کام لینا چاہیے۔ کبھی انگلی سے چٹکیاں بجا کر "کام کے ختم ہونے یا کسی کے رخصت ہونے" کو واضح کرتے ہیں۔ کبھی تالیاں پیٹ کر کسی کو خوش آمدید کہتے ہیں اور کبھی مذاق اڑاتے ہیں۔ کبھی اپنے منہ پر طمانچے مار کر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں کبھی عددوں کا نام لئے بغیر صرف انگلیاں دکھانا کافی سمجھتے ہیں۔ گاہے دانت کے نیچے انگلی دبا کر، تعجب اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر، غم و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی گردن یا سر ہلا کر اقرار یا انکار کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ چیزیں وسیلۂ اظہار خیال یا زبان کے وجود میں آنے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ انسان نے ابتداءً صرف اشاروں میں اپنی بات کہی ہوگی۔ جو چیزیں موجود رہی ہونگی ان کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے یا ان پر انگلیاں رکھ کر اپنا مقصود ظاہر کیا ہوگا۔ جو چیزیں نظر کے سامنے نہ رہی ہونگی ان کو سمجھانے کے لئے خطوط، خاکے اور تصویریں بنا کر اشارے کئے گئے ہونگے۔ رفتہ رفتہ ان خطوط، خاکوں اور تصویروں کو اظہار خیال کے لئے مستقلاً استعمال کیا جانے لگا۔ اور اس طرح نقوش اور علامتوں کے ذریعے انسانی خیالات و اظہار کی صورت نکل آئی۔ ہر قسم کی آواز اور ہر قسم کے اشارے کے لئے ایک نقش یا نشان مقرر کر لیا گیا۔ پھر یہ اشارات و نشانات مختلف آوازوں کے نمائندے بن گئے اور ان کا نام آخر آخر "حرف" پڑ گیا۔ حرف دراصل ایک قسم کی آواز کا نام ہے۔ ان آوازوں یا حرفوں کے ملنے سے الفاظ بنے۔ الفاظ سے فقرے فقروں سے عبارت اس طرح صدیوں کی کوششوں کے بعد انسانی عقل و شعور نے اپنے تبادلۂ خیال کی ایک مستقل صورت پیدا کر لی۔ اسی صورت کا نام زبان ہے اور اس میں تقریر و تحریر دونوں شامل ہیں۔

ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ زبان دراصل انسان کی سماجی و معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے اور آج بھی کوئی نئی زبان انہیں ضرورتوں کے ماتحت وجود میں آتی ہے سماجی زندگی ہی کے سہارے ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اور اسی کے زیر اثر اس کی صورت و معنی میں

تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان یا تاریخ کو دراصل کسی قوم کی سماجی ترقی و تنزل کی تاریخ خیال کرنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح اپنے سماجی محرکات و عوامل کی پابند ہوتی ہے اور اپنے ماحول یا اپنی سوسائٹی سے ناتا توڑ کر زیادہ دنوں تک نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ آگے قدم بڑھا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح آجکل کسی قوم یا ملک کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف ہمسایہ ملکوں یا قوموں بلکہ دور دراز کے ملکوں اور قوموں سے بھی زیادہ سے زیادہ تعلقات و روابط قائم کرے بالکل اسی طرح کسی زندہ رہنے والی زبان کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں سے اس کا ربط و ضبط کسی نہ کسی صورت میں بڑھتا رہے۔ بغیر اس کے نہ کوئی قوم بین الاقوامی مسائل میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کوئی زبان بین المملکتی ربط و اتحاد کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اسی لئے زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے یکسر خالی ہے اردو زبان بھی اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اُردو میں مختلف زبانوں کے جو الفاظ ملتے ہیں ان کی نوعیت دوسری زبانوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان میں خود اس کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سارا سرمایہ دوسری زبانوں سے آیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اُردو کی بنیاد ہی مختلف زبانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے اُردو گویا بین الاقوامی زبانوں کی ایک انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے عام و خاص ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوئے ہیں چنانچہ اردو زبان کا کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس میں دو تین زبانوں کے الفاظ شامل نہ ہوں۔ ذیل کے چند الفاظ دیکھئے کہ وہ کن کن زبانوں اور کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً اُردو زبان کی مجموعی ساخت اور اس کی پیدائش کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

(۱) اُردو۔ بیگم۔ توپ۔ اتالیق۔ قلی۔ قورمہ۔ خاتون وغیرہ ترکی زبان کے الفاظ ہیں۔

(۲) صندوق، کرسی۔ قلم۔ کتاب۔ دوا۔ علاج۔ عربی سے آئے ہیں۔

(۳) گُل و غنچہ۔ برگ و بار اور آب و خاک وغیرہ فارسی کا عطیہ ہیں۔

(۴) پیپا ۔ بالٹی ۔ تولیہ ۔ نیلام ۔ فیتہ ۔ وغیرہ پرتگالیوں کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئے ۔

(۵) کمرہ ۔ اطالوی زبان کا لفظ ہے ۔

(۶) کاغذ ۔ چائے ۔ تام جھام ۔ چوں چوں (چوں چوں کا مربہ) چین سے آئے ہیں ۔

(۷) ناول ۔ ڈراما ۔ گلاس ۔ راشن ۔ ریل ۔ اسٹیشن ۔ موٹر ۔ کالج ۔ جونیئر ۔ سینیئر وغیرہ انگریزی سے لئے گئے ہیں ۔

(۸) باپ اور گودام ملایا میں بھی انہیں معنوں میں اسی طرح بولے جاتے ہیں ۔

(۹) فیلسوف اور اصطرلاب یونانی سے آئے ہیں ۔

(۱۰) پنڈت ۔ رشی ۔ برکھا رت ۔ سنسکرت سے آئے ہیں ۔

(۱۱) کھانا ۔ اٹھنا ۔ بیٹھنا ۔ لکھنا ۔ پڑھنا ۔ قدیم مقامی بولیوں اور بھاشا یا ہندی سے لئے گئے ہیں ۔

ان الفاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے اور اس میں صرف عربی ، فارسی یا مقامی بولیوں کے الفاظ نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان کے الفاظ کم و بیش شامل ہیں ۔ اُردو کے حروف تہجی کا بھی یہی حال ہے ۔ چونکہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس میں دنیا کی مختلف زبانوں کے حروف یا آوازیں شامل ہیں اس لئے اس کے حروف تہجی کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے لیکن اس بحث سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ " اردو" عربی ، فارسی سنسکرت یا کسی اور زبان کا ہو بہو چربہ یا نقل ہے ۔ اس نے کچا مال یا گارا چونا یقیناً ادھر ادھر سے جمع کیا ہے ۔ لیکن اس کی تعمیر، دوسری زبانوں سے الگ تھلگ اپنے طور پر ہوئی ہے اور اپنی رعنائی ، صناعی اور افادیت کے لحاظ سے وہ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے ۔ اس نے دوسری زبانوں سے استفادہ کیا ہے لیکن کسی کی تقلید یا تتبع کو اپنا شعار نہیں بنایا ۔ اس نے بعض مفید اور ضروری الفاظ اور اجزاء دوسری زبانوں سے لئے ہیں لیکن اپنی ساخت ۔ مزاج اور سیرت کو کبھی دوسری زبانوں کے تابع نہیں کیا ۔ اس کی اپنی ایک علیحدہ مستقل حیثیت ہے اور وہ اپنی ظاہری و معنوی خصوصیات و محاسن کے اعتبار سے دنیا کی اہم زبانوں میں شمار کی جاتی ہے

اُردو ادب نے بعض شعبوں میں یقیناً فارسی و عربی کی تقلید کی ہے لیکن اس تقلید کا تعلق اردو کے باطن سے نہیں بلکہ صرف ظاہر سے رہا ہے۔ اُردو شاعری نے وزن بحر اور اصناف سخن مثلاً غزل قصیدہ۔ رباعی اور مثنوی وغیرہ میں بے شک فارسی عربی دونوں کی پیروی کی ہے لیکن اپنے اثر، لب ولہجہ اور موضوع کے اعتبار سے اردو ادب یا شاعری فارسی اور عربی سے الگ مزاج رکھتی ہے نثر میں اردو افسانہ۔ ڈرامہ۔ ناول۔ اور تنقید وغیرہ کے شعبے ایسے بلند معیار کو پہنچ گئے ہیں کہ موجودہ فارسی یا عربی ان سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ اس لئے اُردو کو مخلوط یا مشترک زبان کہہ کر یہ مراد لینا کہ وہ دوسری زبانوں کی محض نقل ہے درست نہیں ہے۔ جیسا ابھی کہا گیا ہے اردو اپنے لب ولہجہ، رکھ رکھاؤ۔ روزمرہ ومحاورہ، انداز بیان، موضوع ومواد اور مختلف الفاظ کے استعمال وایجاد کے لحاظ سے ایک علیحدہ زبان ہے۔ اس نے اپنی ساخت، مرکبات کے اصول اور قواعد میں ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ کسی کی پابند نہیں ہی بلکہ اس نے اپنی لغت۔ اپنا اسلوب۔ صرفی ونحوی قاعدے۔ واحد جمع اور تذکیر وتانیث کے اصول الگ بنائے ہیں اور انہیں کی پابندی اردو کی فصاحت وبلاغت اور حسن واثر کا معیار متعین کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُردو غلاموں اور لونڈیوں کی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی یا ہندی وترکی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی نہیں رہی، بلکہ اردو نے ان زبانوں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے جو ٹکر کی زبانیں آپس میں کرتی ہیں۔ اردو نے جو الفاظ دوسری زبانوں سے لئے ہیں ان کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا بلکہ پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ دیکھا بھالا۔ جانچا پرکھا جو اس کے مزاج کے موافق تھے انہیں جیسے تھے ویسے ہی رہنے دیئے۔ جو مزاج کے خلاف پڑے انہیں بے دھڑک کاٹا پیٹا چھانٹا۔ گھسا گھسایا۔ اور چھیل چھال کر اپنی پسند کا بنالیا۔ کانٹ چھانٹ اور تبدیل وتصرف کا یہ عمل جسے اُردو بنانا یا مورد کرنا کہنا چاہئے۔ حروف تہجی کی آوازوں۔ الفاظ کے تلفظ ان کے معنی اور املا ہر شعبے میں ہوا ہے۔ ع۔ ق اور ص یقیناً عربی سے اردو میں آئے ہیں۔ لیکن ان کی آوازیں ہم اس طور پر ادا نہیں کر سکتے جس طرح اہل عرب بولتے ہیں۔ سنسکرت کے "ڑ" اور فارسی کے "ژ" کا بھی یہی حال ہے اس لئے اردو میں ان کی اصل آواز نکالنے پر زور دینا مناسب نہیں ہے۔ حروف کی طرح الفاظ کے تلفظ میں بھی بے شمار تغیرات واقع ہوئے ہیں۔

مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالیے۔

(۱) سیّد

(۲) جیّد

(۳) موسم

(۴) کافر

یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں اور ان میں آخری حرف سے پہلے زیر آتا ہے لیکن پہلے دو لفظ کو زیر کے ساتھ نہیں بلکہ ہمیشہ زبر کے ساتھ بولتے ہیں۔ چونکہ ان بولنے والوں میں عام و خاص سب شامل ہیں۔ اس لئے بہ اعتبار اردو ان کے تلفظ کو درست سمجھنا چاہیئے۔ موسم اور کافر آخری حرف کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ بولے جاتے ہیں اور انہیں ہمارے مستند شاعروں اور ادیبوں نے دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ اس لئے اس کے دونوں تلفظ درست ہیں۔ الغرض عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور ترکی کے سینکڑوں الفاظ اردو میں ایسے ہیں جو اپنے اصل تلفظ کے برعکس مستعمل ہیں مثلاً ذیل کے الفاظ دیکھئے۔

اصلی تلفظ	اردو تلفظ	اصلی تلفظ	اردو تلفظ
حِلیہ	حُلیہ	جُمہور	جَمہور
بَرَکت	بَرْکت	رَعَایا	رِعایا
حَرَکت	حَرْکت	شُعُور	شَعُور
اُسْتُرہ	اَسترہ	صاحِب	صاحَب
جَیب	جیب	سُوال	سَوال
اُعجُوبہ	عَجُوبہ	خِزانہ	خَزانہ
بیگُم	بیگَم	خوگِر	خوگَر
مُزدور	مَزدور	جُوش و خُروش	جُوش و خَروش
سُفارش	سِفارش	وَرْش	بَرَس
کرشنہ	کرشن	راونڑ	راون

لَکشمی	لچھمی	آشٹ	آٹھ
کَرَم	کَرَم	دُھرم	دَھرَم
خَرمن	خِرمن	پَنجرہ	پِنجرہ - پنجڑا
آچار	اَچار	چُپقلش	چَپقلش
رِضا	رَضا	کرآء	کرایہ

غرض دوسری زبانوں کے اکثر الفاظ کا تلفظ اُردو والوں نے اپنے ماحول و مزاج کے مطابق ڈھال لیا ہے ۔ اور ان ڈھلے ہوئے تلفظ کو درست خیال کرنا چاہئے ۔ اور بے سبب اصل تلفظ ادا کرنے پر زور نہ دینا چاہئے ۔ لیکن اس زمرہ میں وہی الفاظ آتے ہیں جو خاص و عام میں مستعمل ہو گئے ہیں ۔ اور تعلیم یافتہ طبقے میں بولے جاتے ہیں ۔ سارے الفاظ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ اسی کے ساتھ اگر اصل تلفظ سے واقف رہنے کی بھی کوشش کی جائے تو زباندانی کے سلسلے میں بڑی مفید ثابت ہوگی ۔

تلفظ کی طرح اکثر الفاظ کے معنی میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ۔ عربی میں وقت کی جمع اوقات ہے اور اوقات کا لفظ زمانہ اور مدت کے معنی دیتا ہے ۔ لیکن اردو والے یوں بھی بولتے ہیں کہ " انسان کو اپنی اوقات سے آگے نہ بڑھنا چاہئے " ۔ یہاں اوقات کے معنی حیثیت کے ہیں ۔ عربی کا ایک فقرہ تھا " لا الی الذین ولا الی الذین " یعنی ان میں نہ ان میں ۔ اُردو میں یہ فقرہ اس طور پر مقبول نہ ہوا ۔ اور انہوں نے اس سے " نہ اللّذی نہ اللّذی " بنا لیا ۔ عربی میں صلوٰۃ کے معنی رحمت و درود کے تھے ۔ اُردو والوں نے اس کی جمع صلواتیں ۔ بنائی ۔ عربی کے صلوٰۃ سب پڑھا کرتے تھے لیکن اردو میں صلواتیں سننا کوئی پسند نہیں کرتا ۔ اسی طرح اصل عربی لفظ " افراط و تفریط " تھا بگڑتے بگڑتے اردو میں " افراتفری " ۔ ہوگیا ۔ صورت و سیرت دونوں بدل گئی ۔ ہندو، گنیش پوجا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور گنیش کو متبرک دیوتا مانتے ہیں ۔ اُردو والوں نے اس کے پہلے ۔ گوبر کا اضافہ کرکے گوبر گنیش بنا لیا ۔ اور اس کے معنی بے وقوف و کاہل قرار دیئے ۔ عربی کا لفظ " حضرت " پیغمبر اور بزرگوں کے نام سے پہلے بطور احترام مستعمل تھا ۔ لیکن اُردو میں یوں بھی بولتے ہیں کہ " آپ بڑے حضرت ہیں " یہاں حضرت کے معنی پہلے معنی سے کس درجہ مختلف ہیں ۔ " لن ترانی " (یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا) کلام خداوندی ہے اور قرآن میں

حضرت موسیٰ کے "ربّ ارنی" کے جواب میں آیا ہے۔ اردو میں یہ ٹکڑا عربی لغت سے الگ خودستائی اور انانیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے "عرس" عربی زبان میں شادی۔ دعوت اور ولیمہ کے معنوں میں آتا ہے۔ اردو میں کسی بزرگ کے سالانہ فاتحہ کو کہتے ہیں۔ الم نشرح۔ بھی کلام الٰہی ہے اور "الم نشرح لک صدرک" کا مخفف ہے۔ جس کے معنی ہیں "کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا" اُردو میں ظاہر اور واضح اور مشہور کے معنی لئے جاتے ہیں۔ سنسکرت میں "کھٹ راگ" کے معنی ہیں چھ راگ، اُردو والوں نے اس کھٹ راگ کو جھمیلا اور بکھیڑا کے معنی دے دیئے۔ عربی کے اَب کو اَبّا اور اُم کو امّاں بنا لیا گیا۔ لیکن اب وجد یا آبا و اجداد میں اصل صورت باقی رہی۔

ذیل میں عربی کے چند الفاظ دیئے جاتے ہیں۔ دیکھئے ان کے اصل معنی کیا تھے اور اُردو میں آکر کیا ہو گئے۔

لفظ	عربی معنی	اُردو
اللہ غنی	اللہ غنی ہے	کلمۂ تعجب
افواہ	فوہ بمعنی منہ کی جمع	جھوٹی خبر
اقبال	آگے بڑھنا	خوش قسمتی
اہلیہ	صلاحیت	بیوی
انکسار	ٹکڑے ٹکڑے ہونا	عاجزی
بساط	ایک قسم کا فرش	حیثیت
حجّام	فصد کھولنا	نائی
بخار	بھاپ	بخار (بیماری)
خیرات	نیکیاں	دان پُن
خاطر	دل	مروت۔ لحاظ
رقیب	نگہبان	حریف۔ مقابل
صدمہ	ٹکر	غم
صلاح	نیکی	مشورہ

قارورہ	شیشے کا برتن	پیشاب یا پیشاب کا برتن
خط وکتابت	ـــــــ	مراسلت
تکرار	دوبارہ کہنا	جھگڑا
عرصہ	صحن ۔ میدان	مدّت
خصم	دشمن	شوہر
غریب	پردیسی	نادار
غلاظت	گاڑھا	گندگی
غنیم	مال غنیمت پانے والا	دشمن
قائل	کہنے والا	تسلیم کرنے والا
ماتحت	جو نیچے ہو	تابع
نعت	وصف	مدح رسول
اولاد	ولد کی جمع	بال بچے
عزیز	بزرگ ۔ جلیل	رشتہ دار
ہنبق	ایک بیوقوف مشہور ہے	ہونق ۔ احمق
اخلاص	خالص کرنا	پیار ومحبت

عربی کی طرح دوسری زبانوں کے ساتھ بھی اُردو نے اس قسم کے تصرفات کئے ہیں "اردو" کے معنی ترکی میں شاہی کیمپ یا لشکرگاہ کے تھے ۔اردو میں مخصوص زبان کا نام ہوگیا ۔ انگریزی میں "ریل" کے معنی لوہے کی پٹری کے ہیں ۔ اُردو میں "ریل" کو ٹرین کے معنی پہنا دیئے گئے ۔ بعد میں ایک ہندی لفظ لگاکر ریل گاڑی بنالیا ۔ ڈاک خانہ کی ترکیب بھی اسی قسم کی ہے ۔ لالٹین ۔ ٹکٹ ۔ فیس (FEES) اور ماچس کے اصل تلفظ پر غور کیجئے ۔ اردو میں کیا سے کیا ہوگئے ہیں ۔ "بیرنگ" (BEARING) کا لفظ بھی اُردو میں اپنے خاص تلفظ کے ساتھ داخل ہوگیا ۔ آج کل بیرنگ خط اور بیرنگ لفافہ کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے (HOSPITAL) اور (ENGIN) کے اصل انگریزی تلفظ کو نظر انداز کرکے اُردو والے اسپتال اور انجن

بولتے ہیں اب یہ اُردو کے الفاظ ہیں اور ان کا بگڑا ہوا تلفظ ہی اُردو میں درست ہے۔ کارڈ اور فارم کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔

غرض نہ صرف عربی، فارسی بلکہ انگریزی الفاظ کے تلفظ و معنی میں بھی حسب ضرورت تغیر و تبدّل ہوا ہے۔ تلفظ و معنی کی طرح الفاظ کے املا یا ان کی تحریری صورتوں میں بھی اکثر تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ عربی کی قمیص پر ایک نقطہ بڑھا کر قمیض بنا لیا ہے۔ عربی میں دراصل "فی زماننا" تھا اردو میں "فی زمانہ" ہوگیا۔ "بالکلیہ" کی صورت "بالکل" میں تبدیل ہوگئی۔ عربی کے بعض حرف پر تنوین یعنی دو زیر۔ دو زبر یا دو پیش آتے ہیں۔ اور "ن" کی آواز پیدا کرتے ہیں۔ جیسے "مجیدٌ" اور "شریفٌ" وغیرہ اُردو میں ان کی تحریری صورت مجیدن اور شریفن ہوگئی اور اب کس کی مجال ہے جو انہیں غلط کہے۔

تلفظ، معنی اور املا کی طرح واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول میں بھی کسی زبان کی خاص پابندی نہیں رہی۔ عربی میں طائر جمع ہے طیر کی۔ لیکن اُردو والے طائر کو واحد استعمال کرتے ہیں اور فارسی قاعدے سے جمع بنا کر "طائران چمن" وغیرہ کی ترکیبیں بنا لیتے ہیں۔ اولاد جمع ہے ولد کی لیکن اُردو والے اسے واحد خیال کرتے ہیں اور اس کی جمع اولادیں بولتے ہیں۔ حُور دراصل حوراء کی جمع ہے لیکن اردو میں واحد ہے اور اس کی جمع "حوران" مستعمل ہے۔ اُصول عربی میں اصل کی جمع ہے لیکن اُردو میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے۔ تذکیر و تانیث کا بھی یہی حال ہے۔ شمس بمعنی سورج عربی میں مونث تھا۔ اُردو میں مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کتاب عربی میں مذکر ہے لیکن اردو میں مونث مستعمل ہے۔

فصاحت و بلاغت کا معیار بھی اردو کا اپنا جداگانہ ہے۔ یہاں دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال اور ان کے صحیح یا غلط اور غریب و فصیح ہونے کے اصول بھی علیحدہ ہیں۔ جب تک کوئی شخص ان اصولوں پر نظر نہ رکھتا ہو وہ اُردو کی مزاج شناسی اور اسے صحیح طور پر برتنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص فارسی کے الفاظ "دست، گل، چشم، خانہ، مے وغیرہ کو ان کے معنی کا لحاظ رکھ کر اُردو میں یوں بولے یا لکھے کہ

۱۔ اس نے مصافحہ کے لئے **دست** بڑھایا۔

۲ - یہ گل بہت اچھا ہے ۔
۳ - میری چشم میں درد ہے ۔
۴ - وہ اپنے خانہ کو گیا ۔
۵ - وہ مے بہت پیتا ہے ۔

تو استعمال درست نہ ہوگا ۔ قواعد کی رو سے یہ جملے صحیح ہیں لیکن اُردو کے روزمرہ کے لحاظ سے غلط ہیں ۔ یہ الفاظ الگ الگ فصیح و بلیغ سہی لیکن یہاں یہ الفاظ عبارت میں فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کے بجائے ایک قسم کا بھونڈا پن اور مضحکہ خیز پہلو پیدا کرتے ہیں ۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ الفاظ اگرچہ دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں لیکن ان کے استعمال میں اُردو والے اصل زبان کے اصول کے پابند نہیں ہیں ۔ اُردو میں عربی فارسی کے مفرد الفاظ کا استعمال اول تو بہت کم ہوتا ہے دوسرے ان کا استعمال اسی وقت کلام کے حسن و زور و فصاحت میں مدد دیتا ہے جبکہ انہیں فارسی ترکیب یا مرکب بنا کر استعمال کیا جائے ۔ مثلاً دست درازی ، گل پیراہن ۔ آشوب چشم ۔ خانہ بدوش ۔ اور مے نوش و مے خانہ وغیرہ ۔

غرض اُردو مخلوط اور مشترک زبان ہونے کے باوجود کسی زبان کی مقلد یا تابع نہیں ہے ۔ حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت ۔ جملوں کی بناوٹ ۔ تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے اصول اور الفاظ کے استعمال تک میں اس کا اپنا معیار اور اس کا اپنا مخصوص لب و لہجہ ہے ۔ چنانچہ اُردو کے طالب علم کو اپنی زبان کی اس خصوصیت اور لچک پر ضرور نظر رکھنی چاہئے ۔ مولوی عبدالحق اُردو زبان کے مزاج و ساخت کے اس پہلو کو ذہن میں رکھ کر لکھتے ہیں " یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب کوئی لفظ ہماری زبان میں آگیا اور اس طرح بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا ، ہمارا ہو جاتا ہے ۔ اسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہتا ۔ دوسری زبان میں مل جانے سے نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت ۔ وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور کوئی اسے وہاں گھسنے نہ دے گا" ۔ دیگر زبانوں کے اس اختلاط اور دخیل الفاظ کے اس طریق کار سے اُردو گھاٹے میں نہیں رہی بلکہ" اس میں ایک ایسی وسعت ، قوت اور روانی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب و شاعر کو ہر قسم کے خیالات کو نئے نئے ڈھنگ

سے ادا کرنے اور صحیح و موزوں لفظ کے انتخاب میں جو سہولت ہے وہ شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہ ہو۔ مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ بنانے اور ترکیب دینے کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے۔ ایک ایسی زبان کے لئے جو علمی و ادبی ہونے کی آرزو رکھتی ہے یہ بہت بڑی چیز ہے۔"

اُردو کی ساخت اور مزاج کی اس تفصیل سے کئی مفید نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔

۱۔ اوّل یہ کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کا مزاج اس لحاظ سے بین الاقوامی ہے کہ اس میں دنیا کی اکثر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

۲۔ دوم یہ کہ اس کے مزاج میں سختی۔ خشکی اور یک رنگی نہیں بلکہ لچک۔ شگفتگی اور رنگا رنگی ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ وہ کسی زبان کی مقلد یا تابع نہیں ہے بلکہ صورت و سیرت دونوں اعتبار سے ایک الگ اور مستقل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ چوتھے یہ کہ غیر زبانوں کے جو الفاظ اُردو میں شامل ہیں۔ وہ سب کے سب اپنے اصلی معنوں اور صورتوں میں موجود نہیں ہیں بلکہ بہت سے الفاظ کے معنی، تلفظ، املا اور استعمال کی نوعیت بدل گئی ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ اُردو ایک مخصوص لب و لہجہ کی حامل ہے نہ صرف قواعد بلکہ فصاحت و بلاغت کا بھی وہ اپنا جداگانہ معیار رکھتی ہے۔

اس لئے اُردو کو کسی زبان کے آئینے میں نہ دیکھنا چاہئے۔ ہر لفظ کے معنی اور تلفظ کے لئے اصل زبان کا سہارا لینے کے بجائے اُردو لغت اور مستند شاعروں اور ادیبوں کے کلام سے مدد لینا چاہئے چنانچہ اب سے کوئی دو سو سال پہلے اُردو کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں نے اپنی کتاب دریائے لطافت میں بھی اُردو الفاظ کے غلط و صحیح ہونے کا یہی معیار قائم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو لفظ اُردو میں مشہور و مستعمل ہو گیا۔ خواہ عربی ہو یا فارسی۔ ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی۔ اپنی اصل کے رو سے غلط ہو یا صحیح۔ وہ لفظ بہرحال اُردو ہے اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے

خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کا غلط اور صحیح ہونا اُردو کے استعمال
پر منحصر ہے اس لئے کہ جو لفظ اُردو کے مزاج کے موافق نہیں غلط ہے
خواہ اصل کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو اور جو چیز اُردو کے مزاج
کے موافق ہے وہ صحیح ہے خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو۔"

انشاءاللہ کا بتایا ہوا یہ زریں اصول اُردو سے ہمدردی رکھنے والوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہئے اس لئے کہ یہ چیز اُردو کے مزاج کے عین مطابق ہے اسی اصول کے ماتحت اس نے ترقی کی ہے اور اسی اصول کو اپنانے سے اس کی ترقی کے امکانات روز بروز روشن ہونگے۔

اُردو اور اُس کے ذخیرۂ الفاظ کے سلسلے میں ایک اور بات بطور خاص ذہن میں رکھنی چاہئے اُردو میں جو الفاظ باہر کی زبانوں سے آئے ہیں وہ صرف اسم (NOUN) یا نام کے ذیل میں آتے ہیں، دوسرے قسم کے الفاظ مثلاً فعل اور حرف (VERB PREPOSITION) وغیرہ تقریباً سارے کے سارے مقامی ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ علاقائی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پہلو کو سمجھنے کے لئے اگر اردو کے ذخیرۂ الفاظ پر غور کریں تو اس میں تین قسم کے الفاظ نظر آئیں گے۔

و۔ اسم :۔ وہ لفظ یا کلمہ جو کسی شخص، جگہ، چیز یا حالت و کیفیت کا نام ہو اور اس میں ماضی و حال اور مستقبل میں سے کوئی زمانہ نہ پایا جاتا ہو۔ جیسے حامد، کراچی، کرسی، خوشی اور غم وغیرہ۔

ب۔ فعل :۔ ایسا کلمہ یا لفظ جس سے کسی کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے اور اس میں تین زمانوں میں سے کوئی زمانہ بھی موجود ہو جیسے ان جملوں میں

۱۔ حامد دوڑتا ہے۔

۲۔ محمود خط لکھ رہا ہے۔

۳۔ شمیم اپنا کام کر رہی ہے۔

"دوڑتا ہے"۔ "لکھ رہا ہے" اور "کر رہی ہے" فعل ہیں، فعل عام طور پر مصدر سے نکلتے ہیں جیسا کہ اوپر کے افعال، ترتیب وار، "دوڑنا"، "لکھنا" اور "کرنا"

مصدر سے ہیں :۔

ج :۔ حرف :۔ ایسے کلمات جو الگ الگ بظاہر بے معنی معلوم ہوں لیکن جملوں میں استعمال ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اپنے معنی ظاہر کریں بلکہ الفاظ اور جملوں کو ملانے اور انہیں بامعنی بنانے میں بھی معاون ثابت ہوں مثلاً کو، سے، پر، ساتھ، میں وغیرہ

اوپر دی ہوئی تعریفات اور امثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے دو قسم کے الفاظ یعنی "فعل" اور "حرف" مقامی ہیں گویا عربی و فارسی سے "اسم" تو لئے گئے ہیں لیکن حروف وافعال پر اُن کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ عربی و فارسی جو "اسم" لئے گئے ہیں اُن کا بھی زیادہ تعلق علمی و ادبی زبان سے ہے، روزمرہ کی گفتگو میں اسم بھی زیادہ تر مقامی ہی استعمال ہوتے ہیں بطور مثال آپ شکم، انگشت، گوش، چشم اور دست، کے الفاظ کو لے لیجئے یہ فارسی سے آئے ہیں اور اُردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن اُن کا مصرف علمی و ادبی زبان ہی میں ہوگا۔ گھریلو یا عام گفتگو میں شکم کی جگہ پیٹ، انگشت کی جگہ انگلی، گوش کے بجائے کان، چشم کے بجائے آنکھ اور دست کی جگہ ہاتھ کے الفاظ استعمال ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ اوپر جو فارسی الفاظ دیئے ہوئے ہیں وہ اُردو میں مفرد یا اکیلے نہیں بلکہ کسی عربی فارسی لفظ سے ملا کر ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "شکم سیر، انگشت نمائی، گوش دل، چشم عبرت، اور "دستِ کرم" کہنا صحیح ہوگا۔

اس وضاحت کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اُردو اگرچہ مخلوط زبان ہے اور اس میں شبہ نہیں مقامی بولیوں اور زبانوں کے علاوہ باہر کی متعدد زبانوں کے الفاظ اس میں موجود ہیں خصوصاً عربی و فارسی کے الفاظ تو بکثرت ہیں لیکن ان سب کا تعلق زیادہ تر اسما و صفات سے ہے اور علمی و ادبی زبان پر اُن کا اثر بھی گہرا ہے لیکن جہاں تک روزمرہ کی گفتگو کا تعلق ہے اس میں زیادہ تر مقامی الفاظ ہی بولے جاتے ہیں۔

جہاں تک اُردو کے نام اور اس کی وجہ تسمیہ کا تعلق ہے اس سلسلے میں اس قدر جاننا کافی ہے کہ "اُردو" دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے اور حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق اس کے لغوی معنی شاہی کیمپ یا لشکرگاہ کے ہیں یہ لفظ ترکوں کے ساتھ پاک و ہند میں داخل ہوا تزک بابری

میں یہ لفظ لشکرگاہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہوا یہ ہے کہ دہلی کے جس علاقہ یا بازار کو مغل فوجیوں نے شاہی کیمپ یا چھاؤنی بنایا اس کا نام "اردو بازار" یعنی لشکرگاہ پڑ گیا۔ شاہجہاں نے اس اُردو بازار کو اس کی اہمیت کا لحاظ رکھ کر "اردوئے معلیٰ" کا خطاب دیا اس "اردوئے معلیٰ" یا ذی مرتبت فوجی چھاؤنی میں جو نئی مخلوط زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ "زبان اردو" یا "زبان اردوئے معلیٰ" یعنی لشکری زبان کہلائی۔ چنانچہ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں اسے "زبان اردوئے معلیٰ" ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ رفتہ رفتہ زبان کا لفظ حذف ہو گیا۔ اور آج کل جس طرح سلیم شاہی جوتی اور جہانگیری زیور سے "جوتی اور زیور" کے الفاظ نکال کر صرف سلیم شاہی سے جوتی اور جہانگیری سے زیور مراد لی جانے لگی۔ اس طرح اُردو کا لفظ جو لشکرگاہ کے معنوں میں ترکوں کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوا تھا۔ اصل معنی چھوڑ کر زبان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

"اُردو" کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے محمد عطا حسین خاں تحسین نے "نوطرز مرصع" میں استعمال کیا ہے جو ۱۲۱۳ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ بعد ازاں میر امن نے "باغ و بہار" مولفہ ۱۲۱۷ھ اور انشاءاللہ خاں نے دریائے لطافت مصنفہ ۱۲۲۳ھ میں اس لفظ کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔ ہر چند کہ آج تک یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی ہے اور اب کوئی دوسرا نام اس کے مقابل سننے میں نہیں آتا لیکن ہمیں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ برصغیر کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں میں اسے دوسرے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً چونکہ یہ زبان ہند سے تعلق رکھتی تھی اس لئے بعض لوگوں نے فارسی کے مقابلے میں اس کا نام "ہندی" رکھا عہد اورنگ زیب کے ایک مزاح نگار اردو شاعر جعفر زٹلی نے اسے "ہندی" ہی کا نام دیا ہے۔ یہ "ہندی" نام میر امن کے دور تک مستعمل رہا ہے۔ اہل دکن نے اسے دکنی اور اہل گجرات نے گوجری کہا۔ دلی میں چونکہ یہ زبان پختہ و مضبوط ہوئی اس لئے اس کا نام ریختہ رکھا گیا۔ میر تقی میر۔ حاتم سودا اور اکثر دہلوی سے لے کر غالب کے یہاں تک یہ لفظ "اردو" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ نے "اُردو کو" "زبان دہلوی" اور ملا وجہی نے سب رس مصنفہ ۱۰۴۵ھ میں "زبان ہندوستانی" کے نام دیئے ہیں۔ لیکن اُردو کے سوا اب کوئی نام باقی نہیں ہے۔

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اور آئندہ سطور میں تفصیل سے ذکر آئے گا کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اور وہ برصغیر میں مسلمانوں کے داخلے کے بعد عربی، فارسی اور بعض مقامی بولیوں کے باہم میل جول اور ہندو مسلمان دونوں کی سماجی و معاشرتی ضرورتوں کے ماتحت وجود میں آئی ہے۔ عربی کے الفاظ اول اول عرب تاجروں اور محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کے طفیل سندھ و گجرات کے علاقے میں پہونچے۔ غزنوی حکمرانوں کی مدد سے فارسی الفاظ سرحد و پنجاب میں داخل ہوئے جب مسلمان فاتحین سندھ اور پنجاب سے آگے بڑھے تو عربی و فارسی کو اپنے ساتھ گنگا جمنا کے دو آبے میں لے گئے اور دلّی کو دارالخلافہ قرار دیا۔ یہ ۱۱۹۲ء کی بات ہے۔ جبکہ شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر پاک و ہند میں مسلمانوں کا سیاسی تسلط قائم کیا۔ ظاہر ہے شہاب الدین غوری کے فتوحات کی نوعیت محمد بن قاسم یا محمود غزنوی کے حملوں سے مختلف تھی۔ غوری نے دلی کو مسلمانوں کے لئے نیا وطن قرار دیا۔ اب مسلمان خراج وصول کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ وہاں مستقل حکومت قائم کرنے اور رہنے بسنے کے لئے داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ جب ۱۲۰۶ء میں قطب الدین نے غلام خاندان کی سلطنت کی بنا ڈالی اور دلی کو مستقر بنایا تو یہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ مسلمانوں کا ربط وضبط بڑھنے لگا۔ سماجی اور معاشرتی ضرورتوں نے ایک دوسرے کی زبان کی طرف بھی متوجہ کیا اور جس طرح انگریزی راج میں ہم نے اپنی سماجی اور معاشی ضرورتوں کے ماتحت انگریزی سیکھنی شروع کی تھی بالکل اسی طرح یہاں کے مقامی باشندوں نے عربی و فارسی کی طرف رُخ کیا اور تھوڑے دنوں میں ایسی مہارت بہم پہونچالی کہ حکومت کے کاروبار میں ان کا خاص دخل ہو گیا۔ ٹوڈرمل فارسی کا اچھا عالم تھا اور مغلیہ عہد میں ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ایسے ہندو موجود تھے جو فارسی کے بلند مرتبہ شاعر۔ انشا پرداز اور مورخ تھے۔ مسلمانوں نے بھی انتہائی رواداری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے انگریزوں کی طرح پاک و ہند کے علاقے کو کبھی غیر ملک یا یہاں کے باشندوں کو غلام و حقیر خیال نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی وسیع القلبی اور رواداری کی بدولت بہت جلد یہاں کے ہندوؤں میں گھل مل گئے۔ رنگ و نسل و مذہبی تعصب سے قطع نظر کرکے انہوں نے ہندوؤں کے سارے علوم و فنون کی ترقی اور ترویج میں حصہ لیا ہے۔ جس طرح ہندو فارسی و عربی سیکھنے میں مصروف تھے بالکل اسی طرح مسلمان سنسکرت۔ بھاشا۔ ہندو مذہب اور ان کی بعض روایات سے دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ صرف اُردو ہی نہیں بلکہ بھاشا زبان کی تخلیق و ترغیب میں بھی مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔ مسعود سلمان لاہوری، امیر خسروؔ بوعلی قلندر شاہ اور قطبن وغیرہ بھاشا ادب کی بنا رکھنے والوں میں ہیں۔ امیر خسرو نے مقامی موسیقی سے

خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ بعض دوسرے بزرگوں نے بھاشا اور دوسری مقامی زبانوں کو اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اس معاشرتی میل جول اور ایک دوسرے کی زبان و ادب سے دلچسپی لینے کا اثر یہ ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ مخلوط ہونے لگے اور زبانوں کے اس اختلاط کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ایک نئی زبان وجود میں آگئی جس کا نام بعد کو اُردو پڑا۔ جب علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کیا اور محمد تغلق نے دہلی کو خالی کرا کے دولت آباد، آباد کیا تو سندھ و پنجاب و دہلی کے علاقے کی یہ نیم پختہ اُردو گجرات و حیدرآباد کے علاقوں میں داخل ہوگئی۔ ہرچند کہ پنجاب اور دوآبہ کے علاقوں میں یہ نئی زبان ترقی پذیر تھی اور حضرت فرید گنج شکرؒ اور حضرت امیر خسروؒ جیسے بزرگوں نے اس میں نثر نظم کا آغاز بھی کر دیا تھا لیکن دکن پہونچکر اُردو کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ اب تک اسے میسر نہ آئی تھی۔ شاہانِ دہلی کے درباروں میں ہمیشہ فارسی کا غلغلہ رہا۔ عوام اور صوفیا کرام البتہ اس نئی زبان کی طرف توجہ دیتے رہے لیکن حکمران طبقہ میں ابھی اس کی باریابی نہ ہوئی تھی چنانچہ حکومت کی سرپرستی اُردو کو دکن میں نصیب ہوئی۔ دکن میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادلشاہی حکمرانوں نے فارسی کے مقابلہ میں اُردو کی قدردانی کا بیڑا اُٹھایا۔ دفاتر میں فارسی کی جگہ اُردو رائج ہوئی اور اس زبان کے شعراء و ادبا کو گراں قدر انعامات و اکرام سے نوازا گیا۔ جس زمانے میں مغلیہ درباروں میں فیضی۔ ابوالفضل۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ نظیری۔ صائب اور کلیم جیسے شاعر و ادیب فارسی ادب کو فروغ دے رہے تھے عین اسی زمانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں ملا وجہی۔ قلی قطب شاہ، غواصی اور نشاطی وغیرہ جیسے زبردست شاعر و نثر نگار اُردو کے دامن کو وسیع کر رہے تھے۔ قدیم دکن کے آخری دور کے شعرا، سراج اور ولی ہیں۔ ان دونوں کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے اس قدر صاف سادہ اور دلکش ہے کہ آجکل کی اُردو سے لگا کھاتا ہے۔ سچ پوچھو تو ولی ہی کی بدولت شمالی ہند میں اُردو شعر و سخن کا عام رواج ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ جب اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ولی اپنے پیر و مرشد سعداللہ گلشن سے ملنے کے لئے دہلی گئے اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کو اپنا کلام سُنایا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس وقت دلی میں حاتم۔ آبرو۔ یکرنگ۔ سراج الدین علی خاں آرزو اور مضمون وغیرہ موجود تھے۔ یہ سب فارسی کے شاعر تھے اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اُردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن ولی سے متاثر ہو کر انہوں نے اُردو کی طرف خاص طور پر رخ کیا اور دکنے

کی تباہی کے بعد دلی اُردو کا سب سے اہم مرکز بن گیا۔ تھوڑے ہی دن میں یہاں درد۔ سودا۔ میر تقی میر۔ میر حسن اور مصحفی جیسے باکمال شاعر پیدا ہو گئے اور انہوں نے قصیدہ، غزل اور مثنوی میں وہ کمال بہم پہونچایا کہ اُردو کو رشک فارسی بنا دیا۔ عوام میں اُردو پہلے ہی مقبول تھی اب خواص کی تسکینِ ذوق کا سامان بھی فراہم ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا ہندوستان میں پہلی بار چھاپہ خانہ اور نثر نگاری کی تحریک کا آغاز ہوا۔ یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ میر امن کی مشہور و معروف کتاب باغ و بہار وجود میں آئی جو آج بھی ادبی نثر کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی ہے ۱۸۳۲ء تک اردو کا اثر و نفوذ اس درجہ بڑھ گیا کہ سرکاری دفتر و عدالت میں فارسی کو ہٹا کر اسے کرسی دی گئی اور دلی کالج قائم ہوا اور یہاں اُردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں سے دلی تباہ ہو چکی تھی۔ اس کی ادبی محفل اجڑ چکی تھی اور نواب آصف الدولہ و واجد علی شاہ اختر کی سرپرستی میں لکھنو اُردو شعر و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ یہاں آتش۔ ناسخ۔ جرأت۔ مصحفی۔ انشا اور نواب مرزا شوق جیسے کاملین فن نے حسب مقدور زبان و بیان دونوں کو ترقی بخشی۔ مرثیہ۔ رباعی۔ غزل اور مثنوی سے ہر صنف کو فروغ نصیب ہوا۔ لیکن دلی اہل کمال سے یکسر خالی نہ تھی۔ وہاں مومن۔ ذوق۔ شیفتہ اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ غالب جیسے زبردست شاعر اور نثر نگار موجود تھے۔ غالب دراصل پہلے شخص تھے جنہوں نے اُردو شاعری اور نثر دونوں کو غیر معمولی توانائی۔ تازگی اور جدید طرز فکر سے آشنا کیا۔ حالی اور سرسید دونوں غالب سے متاثر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کا اقتصادی اور معاشی شیرازہ یکسر بکھر گیا۔ سرسید نے اسے دوبارہ سنوارنے کی فکر کی۔ اس غرض سے انہوں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا سرسید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک سے اُردو بھی متاثر ہوئی سرسید کی نثر نگاری نے اُردو کو سادگی و صفائی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری و واقعیت پسندی کا حامل بنایا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی بنا ڈالی اور ابن الوقت۔ توبتہ النصوح۔ مراۃ العروس جیسی کتابیں لکھیں۔ آزاد نے انشا پردازی کے کمالات دکھائے اور آب حیات کے نام سے اُردو شعرا کا ایسا تذکرہ مرتب کیا جس نے ادبی، تاریخ و تنقید دونوں کی رہنمائی کی۔ حالی نے مسدس لکھ کر قومی مرثیہ کی بنیاد ڈالی۔ سوانح نگاری اور

تنقید نگاری کے بانی بھی وہی ہیں۔ ان کی یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری نے اردو ادب کو ایک جدید نقطہ نظر دیا۔ اکبر نے اُردو شاعری میں مزاح و طنز کا اضافہ کیا۔ شبلی نے سرسید اور حالی کے کام کو آگے بڑھایا۔ موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم۔ الفاروق۔ المامون اور سیرت لکھ کر اُردو کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ سرسید نے تعلیم، مذہب، ادب اور سائنس پر خود بھی مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ نتیجتہً اُردو ادب کا ہر شعبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں دبیر و انیس نے مرثیہ گوئی کو بام عروج پر پہونچایا اور نظیر اکبر آبادی نے عوامی شاعری کا راگ الاپا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے اصلاحی نظمیں لکھیں۔ آزاد اور حالی نے لاہور میں نئے قسم کے مشاعروں کی بنا ڈالی اور مغرب سے متاثر ہو کر اُردو میں جدید نظم نگاری کا آغاز کیا اسی زمانہ میں امیر و داغ نے قدیم غزل کو پھر مقبول بنانے کی کوشش کی لیکن دنیا بدل چکی تھی اس لئے اُن کا رنگ واثر دیرپا ثابت نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اقبال جیسا مفکر اسلامی شاعر پیدا ہوا اور ان کی بدولت اردو زبان و ادب کی شہرت پاک و ہند کے باہر یورپ تک پہونچی۔ جوش۔ سیماب، ظفر علی خاں۔ اختر شیرانی اور احسان دانش وغیرہ نے سیاسی۔ اخلاقی۔ مذہبی اور روحانی نظموں سے اُردو کو مالا مال کیا۔ حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ جگر۔ فراق اور فیض نے اردو غزل کو نیا رنگ و نور بخشا۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی نے اُردو نثر کو حقیقی طنز و مزاح سے آشنا کیا۔ نیاز فتحپوری۔ سر عبد القادر۔ ابو الکلام آزاد۔ مولوی عبد الحق۔ محی الدین قادری زور۔ قاضی عبد الودود۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ مجنوں گورکھپوری۔ فراق گورکھپوری اور بعد ازاں مالک رام۔ ڈاکٹر تاثیر۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ آل احمد سرور۔ احتشام حسین۔ پروفیسر وقار عظیم۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، ڈاکٹر گیان چند، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے اپنے تحقیقی۔ علمی، ادبی اور تنقیدی مقالات و تصانیف کے ذریعے اردو میں وقیع اور گراں قدر ادب کا اضافہ کیا۔ ناول اور افسانے میں نیاز فتحپوری و پریم چندر۔ بیدی۔ سدرشن۔ عزیز احمد۔ حسن عسکری۔ احمد ندیم قاسمی۔ علی عباس حُسینی۔ منٹو۔ عصمت۔ شوکت صدیقی۔ اور اشفاق حسین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل توجہ ہیں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند ادب قائم ہوئی اور اس کے ذریعے اُردو ادب نے مغربی

خاص طور پر روسی ادب سے گہرا اثر قبول کیا۔ آزاد اور معرا نظموں کا آغاز و فروغ بھی اسی زمانے میں ہوا۔ غرض آج اردو کا دامن بہت وسیع ہے اور اس میں علم و ادب کا ایسا گراں قدر سرمایہ موجود ہے کہ اسے دنیا کے ہر ادب کے مقابلے میں آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔

اردو کے اس ارتقائی خاکے اور پس منظر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ہندو مسلمان دونوں کی باہمی سماجی و معاشرتی ضرورت سے وجود میں آئی ہے۔ اور سماجی بیداری و ترقی کے ساتھ ساتھ فطری اصول کے تحت آگے بڑھتی رہی ہے۔ بعض ہندوؤں کا یہ خیال کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں نے شعوری طور پر اس کی تخلیق کی ہے درست نہیں ہے مسلمان اپنے ساتھ عربی و فارسی جیسی اہم اور وسیع زبانیں لے کر آئے تھے۔ انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ کسی نئی زبان کو دانستہ وجود میں لاتے۔ یہ تو ان کی رواداری تھی کہ جو زبان ان کے محکوم ہندوؤں کی سیاسی و معاشرتی ضرورتوں اور مصلحتوں کے ماتحت وجود میں آئی تھی اسے حاکم مسلمانوں نے فراخدلی سے اپنا لیا اور اس طرح آگے بڑھایا کہ ان کی اپنی اصل زبانیں عربی و فارسی بھی پیچھے رہ گئیں۔
ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ کہ "اس قسم کی مخلوط یعنی کھچڑی زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی سبب بیان کئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک ملک گیری ہے۔ وہ یہ کہ فاتح۔ مفتوح ملک میں آکر بس جاتا ہے اور اس ملک کی قوم سے مل جل کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا اور مستقل ہوتا ہے اور اس صورت میں دو قوموں کے ملنے سے ان دونوں کی زبانوں میں بھی ٹکر ہوتی ہے۔ اگر فاتح میں رواداری ہے اور مفتوح سے برابر کا برتاؤ کرتا ہے تو دونوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے اسے ہم نہ فاتح کی تہذیب و زبان کہہ سکتے ہیں اور نہ مفتوح کی ان میں دونوں کی تہذیبیں اور زبانیں برابر کی شریک ہوتی ہیں" یہ خیال درست ہے۔ اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کا مشترک ورثہ ہے۔ لیکن بعض متعصب ہندوؤں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا گاندھی جی نے اردو کو بھی سیاسی عینک سے دیکھا اور "ہندوستانی" کے نام سے اردو کے مقابلے میں سنسکرت آمیز ہندی کو رواج دینے کا بیڑا اٹھایا اردو کی اس مخالفت میں گاندھی جی کی گہری سیاسی چالیں پوشیدہ تھیں۔ ہر چند کہ اردو کی ترقی میں شروع سے لے کر آج تک ہندو و مسلمان دونوں برابر کے شریک رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے برصغیر کے مسلمانوں نے

کا سارا ذہنی تخلیقی سرمایہ اسی زبان میں تھا۔ ان کے علمی ادبی اور مذہبی کارنامے بالعموم اردو ہی میں محفوظ تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے اردو ختم کرنے کی آڑ میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور علمی و ادبی کارناموں کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی۔ جب مسلمانوں کو گاندھی کی اس گہری چال کی خبر ہوئی تو انہیں یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان زیادہ دنوں تک مل جل کر نہیں رہ سکتے اور اگر ایسا ہوا تو ان کا سیاسی اقتدار ان کی معاشرتی حیثیت ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و ثقافت سب ایک ایک کر کے تباہ ہو جائے گی۔ یہی وہ مسائل تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ پاکستان کا مطالبہ کریں اور ایک ایسے آزاد و خود مختار علاقے کو قبول کریں جہاں وہ قومی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور اپنی تہذیبی روایات و مذہبی عقائد کو آزادی کے ساتھ فروغ دے سکیں اس وضاحت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تخلیق میں اردو کا بڑا ہاتھ ہے اردو کا خطرے میں پڑ جانا گویا ہمارے مذہب اور ہمارے تمدن کا خطرے میں پڑ جانا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملک کا قیام ناگزیر تھا۔ مسلمانوں کو کانگریس یا گاندھی جی کی طرف سے جو شبہات تھے وہ پورے ہوئے۔ ادھر ملک تقسیم ہوا ادھر اردو جیسی وسیع اور مقبول عام زبان کو بھارت سے خارج کر کے اس کی جگہ ہندی کو رائج کیا گیا۔

لیکن پاکستان میں بھی ایک مدت تک اردو کے ساتھ وہ سلوک نہیں روا رکھا گیا جس کی خصوصاً وہ مستحق تھی۔ جس زبان کی حفاظت کے لئے لاکھوں افراد نے پاکستان کی تائید کی تھی اور جس کی بدولت مسلمانوں کو سلطنت خداداد نصیب ہوئی تھی۔ اس کی قدردانی و سرپرستی کا پورا حق ہم نے ادا نہیں کیا۔ موجودہ قومی اسمبلی نے البتہ اسے ہر سطح پر پاکستان کی قومی و سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا ہے بعض صوبوں نے اس پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا ہے، اگر حکومت کی سرپرستی جاری رہی تو یقین ہے کہ اردو اپنی دل نشینی اور فطری جذب و کشش کی بدولت بہت جلد وہ اعلیٰ مقام حاصل کرے گی جس کے لئے وہ گھر سے بے گھر ہوئی ہے۔

اُردو کا لسانی خاندان اور دُوسری زبانوں سے اُس کا رشتہ

عُلمائے زبان اور ماہرینِ لسانیات نے صنف زبانوں کی قواعد، جملوں کی بناوٹ، مرکبات کے اصول اور معنوی قرابت کے لحاظ سے دنیا کی زبانوں کو مندرجہ ذیل تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ آریائی یا ہند یورپی : یہ خاندان دنیا کی زبانوں کا سب سے بڑا خاندان ہے۔ یورپ اور ایشیاء کی اکثر بڑی زبانیں مثلاً جرمن، انگریزی، فارسی، پرتگالی، ہسپانوی، فرانسیسی، ہندی، اور اُردو وغیرہ اسی خاندان میں شامل ہیں۔

۲۔ سامی : اس خاندان کے دو بڑے شعبے ہیں۔ سامی اور حامی۔ سامی میں اشوری، بابلی، کلدانی، سریانی، عربی، عبرانی اور حبشی وغیرہ اور حامی میں مصری اور قبطی وغیرہ کے نام آتے ہیں

۳۔ تورانی : ۔ اس خاندان کے تحت دنیا کی باقی ماندہ زبانوں میں سے متعدد زبانیں آتی ہیں علمائے السنہ نے انہیں کئی گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کی تفصیل میں جانے سے اس جگہ کوئی فائدہ نہیں اُردو خواں طبقہ کو صرف اتنا جاننا چاہئے کہ اس خاندان کی مشہور زبان ترکی ہے۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو کا تعلق کسی نہ کسی طور پر اوپر کے تینوں خاندان سے ہے۔ پہلے خاندان کی زبانوں میں سے فارسی اور انگریزی کے اثرات اُردو پر بہت گہرے ہیں۔ دوسرے خاندان کی زبانوں میں سے اُردو نے عربی کا خاصا اثر قبول کیا ہے، تیسرے خاندان میں "ترکی" شامل ہے اور اس کے اثرات بھی اُردو پر کچھ کم نہیں ہیں۔ خود "اُردو" کا لفظ ہی ترکی زبان کا ہے ـــــ لیکن چونکہ اُردو میں الفاظ سازی کے اصول اور صرف و نحو کے اکثر قاعدے عربی و ترکی کے بجائے انگریزی اور فارسی وغیرہ سے ملتے جلتے ہیں اس لئے علمائے زبان نے اُردو کو سامی و تورانی کے بجائے آریائی خاندان میں شمار کیا ہے، دوسروں نے بھی لکھا ہے لیکن مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی مشہور کتاب

"وضع اصطلاحات" مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی' میں اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے، انہوں نے آریائی خاندان کی زبانوں کے مندرجہ ذیل مشترک اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کو آریائی خاندان سے منسلک کیا ہے۔

(۱) پہلا اصول یہ ہے کہ آریائی زبانوں میں دو یا دو سے زیادہ لفظوں کو پاس پاس رکھ کر ایک نیا مرکب لفظ بنا لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان لفظوں کے درمیان قواعد کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انگریزی الفاظ کے سلسلے میں

WATER - MAN , POST - MAN , HORSE - RACE

LAMP - OIL , DRINKING - WATER

وغیرہ اور اُردو کے سلسلے میں چاند گرہن، موم روغن، گاوزبان، کفن چور، جیب گھڑی، گھر داماد اور سفر خرچ وغیرہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۲) نئے الفاظ بنانے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ الفاظ بھی پاس پاس رکھے ہوں، قواعد کے لحاظ سے ان میں کوئی باہمی تعلق بھی موجود ہو مثلاً انگریزی میں

PICK - POCKT , SHOE MARER , ENGINE - DRIVER

HOUSE - BUILDING , MAN - EATER وغیرہ اور

اُردو میں جیب کترا، چڑی مار، منہ توڑ، کفن کھسوٹ، مکھی چوس اور نیبو نچوڑ وغیرہ۔

(۳) تیسرا مشترک اصول یہ ہے کہ آریائی زبانوں میں کسی لفظ سے پہلے یا بعد ایک جزو کا اضافہ کر کے نیا لفظ بنا لیا جاتا ہے یہ جزو اگر لفظ سے پہلے آئے تو انگریزی میں پری فکس (PREFIX) اور بعد کو آئے تو سفکس (SUFFIX) کہلاتا ہے اُردو میں انہیں علی الترتیب سابقہ اور لاحقہ کہتے ہیں، انگریزی میں

ANTI - GVET , ANTI - DEMOCRATE , ANTI - PAKISTAN ,

ANTI - ISLAM , ANTI - SMUGLING

ANTI SOCIAL ANTI MALARIA

ANTIREVOLUTION

— ANTISCIENCE

وغیرہ اور اُردو میں اَن مول، اَنجان، ان بن، ان پڑھ اور ان گنت وغیرہ سابقوں (PRE-FIXES) کی مدد سے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں TOLERABLE، LOVABLE

SUITABLE RELIABLE

وغیرہ اور اُردو فارسی میں روح افزا، نشاط افزا، حوصلہ افزا، ہمت افزا وغیرہ لاحقوں (SUFFIXES) کی مدد سے وجود میں آئے ہیں۔

انگریزی، اُردو، فارسی اور دوسری آریائی زبانوں میں سابقوں اور لاحقوں کی تعداد بہت بڑی ہے ان کے ذریعے ہزاروں الفاظ بنائے گئے ہیں اور حسب ضرورت بنائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ اُردو فارسی میں مرکب الفاظ زیادہ تر سابقوں اور لاحقوں ہی کی مدد سے ڈھالے گئے ہیں، ہم نے ان مرکبات کی تفصیل اگلے صفحات میں "الفاظ کے معنی کیسے بنائیں" کے زیر عنوان دے دی ہے۔

(۴) آریائی خاندان کی زبانوں کا چوتھا مشترک اصول یہ ہے کہ ان میں اکثر الفاظ سے حسب ضرورت مصدر بنا لیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں

TO CLASIFY	سے	CLASS
TO NATIONALISE	سے	NATION
TO ORIGINATE	سے	ORIGINATION
TO BLACKEN	سے	BLACK

اسی طور پر اُردو میں بھی مختلف الفاظ سے مصدر بنا لیے جاتے ہیں مثلاً چھینکنا، بڑبڑانا، ڈگمگانا، ٹنٹنانا، چمکنا، مہکنا، کوکنا، الاپنا، قومیانہ وغیرہ علی الترتیب چھینک، بڑبڑ، ڈگمگ، ٹن ٹن، چمک، مہک، کوک، الاپ اور قوم سے بنائے گئے ہیں۔

(۵) اُردو کو آریائی خاندان سے منسلک کرنے کی پانچویں وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذخیرے میں آریائی خاندان کی زبانوں کے الفاظ سب سے زیادہ ہیں۔ سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں اُردو لغت میں استعمال ہونے الفاظ کی تعداد کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کس تناسب سے داخل ہوئے ہیں، اُن کے اعداد و شمار کے مطابق سب سے زیادہ الفاظ ہندی یعنی مقامی یا علاقائی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں اِسکے بعد زیادہ تعداد عربی و فارسی الفاظ کی ہے چونکہ فارسی کا تعلق بھی آریائی خاندان سے ہے اس لئے ہندی اور فارسی کے الفاظ عربی الفاظ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ مختلف زبانوں کے الفاظ کی تعداد اور تناسب کے لحاظ سے بھی یہی کہنا ہے صحیح ہے کہ اُردو کا لسانی رشتہ آریائی خاندان ہی سے ہے۔ جو لوگ خاص قسم کی علمی و ادبی کتابوں میں عربی الفاظ کی کثرت دیکھ کر یہ قیاس کرتے ہیں کہ اُردو کا تعلق حقیقتہً عربی سے ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اُردو کی قواعد، صرف و نحو، دونوں کے لحاظ سے عربی سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ فارسی، انگریزی اور ہندی یعنی آریائی زبانوں سے ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم نے آریائی زبانوں کے باہمی رشتے کے سلسلے میں صرف مندرجہ بالا پانچ باتیں بیان کی ہیں لیکن اس سلسلے میں چند باتیں اور کہی جا سکتی ہیں۔

(۱) پہلی نمایاں بات یہ ہے کہ آریائی زبانوں میں حرف "ن" مصدر کی علامت کے طور پر نظر آتا ہے مثلاً ہندی اُردو کے مصدر کھانا، پینا، رونا، ہنسنا، لکھنا، پڑھنا وغیرہ میں "نا" اور فارسی کے گفتن، دیدن، شنیدن، رفتن، آمدن وغیرہ میں "ن" کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی بھی آریائی ہے لیکن اُس کے مصادر میں "ن" کہیں نہیں آتا، یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

RED سے REDDEN، WHITE سے WHITEN، SHARP سے SHARPEN اور BLAEK سے BLACKEN وغیرہ مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں ان مصادر میں "N" یا EN کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ "ن" کی کوئی نہ کوئی شکل آریائی زبانوں میں علامت مصدر کے طور پر مستعمل رہی ہے زمان و مکان کی لمبی مسافتوں نے آج ان علامتوں کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ ابتداءً ان کی شکل ایک

ہی رہی ہوگی لیکن عربی میں مصادر کی نوعیت بالکل مختلف ہے اُن کا تعلق ابواب و اوزان کے ایسے تغیرات سے ہے جن کا آریائی مصادر سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

(۲) دوسری واضح بات یہ ہے کہ آریائی زبانوں کے جملوں کی ساخت بالعموم ایک جیسی ہوتی ہے یعنی فاعل، فعل، مفعول اور اُن کے متعلقات کی ترتیب میں زیادہ فرق نہیں ہوتا بطور مثال چار آریائی زبانوں انگریزی، فارسی، ہندی اور اُردو کے اِن جملوں کو دیکھئے۔

(۱) MAHMOOD WENT

(۲) محمود رفت

(۳) महमूद गया !

(۴) محمود گیا

ان جملوں میں پہلے فاعل اور بعد میں فعل آیا ہے، اب اگر اسی جملے کو عربی بنائیں تو کہیں گے

ذَھَبَ محمود

یہاں فعل پہلے اور فاعل بعد کو آ گیا، یہ فعل لازم ماضی مطلق کے جملے ہیں اگر دوسرے زمانوں کے جملے بنائے جائیں تو بھی یہی صورت ہوگی یعنی آریائی زبانوں فعل، فاعل کے بعد اور عربی میں فعل، فاعل سے پہلے آئے گا۔ بعض آریائی زبانوں میں فعل متعدی کے جملوں میں اتنا فرق ضرور ہو جاتا ہے کہ مفعول آخر میں اور فعل اس سے پہلے آجاتا ہے مثلاً اُن جملوں کو دیکھئے۔

(۱) MAHMOOD BEAT HAMID

(۲) محمود حامد را زد

(۳) महमूद ने हामिद को मारा

(۴) محمود نے حامد کو مارا

یہاں ہندی، اُردو اور فارسی کے جملوں کی بناوٹ ایک سی ہے۔ پہلے فاعل، پھر مفعول اور آخر میں فعل آیا ہے، صرف انگریزی میں یہ ہوا ہے کہ فعل، مفعول سے پہلے جملے کے بیچ میں آیا ہے، لیکن عربی میں فعل متعدی کی صورت میں بھی فعل پہلے ہی آئے گا مثلاً اوپر کے جملوں کو عربی

میں اس طور پر بولا یا لکھا جائے گا۔

ضَرَبَ محمودُ حامِداً

گویا عربی جملے کی ساخت، آریائی جملوں کی ساخت سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ عربی میں کبھی کبھی خاص ضرورتوں کے لئے فعل، فاعل کے بعد بھی آتا ہے لیکن عام طور پر آریائی سے زبانوں کے برعکس اس کا استعمال جملے کے آغاز میں ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آریائی زبانوں میں فعل، فاعل اور مفعول کی ترتیب، مشترک اصول کے تحت ایک سی ہوتی ہے۔

(۳) آریائی زبانوں میں ایک اور چیز مشترک ہے، ان میں حرف ربط، اہمیت خاص رکھتا ہے اور اگر اسے خارج کر دیا جائے تو مبتدا اور خبر سے بننے والے جملے یکسر مہمل ہو جائیں گے۔ مثلاً

(۱) MAHMOOD IS A SCHOLAR

(۲) محمود عالم است

(۳) महमूद विद्वान है

(۴) محمود عالم ہے

ان میں " IS " "است" اور "ہے" خاص اہمیت رکھتے ہیں ان کو نظر انداز کر کے انگریزی، اردو، ہندی اور فارسی کے مندرجہ بالا جملے بنائے ہی نہیں جا سکتے۔ لیکن اس قسم کے عربی جملوں میں حرف ربط یا فعل ناقصہ کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ انہیں عربی میں اس طرح لکھا اور بولا جاتا ہے۔

محمودُ عالمٌ

یہاں دو لفظوں یعنی مبتدا اور خبر میں ربط قائم کرنے کے لئے کوئی دوسرا لفظ نہیں لایا گیا لیکن آریائی زبانوں میں کوئی نہ کوئی لفظ لانا ضروری ہے۔

یہ ساری باتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اردو اپنی ساخت میں عربی سے نہیں انگریزی، فارسی اور ہندی سے بہت قریب ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ اردو کا تعلق جس لسانی خاندان سے ہے اسی سے انگریزی، فارسی اور ہندی کا بھی ہے، یہ ضرور ہے کہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں معتدبہ تعداد ترکی اور عربی کی بھی ہے۔ ترکی کے الفاظ ترکوں کے زیر اثر آئے ہیں اور زیادہ تر آرائش و زیبائش۔

حرب وضرب اور کھانے پینے کی چیزوں یا تہذیبی زندگی کے بعض پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربی الفاظ کا زیادہ اثر ہمارے علم و ادب پر ہے، علوم و فنونِ مشرقیہ کے متعلق ہماری ساری اصطلاحات عربی ہی سے ماخوذ ہیں علاوہ ازیں متعدد عربی مرکبات، صفات اور فقرات بالکل اسی طرح اُردو نے قبول کر لئے ہیں جس طرح اُردو میں بولے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان الفاظ کو دیکھئے۔

مابہ الامتیاز، ساقط الاعتبار، فقید المثال، حتی الوسع، علی الاعلان، رسم الخط لیلۃ القدر، مافی الضمیر، کما حقہٗ نصف النہار، آخر الامر، بالطبع، کالنقش فی الحجر، قوتِ لایموت، اظہر من الشمس، مالہ وما علیہ، حتی المقدور اس طرح کے اور بہت سے عربی مرکبات و فقرات ہیں جو اُردو میں آئے دن استعمال ہوتے ہیں۔

فارسی کی طرح اُردو نے بھی، آریائی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوصف، اپنے حروفِ تہجی میں بہت سے حروف عربی سے لئے ہیں۔ مثلاً

ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، وغیرہ کے حروف اور اُن کی آوازیں عربی کے لئے مخصوص ہیں، یہ حروف یا ان کی آوازیں دوسری آریائی زبانوں مثلاً ہندی اور انگریزی میں نہیں ہیں لیکن اُردو کے حروفِ تہجی میں یہ شامل ہیں، چنانچہ جن لفظوں میں یہ حروف آجائیں۔ عام طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ عربی زبان سے اُردو میں آئے ہیں مثلاً

(۱) ثواب، ثابت، مثبت، مثلث، ورثہ، توارث، ثبات، ثانی، ثنا، مونث وغیرہ

(۲) حلوا۔ حامد۔ حمد، نکاح، حج، وحید، اصلاح، حدیث، احمر وغیرہ

(۳) ذاکر، تذکرہ، ذکی، مذاکرہ، ذریعہ، ذوی الحجہ، ذی روح وغیرہ

(۴) صبح، صباحت، مصلح، اصابت، صبا، عاصی، صوم وصلوٰۃ، وصف، توصیف وغیرہ

(۵) ضبط، ضمانت، تضمین، ریاض، ضمیر، ضیاء، روضہ، عرض، ارض، ضرب وغیرہ

(۶) طلب، طاہر، اطہر، طبیب، مطب، اطیب، طیبہ، مطلب، طوالت، عطا وغیرہ

(۷) ظاہر، اظہر، مظاہرہ، ظرف، غیظ، تقریظ، نظیر وغیرہ

(۸) عابد، معبود، طبع، تابع، علیم، علم، تعالیٰ، عقل، عقیلہ، بعید، سعد وغیرہ

(۹) قلم، خالق، قیامت، قیاس، مثل، مقبول، قلعہ، وقیع، قرات، تقویم وغیرہ

ان مثالوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اُردو نے عربی سے جو حروف لیئے ہیں جب ان میں سے کوئی حرف کسی اُردو لفظ میں نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ خاص عربی کا ہے اور عربی ہی سے اُردو میں آیا ہے اگر یہ بات اُردو کے معلم کے ذہن نشین ہو اور طلبہ کے گوش گزار بھی کر دی جائے تو انہیں زباندانی کے سلسلے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اُردو نے عربی کا ایک اثر یہ بھی قبول کیا ہے کہ عربی کی طرح اُردو کے حروف بھی دو خاص گروہ شمسی و قمری میں بانٹ دیئے گئے ہیں مندرجہ ذیل دو لفظوں کو دیکھئے۔

"والشمس"

"والقمر"

پہلے لفظ میں ال، حرف "ش" سے پہلے آیا ہے اور اُس کی آواز پڑھنے میں نہیں نکلتی بلکہ "و" کو "شش" سے زبر کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، دوسرے لفظ میں "ق" سے پہلے ال کی آواز قائم ہے اور پڑھنے میں بھی آتی ہے، چنانچہ ان دو لفظوں کی روشنی میں یہ اصول وضع کر لیا گیا ہے کہ جن حروف سے پہلے ال پڑھا جائے گا وہ "والقمر" کے وسیلے سے قمری حروف کہلائیں گے اور جن حروف سے پہلے ال نہ پڑھا جائے گا وہ "والشمس" کی روشنی میں شمسی کہلائیں گے چنانچہ عربی کے حروف ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ل، ن، شمسی ہیں یعنی ان کے پہلے جب ال داخل ہوگا تو آواز نہ دے گا باقی حروف قمری ہیں۔ اور اُن سے قبل جب ال آئے گا تو آواز دے گا اور پڑھا جائے گا۔ ذیل کے الفاظ دیکھئے۔

(ا) کتاب التوحید، عبدالصمد، الناظر، عبدالرشید، الداخل، شمس الضحیٰ،

(ب) عبدالقدیر، امام الہند، وحیدالعصر، بیان اللسان، ظفرالحسن، عبدالخالق۔

پہلے گروہ کے الفاظ میں چونکہ ال، حروف شمسی سے پہلے آیا ہے اس لیئے پڑھنے میں محذوف ہو گیا ہے لیکن دوسرے گروہ میں چونکہ ال، حروف قمری سے قبل استعمال ہوا ہے اس لیئے آواز دیتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔

اس طرح کی اور کئی چیزیں ہیں جو اُردو نے عربی سے لی ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، یہ چیزیں علم وفن اور قرآنی تعلیمات واسلامی ادبیات سے متعلق تحریروں پر زیادہ اثر انداز ہوئی ہیں۔ ہم نے پچھلے صفحوں میں کسی جگہ بتایا ہے کہ اُردو نے عربی سے ضمیر، فعل اور حرف نہیں بلکہ اسما وصفات لئے ہیں، ہاں عربی کے مصادر جن سے فعل بنتے ہیں ضرور اُردو میں مستعمل ہیں اور مصادر کے ساتھ اُن کے اسم مشتق بھی اکثر استعمال ہوتے ہیں، پہلے عربی کے تین حرفی مصدروں کی چند مثالیں دیکھئے

شُکرٌ، عِلمٌ، شعرٌ، نظرٌ، نظرٌ، نظمٌ، جہلٌ وغیرہ

یہ اور اس طرح کے بے شمار الفاظ ہیں جو عربی کے سہ حرفی مصدروں کے تحت آتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے مصادر اُردو میں بطور اسم کے داخل ہو گئے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں اب ان مصدروں سے بنے ہوئے مندرجہ ذیل اسمائے مشتق پر نظر ڈالئے۔

(۱) علیم، عالم، معلوم، علامہ، اعلم، عالمہ

(۲) عقیل، عاقل، معقول، عقیلہ

(۳) شاعر، شعر، شاعرہ، مشعر، اشعر

(۴) نظیر، منظور، ناظر، منظر، ناظرہ

(۵) منظوم، ناظم

(۶) جاہل، مجہول، اجہل، مجہل

یہ سارے الفاظ اُردو میں بولے جاتے ہیں، اور ان میں سے بعض کی جمع بھی استعمال ہوتی ہے یہی حال عربی کے دوسرے مصدروں کا ہے۔ مندرجہ ذیل اوزان اور اُن کے مصدروں کو دیکھئے۔

(۱) اِفعال کے وزن کے اِسلام، اِنکار، اِسراف، اِیجاد، اِحسان وغیرہ

(۲) تفعیل کے وزن کے تدبیر، توجیہ، توحید، تنظیم، تعدیل وغیرہ

(۳) تفاعُل کے وزن کے تقابل، تصادم، تناظر، تساہل، توازن وغیرہ

(۴) تفعُّل کے وزن کے تصنّع، تدبّر، توجہ، توقع، تکلّف وغیرہ

(۵) مفاعلہ کے وزن کے مباحثہ، مشاعرہ، مجاہدہ، مناظرہ، معاملہ وغیرہ
(۶) افتعال کے وزن کے انتظام، انتشار، اعتذار، اعتماد، احتشام وغیرہ
(۷) انفعال کے وزن کے انحصار، انکسار، انشراح، انعقاد، انقلاب وغیرہ
(۸) استفعال کے وزن کے استقبال، استفسار، استحسان، استعمال، استحقاق وغیرہ

یہ اور اس طرح کے بے شمار عربی مصادر و الفاظ اور اُن سے بنے دوسرے الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن اُردو پر عربی کے اِن گہرے اور واضح اثرات کے باوجود لسانی اصولوں پر اُردو کو عربی سے منسلک کرنا غلطی ہوگی، اسلام اور قرآن کے توسط سے فارسی و اُردو، دونوں سامی خاندان کی زندہ زبان عربی سے متاثر ہوئی ہیں لیکن اُن کا بنیادی تعلق آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے۔ اُردو کی قواعد کے صرفی و نحوی اصول اور لفظ سازی کے قاعدے زیادہ تر آریائی طرز پر بنائے گئے ہیں اس لئے علمائے زبان نے اُسے آریائی خاندان کی ایک شاخ بتایا ہے۔

اُردو کی ابتدا اور جائے پیدائش کا قضیہ

اُردو کی ابتداء کب ہوئی کہاں ہوئی اور کس طرح ہوئی اُردو ہی کیا کسی بھی زبان کے سلسلے میں اس قسم کے سوالات کا شافی جواب دینا مشکل ہے - صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ زبانیں فطری اور غیر محسوس طور پر معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کے تحت وجود میں آتی ہیں، نہ کوئی خاص شخص اُس کا بنانے والا ہوتا اور نہ اُن کے لئے وقت و مقام متعین ہوتے ہیں۔ جس وقت جہاں جیسی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق خود بخود معاشرہ اپنے لئے ایک زبان پیدا کر لیتا ہے پھر یہ زبان اپنے طور پر ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے اور اُسے آگے بڑھاتی ہے، ۔

زبان کی شکل و صورت اور باطن میں زندگی کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اُس کا لب و لہجہ عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے بہت سے الفاظ متروک و مردود ہوتے رہتے ہیں اور نئے اور جاندار لفظوں کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں لیکن یہ سارا عمل عوامی سطح پر انجانے طور پر ہوتا ہے زبان کی تراش خراش اور حذف و اضافہ میں کسی خاص شخص یا گروہ کی حاکمیت کو دخل نہیں ہوتا شیخ امام بخش ناسخ نے چند الفاظ متروک کر دیئے تھے اور اپنے شاگردوں کے ذریعے ایک طرح کی تحریک بھی چلائی تھی۔ لیکن یہ تحریک چونکہ زبان کے سلسلے میں غیر فطری تھی اس لئے عملاً کامیاب نہ ہوئی۔ حتی کہ جن الفاظ کو اُنہوں نے متروک قرار دیا تھا اُن میں کئی لفظ خود اُنہیں کے کلام میں لاشعوری طور پر داخل

ہو گئے، یہی حال اُن کے شاگردوں کے کلام کا ہے اُردو کے بعض محققین نے ناسخ اور اُن کے شاگردوں کے کلام کی چھان بین کر کے ایسے الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ دوسروں نے تو اس تحریک کا بہت ہی کم اثر قبول کیا، ذیل کے دو شعر دیکھیے پہلا غالب کا ہے۔ دوسرا اقبال کا۔

غم اگرچہ جاں گُسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا (غالب)

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک (اقبال)

ناسخ کا مشورہ یہ تھا کہ "پہ" کو "پر" کے معنی میں اور "کب تلک" کو "کب تک" کے معنی میں استعمال نہ کیا جائے، لیکن اوپر کے شعروں میں استعمال ہوئے ہیں اور لُطف کی بات یہ ہے جو مزہ ان اشعار میں "پہ" اور "کب تلک" کے الفاظ دیتے ہیں وہ "پر" اور "کب تک سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔
ناسخ کی رائے یہ بھی تھی کہ "آئے ہے"، "جائے ہے" وغیرہ کو ترک کر کے اُن کی جگہ "آتا ہے" "جاتا ہے" وغیرہ بولا جائے اور "آوے" "جاوے" وغیرہ کو چھوڑ کر اُن کے بدلے "آئے" "جائے" کا استعمال کیا جائے لیکن یہ باتیں خوش ذوقی پر مبنی نہ تھیں اس لئے پسند نہ کی گئیں غالب کے یہ اشعار دیکھیے۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

غارت گرے ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

ان میں "آئے" کی جگہ "آتا ہے" اور "آوے" کی جگہ "آئے" کے استعمال سے اشعار بے جان ہو جائیں گے۔
غرض کہ چند اصطلاحی الفاظ کے سوا، عام استعمال، کے الفاظ کے سلسلے میں ترک و اختیار کا حکم ہمیشہ بے وقعت گردانا گیا ہے۔ اُردو ہی کیا دُنیا کی ہر زبان کسی کے احکام کی تابع ہو کر نہیں آنا دانہ آگے

بڑھتی ہے" جہانگیر، ایک نہایت خوش ذوق اور نفیس طبع بادشاہ تھا، اُس نے حکم دیا کہ "شراب" کو "رام زنگی" کہا جائے، یہ لفظ سرکاری حکم سے دفتری زبان میں استعمال بھی ہونے لگا لیکن قبولِ عام نصیب نہ ہوا، شراب آخر شراب رہی اور "رام زنگی" سے کوئی واقف نہ ہوا۔ محمد شاہ نے چاہا کہ "سنگترہ" کو اس کی خوبصورتی کے سبب نگترہ کہا جائے اور "سنگترہ" میں جو لفظ "سنگ" بمعنی پتھر داخل ہے اُسے الگ کر دیا جائے، تجویز اچھی تھی لیکن عوام نے پسند نہ کیا، یہ ضرور ہوا کہ "سنگترہ" سے حرف "گ" جو اصل میں ثقالت کا سبب تھا خود بخود غائب ہوگیا اور اب سنگترہ کی جگہ "سنترہ" ہی مستعمل ہے ایجاد پسندوں نے ریلوے لائن کے لئے "سکۃ الحدید" کا لفظ وضع کیا لیکن مقبول نہ ہوا چند سال ہوئے پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خاں نے حکم دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو پوربو پاکستان اور مغربی پاکستان کو پچھمو پاکستان کہا جائے، سرکاری دفتر، ریڈیو اور ٹی وی سے برابر اس کی اشاعت ہوتی رہی لیکن بے سود، کسی نے ایک نہ سُنی اور عام و خاص سب مشرقی پاکستان و مغربی پاکستان ہی کہتے رہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان پر کسی کی اجارہ داری اور حکمرانی کبھی نہیں قائم رہ سکی وہ آزادانہ اپنے معاشرے کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور جس معاشرے یا ماحول سے اُسے سابقہ پڑتا ہے اُسی کی ضرورتوں کے مطابق اسی میں از خود ڈھل جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی ہر زبان مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے یہ خیال کرنا کہ انگریزی زبان، انگلینڈ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں ایک ہی لہجے (ACCENT) میں بولی جاتی ہے صحیح نہیں ہے، ہر علاقے کے لوگ اسے اپنے اپنے انداز میں بولتے ہیں اور یہی تقاضائے فطرت ہے، یہی حال اُردو کا ہے، لکھنؤ، دہلی، حیدر آباد اور لاہور وغیرہ اُردو کے قدیم علمی و ادبی حلقے ہیں۔ اور ان علاقوں میں اُردو کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ یکساں طور پر مستند و معیاری ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کسی جگہ کی زبان معیار سے گری ہوئی ہے، بایں ہمہ ان مقامات کے لہجوں میں خاصا فرق نظر آتا ہے، یہ لہجے دراصل جغرافیائی ماحول اور تمدنی زندگی کے تابع ہوتے ہیں اور ان سے بچ کر نکلنا آسان نہیں ہوتا اس لئے کسی خاص علاقے کے لوگوں کا کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کے لب و لہجہ پر ہنسنا یا اُسے اپنے لہجے سے گھٹیا خیال کرنا، زبان اور اُس کے مزاج سے ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ہم یوپی اور دہلی والے خاص طور پر اپنے لہجوں پر ناز

کرتے ہیں اور دوسروں کے لہجوں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن خود یہ غور نہیں کرتے کہ ماحول کے فطری تقاضوں کے مطابق خود ہمارا لب و لہجہ کس طرح بدل رہا ہے پہلے ثقہ حضرات فعلِ حال تمام کے جملے اس طور پر استعمال کرتے تھے ۔

(۱) میں نے ان سے کہہ دیا ہے ۔

(۲) حامد نے اپنے دوست کو خط لکھ دیا ہے ۔

اس سے انکار نہیں کہ یہ درست ہیں اور آج بھی بولے اور لکھے جاتے ہیں لیکن اب ان جملوں کو یوں بھی بولا جاتا ہے کہ :-

(۱) میں نے ان سے کہا ہوا ہے ۔

(۲) حامد نے اپنے دوست کو خط لکھا ہوا ہے ۔

ان فقروں کو سُن کر کوئی کتنا ہی ناک بھوں کیوں نہ چڑھائے لیکن یہ مقبول ہو رہے ہیں ۔ اور اُن حلقوں میں بھی بولے اور سُنے جاتے ہیں جو خاص یوپی اور دہلی سے تعلق رکھتے ہیں ، یہ اثر کس کا ہے ؟ اس سے بحث نہیں ہے، سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ زبان اور اُس کے لہجے میں عہد بہ عہد اور مقام بمقام تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ، یہی تبدیلیاں جب قبولِ عام حاصل کر لیتی ہیں تو معیاری زبان کا جزو بن جاتی ہیں ، اُردو کے بدلتے ہوئے مزاج کے سلسلے میں چند لفظوں کے استعمال کا ایک اور اسلوب دیکھیے، عام خاص سبھی بولتے اور لکھتے ہیں ۔

(۱) یہ میرا اپنا گھر ہے ۔

(۲) وہ تمہارا اپنا معاملہ ہے ۔

خاص علاقوں کے ثقہ حضرات نے " میرا اپنا " اور " تمہارا اپنا " کے ٹکڑوں پر بھی اعتراض کیا ، جواب صرف یہ تھا کہ دہلی اور آگرہ کے لوگ اس طرح نہیں بولتے لیکن کسی کی ایک نہ چلی ، اب یہ اسلوب عام ہے اور علماء و فصحا سبھی لکھتے اور بولتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ اسلوب بڑے توں سے چلا آرہا تھا جیسا کہ غالبؔ کے اس شعر سے ظاہر ہے ۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
غیر کے لین دین سے کیا کام

یہ محض معترضین کی بے خبری تھی جو اس اسلوبِ گفتگو کو غلط سمجھتے تھے چند الفاظ کا استعمال اور دیکھئے ۔

(۱) اُس نے آج بہت بور کیا ۔

(۲) حامد کی تقریر نے جلسے میں بے سبب بوریت پیدا کر دی ۔

(۳) آیا بڑا دلّا کہیں کا ۔

(۴) محمود آج کل محلے کا دادا گیر بنا گھومتا ہے ۔

(۵) میں آپ کی دادا گیری نکال دوں گا ۔

(۶) اس نے خواہ مخواہ پھڈا کھڑا کر دیا ہے ۔

(۷) ایک روپے کا کھلّا چاہیئے ۔

(۸) اسی جگہ محمود کے بازو میں حامد کی بھی دکان ہے ۔

(۹) اُس نے ایک جھوٹا بیان داغ دیا تو کیا ہوا سیاست میں سب چلتا ہے ۔

(۱۰) اُس کا بڑا لڑکا تو بالکل لوفر ہے ۔

(۱۱) کاغذ کے بیوپاری نے کہا مال خلاص ہے ۔

ان جملوں میں بور، بوریت ، دلّا ، دادا گیر ، دادا گیری ، پھڈا ، کھلّا ، بازو ، چلتا ہے ، لوفر اور خلاص ، ایسے الفاظ ہیں جو آئے دن سُنے اور بولے جاتے ہیں اب محض اس بنا پر کہ یہ اُردو میں پہلے موجود نہ تھے یا فلاں شہر و فلاں علاقے میں استعمال نہ ہوتے تھے کون ہے جو انہیں متروک و مردود قرار دے گا ، ان الفاظ نے پوری طرح جڑ پکڑ لی ہے اور اب اُنہیں عام و خاص بھی استعمال کرتے ہیں ۔

نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ بعض پرانے الفاظ نئے معنوں کے ساتھ اُردو میں داخل ہو رہے ہیں ۔ ذیل کے جملوں کو دیکھئے ۔

(۱) جلد بازی کی ضرورت نہیں تسلّی سے کام کرو ۔

(۲) آرام آرام سے چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر گرو گے ۔

(۳) اس کپڑے کا رنگ بہت گاڑھا ہے ۔

(۴) میری اُس کی بڑی دوستی ہے ۔

(۵) میرا دوست آج کل ملتان میں کمشنر لگا ہوا ہے ۔

(۶) آپ نے بہت کم کھایا کوئی چیز اور لیجیے ۔

(۷) آپ کے بھائی کتنی تنخواہ لیتے ہیں ۔

(۸) محمود صاحب آپ کو ساتھ والے کمرے میں مل جائیں گے ۔

(۹) میں اگلے ہفتے کو حیدر آباد گیا تھا ۔

ان جملوں میں "تسلی"، "آرام"، "گاڑھا"، "بڑی"، "کمشنر لگا ہوا ہے" "کوئی چیز اور لیجیے" "تنخواہ لیتے ہیں" "ساتھ والے کمرے" اور "اگلے کمرے" کے الفاظ و فقرات پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ اپنے معنی کس طرح بدل رہے ہیں ۔ "تسلی اور آرام" "آہستہ آہستہ" کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں ۔ "گاڑھا" سے مراد "گہرا" اور "بڑی" سے مراد "گہری" ہے، پانچویں اور چھٹویں جملوں کے خط کشیدہ ٹکڑے علی الترتیب، انگریزی الفاظ (TAKE MORE اور POSTED) کے اُردو ترجمے ہیں ۔ "تنخواہ لینا" تنخواہ پانے کے مترادف ہے اور "اگلے" بمعنی "پچھلے" آیا ہے ۔

اس طرح کے نہ جانے کتنے الفاظ و فقرات اور محاورات و اسالیب ہیں جو مقامی زندگی کے زیر اثر، اُردو میں داخل ہو کر اُسے بالکل نیا رنگ روپ دے رہے ہیں ۔ کوئی کتنی ہی مخالفت اور کتنی ہی شعوری کوشش کیوں نہ کرے، یہ نیا رنگ روپ پوری طرح اُبھر کر سامنے آئے گا اور یہی پاکستانی اُردو کا مستقل رنگ روپ ہوگا، ایسا ہونا، بالکل فطری اور معاشرتی زندگی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اگر اُردو کو زندہ رکھنا ہے اور اُسے آگے بڑھنے کا موقع دینا ہے تو ہمیں خندہ پیشانی کے ساتھ اُسے قبول کرنا چاہئے، زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی اور اگر کبھی رہی ہے تو اس کا دور بھی دوسری اجارہ داریوں کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا، اُردو ایک بین الاقوامی اور بین الطبقاتی مزاج کی زبان ہے ۔ ابتداءً اس نے عربی، فارسی اور ہندی سے بہت کچھ لیا ہے ۔ برطانوی عہد میں اُس نے انگریزی زبان کا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اب جمہوری دور میں وہ سب سے زیادہ اثر جمہور کا قبول کرے گی ۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے قول کے مطابق :-

"ایک زبان کے بولنے والوں کو ایک ایسی جمہوری حکومت تصور کرو جس میں رائے عامہ، انتظام کا اختیار عطا کرتی ہے اور یہ اختیار ہمیشہ نگرانی اور احتساب کے ماتحت ہوتے جاتے ہیں، ہر فرد مجاز ہوتا ہے کہ مشترکہ زبان میں اضافہ کرے، یعنی نئے لفظ اختراع کرے، اگر اُن کی ضرورت ہو، اور وہ اختراع جماعت کے مذاق اور زبان کے مزاج کے تقاضے کے ناموافق نہ ہو۔"

یونانی مفکر افلاطون کا بھی یہی خیال تھا۔ اُس کے نزدیک عام لوگ ہی زبان کے معاملے میں حاکم اعلیٰ ہیں اور اس سلسلے میں کسی دوسرے کو میر فیصل نہیں بنایا جاسکتا، واقعہ بھی یہی ہے روزمرہ کے الفاظ زیادہ تر عوام ہی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ پھٹ پھٹیا، ہوائی جہاز اور تار گھر وغیرہ کے الفاظ بطور خاص بنائے نہیں گئے۔ بلکہ عوام نے اپنے طور پر بولنا شروع کیے اور اور وہ کثرتِ استعمال سے مستند قرار پاگئے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ پتہ لگانا کہ کسی خاص لفظ یا زبان کی ایجاد، کب اور کہاں ہوئی بہت مشکل ہے، پھر بھی جس طرح زندگی کے دوسرے مشکل ترین پہلوؤں پر انسان نے برابر غور و خوض کا سلسلہ جاری رکھا ہے بالکل اُسی طرح اُس نے مختلف زبانوں کی جائے پیدائش، اُن کی نسل، باہمی تعلق اور عہدِ پیدائش پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے، جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس کی جائے پیدائش اور عہدِ پیدائش کے سلسلے میں جن علمائے زبان نے کام کیا ہے، اُنہیں دو خاص گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جنھوں نے زبان کے ارتقاء پر مورخانہ نظر ڈالی ہے اور سرسری مطالعہ سے اُردو کی جنم بھومی اور عہدِ پیدائش کا تعین کر دیا ہے۔

(۲) دوسرے وہ جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ زبان کے مطالعہ کے جدید اصولوں سے واقف ہیں اور اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے دلیل و برہان اور غور و فکر کے ساتھ لکھا ہے، اس گروہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، علامہ سلیمان ندوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر چیٹر جی، ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر سہیل بخاری وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

پہلے گروہ میں سرِ فہرست، میر امّن اور انشاء اللہ خاں انشاء کے نام ہیں۔

(۱) میر امّن نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اُردو کی ابتدا عہدِ اکبری سے ہوئی۔ اُن کا بیان ہے کہ

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم کے لوگ قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال و جواب کرکے، ایک زبان اُردو بھی مقرر ہوئی۔"

(۲) انشاء نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ اُردو کی ابتدا شاہجہاں آباد سے ہوئی۔

(۳) سر سید نے آثار الصنادید میں رائے کا اظہار کیا کہ اُردو کا ہیولیٰ خلجی سلاطین کے عہد میں تیار ہو چکا تھا، جب امیر خسرو نے پہیلیاں اور مکرنیاں، دوہروں کی شکل میں کہنا شروع کر دی تھیں لیکن اُس نے زبان کی شکل شاہجہاں کے عہد میں اختیار کی۔

(۴) امام بخش صہبائیؔ نے بھی "انتخاب دواوین" کے دیباچے میں بالکل اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔

(۵) محمد حسین آزادؔ، آب حیات میں لکھتے ہیں کہ

"اُسے نقطۂ شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اُس کے عہد میں اُردو کی طرف منسوب ہوگی، ورنہ جو نثر و نظم کی مثالیں بیان ہوئیں، اُن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر کرنا شروع کر دیا ہوگا۔"

(۶) عبد الغفور نساخ نے "رسالۂ تحقیق زبان" میں یہ رائے دی ہے کہ

"زبان اُردو روزمرہ شہر دہلی کو کہتے ہیں، اس شہر میں قدیم الایام سے

برابر ہندی مروج تھی، جب شہاب الدین محمد غوری نے اہلِ ہند کو شکست دی اور تمام ملک ہند غور کے قبضۂ اختیار میں آیا، رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ فارسی، عربی ترکی ملتا گیا، ۱۰۵۸ء میں شاہجہاں نے شاہجہاں آباد (دہلی) آباد کیا تو اطراف و جوانب سے عالم، ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ جمع ہوئے، قدیم ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق ہونے لگا، زبان اُردو کی ترقی شروع ہوئی۔"

(۷) ڈاکٹر گلکرائسٹ نے ہندوستانی فلالوجی مطبوعہ ۱۸۱۰ء (لندن) میں لکھا ہے کہ "جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت سے اُردو کی بُنیاد قائم ہوئی۔

اس طرح کی اور کئی رائیں ہیں جنہیں یہاں نقل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بات کو بے سبب طول دینے سے فائدہ نہیں۔ یہ ساری رائیں اُنیسویں صدی عیسوی اور اُس سے قبل کے ادیبوں اور مورخوں کی ہیں اور بیسویں صدی کے محققین اُنہیں تسلیم نہیں کرتے، اُن کے خیال میں یہ رائیں زبان کے گہرے مطالعے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اُردو زبان کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ضمناً کہدی گئی ہیں لیکن ان رایوں کو غلط کہنے کے یہ معنی نہیں کہ زبان کے تاریخی مطالعے میں اِن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اِن کی اہمیت یہ کیا کم ہے کہ ان بیانات نے آج کے محققین کو چونکایا ہے، زبان کے مطالعے کے لئے نئی راہیں سجھائی ہیں اور بعض قدیم ماخذوں کا سراغ دیا ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ چراغ سے چراغ جلانے کی حد تک، یہ رائیں ناقص ہوتے ہوئے بھی، اُردو زبان سے لسانی اور تاریخی مطالعے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

اب آیئے اُن اہلِ قلم کی رایوں پر نظر ڈالیں جنہوں نے زبان اور اُردو زبان کے ماخذ و ارتقاء کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

(۱) اس گروہ میں پہلا قابلِ ذکر نام گریرسن کا ہے، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں حکومت ہند نے ہندوستانی زبانوں کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا تھا، گریرسن اُس کے سربراہ تھے اور اُنہوں نے اس جائزے کو متعدد جلدوں میں "ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ" (LINGUISTIC SURVEY OF INDIA) کے نام سے مرتب کیا تھا۔ گریرسن نے

اپنے جائزے میں یہ ظاہر کیا کہ اُردو کوئی الگ مستقل زبان نہیں بلکہ "ادبی ہندوستانی" کی ایک شاخ ہے اس کی ابتدا مغل بادشاہوں کے شاہی بازاروں میں ہوئی اور یہ مغربی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے، اُردو کے علاوہ گریرسن نے "ادبی ہندوستانی" کی دوسری شاخوں کے نام ریختہ، دکھنی اور ہندی بتائے ہیں، ان چاروں شاخوں کے بارے میں اُن کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) اُردو ہندوستانی کی وہ قسم ہے جس میں فارسی اور عربی الفاظ فراوانی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

(۲) ریختہ ادبی ہندوستانی کی وہ شاخ ہے جو نظم میں استعمال ہوتی ہے۔ جب نظم میں عورتوں کی خاص زبان استعمال کی جاتی ہے تو اُسے ریختی کہتے ہیں۔

(۳) دکھنی وہ ادبی ہندوستانی ہے جو دکن کے مسلمانوں میں مقبول ہے اور اُردو کی طرح یہ بھی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لیکن اس میں فارسی عربی کے الفاظ زیادہ استعمال نہیں ہوتے۔

(۴) ہندی، سے مراد وہ زبان ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ بکثرت اور عربی فارسی کے الفاظ بہت کم ہیں۔ ہندوؤں کی ادبی زبان بھی یہی ہے اور ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

گریرسن کے ان خیالات سے بعد کے محققین نے اختلاف کیا ہے اُن کی رائے میں گریرسن کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، اُردو، ریختہ، اور دکھنی الگ الگ زبانیں نہیں یہ تینوں نام حقیقۃً ایک ہی زبان کے ہیں اور اُن سے مراد اُردو ہی ہے، یہ ضرور ہے کہ مختلف علاقوں میں اُردو کے مختلف نام رکھے گئے اور مقامی زندگی کے زیرِ اثر اس کے لب و لہجہ، قواعد اور املا وغیرہ میں بھی تھوڑا بہت فرق ہر جگہ نمایاں ہوا۔ لیکن انہیں ایک دوسرے سے الگ زبان سمجھنا اور اُردو کو مغل بادشاہوں کے بازار کی پروردہ بتانا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی معرکہ آرا کتاب "پنجاب میں اُردو" منظرِ عام پر آئی اس میں پنجابی اور اُردو کے لسانی تعلق پر بحث کرتے ہوئے شیرانی نے بتایا کہ اُردو کا اصل منبع پنجابی ہے، شیرانی صاحب نے اپنی مدلل کتاب میں نتیجے کے طور پر لکھا۔

"اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کرکے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ

پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لیکر گئے ہوں۔"

"ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں لیکن جب ان دونوں کی صرف ونحو اور دوسرے خط وخال اور فضائل پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں"

"اُردو جہاں اپنے اسما وافعال کو الف پر ختم کرتی ہے برج بھاشا واؤ پر ختم کرتی ہے برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ ہے لیکن اُردو میں بہت پیچیدہ، اُردو میں مرکب افعال کا بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے اس لئے اُردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔"

"اُردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی وملتانی زبان سے بہت قریب ہے دونوں میں اسماء وافعال کے خاتمہ پر الف آتا ہے اور دونوں میں جمع بنانے کا طریقہ مشترک ہے دونوں زبانیں تذکیرو تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی و اُردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔"

شیرانی صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اُردو کی پیدائش کے سلسلہ میں عالمانہ اور محققانہ بحثیں چھیڑی ہیں۔ اُنہوں نے محمد حسین آزاد کے اس خیال کی پُرزور تردید کی کہ اُردو، برج بھاشا سے نکلی ہے اور یہ بتایا کہ اُردو کا اصل تعلق بھاشا سے نہیں پنجابی سے ہے، شیرانی کے خیالات چونکہ بڑے فکر انگیز اور معلومات افزا تھے۔ اس لئے اس طرف دوسرے علمائے زبان نے بھی بھرپور توجہ کی اور اُردو زبان کی تحقیق کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوگیا جو اب تک جاری ہے۔

جس وقت شیرانی صاحب کی کتاب منظرعام پر آئی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، یورپ میں اسی موضوع پر، ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کا پہلا مقالہ "ہندوستانی فونیٹکس" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں پیرس سے انگریزی میں شائع ہوا۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر زور نے اپنے خیالات کو مزید تفصیلات و دلائل کے ساتھ اُردو میں "ہندوستانی لسانیات" کے نام

سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس میں زورؔ صاحب نے شیرانی صاحب کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے تھوڑے اختلاف کے ساتھ لکھا کہ

"اُردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم ہند آریائی دور میں اُس حصّۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اُردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی، کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ اُن کی اُس وقت کے اختلاف کو ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔"

"موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا ہے، ابتدا میں وہ صرف ایک تاریخی تغیّر تھا۔ آخرکار اُن دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہوتی گئی کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔ اُردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اُس زبان سے جو اِن دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے۔ اور بعض میں کھڑی بولی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لئے اُردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔"

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو اور پنجابی زبان کے مابین بھی ماں بیٹی کا رشتہ نہیں، بہن بہن کا رشتہ ہے یعنی اُردو زبان اصل سرچشمہ پنجابی یا کھڑی بولی نہیں بلکہ وہ قدیم زبان ہے جس سے خود پنجابی اور کھڑی بولی نکلی ہیں اور جو کسی وقت سارے شمالی مغربی سرحدی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن لسانیات کے عالم ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر زور کے بیانات کی روشنی میں یہ سوال اُٹھایا کہ کھڑی بولی اور پنجابی سے پہلے جو زبان شمالی مغربی سرحدی صوبوں، خاص طور پر دہلی اور آگرہ کے نواح میں عام طور پر بولی جاتی تھی وہ کیا تھی ــــ شیرانی صاحب نے اشارہ کیا تھا کہ یہ زبان، راجستھانی یا برج رہی ہوگی، لیکن مسعود حسین خاں نے اپنی گراں قدر کتاب "مقدمۂ تاریخ زبان اُردو" مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی میں اس مسئلے پر عالمانہ بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ

"مسلمانوں کے فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں زبان کا (جو) کینڈا تھا، وہ نہ تو برج بھاشا ہے نہ کھڑی بولی، بلکہ اس عہد کی قدیم اَپ بھرنش روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔"

اسی "اَپ بھرنش" کی ترقی یافتہ صورت "ہریانی" کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اُردو کا اصل ماخذ بتایا ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی رائے سے بعض محققین متفق ہیں اور بعض کو اختلاف ہے۔ ڈاکٹر نور صاحب مسعود حسین خاں کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے، اُنہوں نے "اُردوئے معلیٰ" (مجلہ دہلی یونیورسٹی) کے لسانیات نمبر میں تفصیل سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب "اُردو زبان کا ارتقاء" بھی اُردو کے ماخذ کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی ہے اس میں سبزواری صاحب نے شیرانی اور مسعود حسین خاں، دونوں کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اُردو کا قدیم ترین اور اصلی سرچشمہ پالی زبان کو بتایا ہے۔ ڈاکٹر سبزواری نے پالی اور اُردو کی مشترک خصوصیات کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ پنجابی کے مقابلے پالی اُردو سے زیادہ قریب ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "نقوش سلیمانی" بھی قابل ذکر ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر متعدد علمی و ادبی مقالات و خطبات شامل ہیں ان میں سے بعض میں اُردو زبان کے ارتقائی منزلوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، پہلی بار نقوش سلیمانی ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی۔ اس میں علامہ نے لکھا ہے کہ :۔

"اُردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میں جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے۔"

"اُردو شاہجہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔"

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ پیدا ہوئی۔"

قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں اُس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔"

کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی کے لیکچروں کا مجموعہ ۱۹۴۲ء میں "انڈو آرین اور ہندی" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں چٹرجی نے دہلی کے گرد و نواح کی کھڑی بولی کو اُردو سے قریب تر بتایا ہے لیکن وہ اسے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو اور پنجابی کے رشتے بہت قدیم اور پختہ ہیں اور اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں پنجابی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۸ء میں پروفیسر احتشام حسین نے ایک کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے نام سے شائع کی، یہ دراصل جان بیمز کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے اور احتشام صاحب کے بسیط و وقیع مقدمہ کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ مقدمے میں احتشام صاحب نے مختلف نظریوں پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُردو کا اصل ماخذ کھڑی بولی ہے۔

۱۹۴۲ء میں زبان کے بعض مسائل سے متعلق ایک کتاب "کیفیہ" کے نام سے شائع ہوئی یہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی تصنیف ہے، اس کے آغاز میں اُردو کے آغاز و ارتقاء کا بھی مفصل ذکر آیا ہے، پنڈت کیفی کا خیال یہ ہے کہ اُردو اپنے ابتدائی دور میں شمالی اور شمالی مغربی

ہند کی زبانوں سے متاثر رہی ہے آخر میں یہ بھی کہدیا ہے کہ

"راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطّے کو اُردو کا مولد ہونے کے امتیاز سے محروم کیا جائے یا یہ طرّہ ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار میں لٹکایا جائے"

اس سلسلے کے اور نہ جانے کتنے پہلو ہیں جن پر ابھی کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے، اُردو کا بالکل نئے ڈھب سے جائزہ لیا ہے اُن کی کتاب "اُردو کا رُوپ" ابھی حال میں شائع ہوئی ہے اُنہوں نے مختلف دلائل سے یہ بتایا کہ اُردو پر سب سے زیادہ اثر دراوڑی زبان کا ہے اور یہی دراصل اُردو کا سب سے قدیم ماخذ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی کتاب "ادبی تاریخ کا خاکہ" میں جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے وہ اُردو کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی رائے سے قریب تر ہے لیکن ابھی وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور جدید لسانیات سے گہری واقفیت رکھنے کے سبب ممکن ہے وہ کسی اور نتیجے تک پہونچیں

رسم الخط اور اُردو رسم الخط

رسم الخط اور زبان سے اس کا تعلق

رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ہیں جنہیں حروف کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے، زبان خود کیا ہے؟ اس کا جواب پچھلی سطور میں کسی جگہ تفصیل سے دیا جا چکا ہے، اس جگہ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ زبان نام ہے مجموعۂ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اور اصوات نام ہے اُن تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں، یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں۔

زبان کی طرح رسم الخط کے وجود میں آنے کے بھی اسباب ہیں، زبان کی بالکل ابتدائی منزلوں میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ہوگی تو آواز دینے والے نے مخاطب پر اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اصل چیز دکھائی ہوگی یا پھر جس چیز کی طرف توجہ دلانی مقصود رہی ہوگی اُس کی نشاندہی کے لئے کوئی تصویر، نقش یا علامت بنا دی ہوگی، ٹھوس چیزوں کے سلسلے میں نقوش و علامات یا تصاویر سے بڑی مدد ملی ہوگی۔ لیکن جذبات و کوائف کو سمجھنے سمجھانے میں خاصی دشواری پیش آئی ہوگی اس لئے کہ جذبات و کوائف کا تعلق عالمِ خارجی سے نہیں عالمِ محسوسات سے ہے پھر بھی آج جبکہ ہر قسم کے اظہارِ خیال کے لئے رسم الخط ہی سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انسان نے بہت جلد جذبات و محسوسات کے اظہار کے لئے بھی علامتیں وضع کر لی تھیں، یہی علامتیں ہزاروں سال کی مسافت طے کر کے حروف کے نام سے موسوم ہوئیں اور آج اُنہیں کا دوسرا نام رسم الخط ہے۔

زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، ان میں جسم و روح کا تعلق ہے اور وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا غلطی ہے، لباس کو اُتار کر پھینکا جا سکتا ہے، بدلا جا سکتا ہے، رسم الخط زبان کا لباس نہیں بلکہ اُس کی جلد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اُسے زبان سے الگ کرنے کا نتیجہ زبان کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، پروفیسر احتشام حسین صاحب نے ایک زمانے میں "زبان اور رسم الخط" کے باطنی تعلق پر بحث چھیڑی تھی اور اس بحث میں دوسروں کو بھی دعوتِ فکر و نظر دی تھی، چنانچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، علامہ نیاز فتحپوری، پروفیسر مسعود حسن رضوی اور راقم الحروف کے مضامین اس بحث کے سلسلے میں ۱۹۵۱ء کے نگار (لکھنؤ) میں شائع ہوئے تھے، ان مضامین میں اس خیال کو گمراہ کن بتایا گیا تھا کہ کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے، ایک زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من و عن ظاہر ہی نہیں کئے جا سکتے، اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر زبان کے لئے ایک جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی، ساری زبانیں ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے اپنا کام چلا لیتیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے۔

HILL (۴) HELL (۳) HID (۲) HEAD (۱)

اگر انہیں اردو میں لکھا جائے تو "ہڈ" اور "ہل" کے سوا کسی اور طرح لکھنا ممکن نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ مجبوری ادائے تلفظ میں حارج ہوگی، اب ذرا ان لفظوں کو دیکھئے۔

(۱) EYE - I

(۲) HEAR HEIR AIR

(۳) BERTH ، BIRTH

(۴) HOLE ، WHOLE

(۵) DIE ، DYE

(۶) FOUL ، FOWL

(۷) LOSE ، LOOSE

LAWYER ، LIAR (۸)

FOR ، FAR (۹)

SEE ، SEA (۱۰)

SUN ، SON (۱۱)

انہیں اُردو میں علی الترتیب ۔ آئی ، ہیر ، برتھ ، ہول ، ڈائی ، فاؤل ، فور ، لائر فار ، سی ، اور سن لکھا جائے گا اور یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ انگریزی کا کون لفظ اس جگہ مراد ہے انگریزی ۔ ہم صوت اور ہم تلفظ الفاظ ایک دو نہیں ہزاروں ہیں ۔ اس لئے وہ اُردو رسم الخط میں معنوی الجھن پیدا کریں گے ۔ ایک مثال اور دیکھئے ۔

MAIN ، MEAN ، MAN

میں سے انگریزی میں ہر ایک اپنا جُدا تلفظ اور معنی رکھتا ہے لیکن اُردو رسم الخط میں یہ سب "مین" کی صورت میں لکھے جائیں گے اور اُن کے تلفظ و معنی تک پہونچنا دشوار ہوگا ، بعض انگریزی سے الفاظ تو ایسے ہیں کہ انہیں کسی طرح اُردو میں لکھا ہی نہیں جا سکتا ۔ مثلاً

SURE ، CURE ، PURE

اُردو میں "پیور" ۔ "کیور" ۔ "شیور" کی شکل میں لکھے جائیں گے اور اپنا تلفظ یکسر کھو بیٹھیں گے انگریزی کے BADGE ، CATCH اور BATCH کی صورت اُردو میں ترتیب وار "کیچ ، بیج ، اور بیچ ، ہو جائے گی اور یہ اُردو کے با معنی لفظ بن جائیں گے ۔

انگریزی میں حروف علت (VOWEL) یعنی A ، E ، I ، O اور U کی آوازیں اکثر الفاظ میں ایک سی ہو جاتی ہیں مثلاً ALL ، EARLY ، SIR ، OUGHT اور UGLY وغیرہ ، ظاہر ہے کہ انہیں اُردو رسم الخط میں الف یا ع سے لکھا جائے گا اور تلفظ و معنی دونوں کے سمجھنے میں دقت ہوگی ، اس جگہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ انگریزی میں حروف تہجی یا آوازیں صرف چھبیس ۲۶ ہیں ، اس کے برعکس اُردو میں حروف یا آوازوں کی تعداد تقریباً دگنی ہے باایں ہمہ اُردو رسم الخط میں انگریزی کا لکھنا ممکن نہیں ہے ، عربی اور فارسی رسم الخط میں انگریزی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اور بھی زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے D اور T

کی آوازیں عربی اور فارسی حروف میں کہاں سے پیدا کی جائیں گی۔

یہی دشواریاں اُردو کو انگریزی حروف میں لکھنے سے پیدا ہوں گی۔ اُردو میں حروف تہجی یعنی آوازوں کی تعداد کثیر ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے چھبیس حروف اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ بہت سی آوازیں ایسی ہیں جو انگریزی یا رومن رسم الخط میں موجود نہیں ہیں مثلاً۔

د، ڑ، ٹہ، ت، ط، ع، غ، خ، ق وغیرہ کی آوازوں کو لے لیجئے اور دل، پہاڑ، تمام، طالب، وسیع، غریب، خدا، کو انگریزی میں لکھئے تو بالترتیب اُن کی صورت یہ ہوگی DIL ، PAHAR ، TAMAM ، TALIB ، WASI ، GHRIB ، KHUDA یعنی، دل کو ڈل، پہاڑ کو پہار، تمام کو ٹمام، طالب کو ٹالب، وسیع کو وسی، غریب کو گریب اور خدا کو کھدا لکھا جائے گا۔ اس سے تلفظ و معنی دونوں بُری طرح مجروح ہوں گے۔ د، غ اور خ، کی آوازیں تو رومن میں کسی طرح پیدا ہی نہیں کی جاسکتیں۔ اگر THAT کی مثال دے کر یہ کہا جائے کہ ذ کی آواز TH سے، غ کی آواز GH سے اور خ کی آواز KH سے پیدا کرلی جائیں گی تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ

دھ، گھ، کھ وغیرہ کی آوازیں کہاں سے آئیں گی؟ چنانچہ اگر مندرجہ ذیل الفاظ انگریزی میں لکھے جائیں۔

غُل، گھُل، دم، تھم، خر، کھر وغیرہ

تو ان کی صورتیں یہ بنیں گی اور اُوپر کے لفظوں میں سے صرف ایک ہی سمجھا جائے گا۔

GHUL ، THAM ، KHAR

ایسی ہی مشکلات، ا اور ع، ح اور ہ، ث، ص، س اور دوسرے متشابہ الصوت حروف کی آوازوں میں پیش آئیں گی اور اُن کے ذریعے صحیح تلفظ و معنی کا اخذ کرنا ناممکن ہوگا۔

ان امثال و تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر زبان کا رسم الخط اُس کے اپنے مزاج اور ساخت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ اسی میں صحیح طور پر پڑھی جاسکتی ہے اور اسی میں لکھی جاسکتی ہے، کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں منتقل کرنے سے اُس کی صورت اس قدر مسخ ہو جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہو جائیگا اسی لئے رسم الخط کو زبان کا لباس نہیں، جلد کہا جاتا ہے۔ جلد اُتار دینے سے زبان اصل صورت میں

باقی نہیں رہ سکتی ۔

اُردو رسم الخط اور اُس کی جامعیت و خصوصیات

اب آئیے اس بات پر غور کریں کہ اُردو کا رسم الخط کس قسم کا ہے اور اس میں کیا خامیاں اور خوبیاں ہیں، کسی زبان کی رسم الخط کی اچھائی یا برائی کو دو طریقوں سے پرکھا جاسکتا ہے ۔ایک یہ کہ وہ کس حد تک مفید ہے اور دوسرے یہ کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت ہے ۔ اُوپر بتایا جاچکا ہے کہ ہر زبان کے نظام تہجی میں اتنے ہی حروف یا نشانات ہوتے ہیں جتنی اُس کے بولنے میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں ، ان حروف کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ساری آوازوں کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے لے آئیں ، اس لحاظ سے اُردو کا رسم الخط بہت جامع اور کامیاب رسم الخط ہے کہ وہ اس زبان کی ساری مروج آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔

اُردو رسم الخط میں حروف تہجی یعنی ا ، ب ، ت ، ث وغیرہ کی تعداد پچاس[۵۰] ہے انگریزی میں یہ صرف چھبیس[۲۶] ہیں ، ہندی یعنی ناگری رسم الخط میں اُن کی تعداد بیالیس[۴۲] ہے عربی میں اُنتیس[۲۹] اور فارسی میں تینتیس[۳۳] ہے ، یہ حروف بھی چونکہ ان زبانوں میں استعمال ہونے والی آوازوں کی تعداد کا تعین کرتے ہیں اس لئے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ، اس کی وجہ ہے اُردو بین العلاقائی و بین المملکتی مزاج کی زبان ہے ۔ اُس نے اپنے نظام تہجی میں عربی ، فارسی اور ہندی یعنی آریائی اور سامی دونوں خاندان کی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے ، اس میں انگریزی سے لے کر علاقائی زبانوں تک کی ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی تقریباً ہر زبان کی آوازوں کا مجموعہ بن گئی ہے ، ہر اُردو جاننے والا ، عربی ، فارسی ، ہندی اور انگریزی کو اُن کے حقیقی تلفظ کے ساتھ بول سکتا ہے ۔ اس لئے کہ ان میں ایک آواز بھی ایسی نہیں جو اُردو میں موجود نہ ہو یا جس کو ادا کرنے پر اُردو خواں طبقہ قادر نہ ہو ۔ گویا جس طرح اُردو اپنے ذخیرہ الفاظ اور صرف و نحو کے اصول کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے اُسی طرح اُس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے وہ دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے اور ظاہر میں عربی وفارسی رسم الخط سے بہت قریب ہے لیکن اُردو کے رسم الخط کو عربی یا فارسی کا رسم الخط خیال کرنا درست نہ ہوگا اُردو کے حروفِ تہجی میں ہندی اور انگریزی کی ایسی آوازیں بھی شامل ہیں جو عربی وفارسی میں نہیں ہیں ۔ ان آوازوں کی تعداد

ایک دو نہیں خاصی ہے مثلاً ۔

ڈ ، ٹ ، ڑ ، بھ ، تھ ، ٹھ ، کھ ، جھ ، دھ وغیرہ کی آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں، ظاہر ہے عربی و فارسی داں حضرات کو ان آوازوں کے نکالنے اور ہندی یا انگریزی کو صحیح تلفظ کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں سخت مشکل ہوگی لیکن اُردو خواں افراد کو کسی زبان کے سیکھنے یا اسے لکھنے پڑھنے میں بہت آسانی رہے گی ۔ نتیجۃً کہنا پڑتا ہے کہ اُردو کا رسم الخط ہے اور اس کی وسعت ساری زبانوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔

سر ولیم جونس نے کہا تھا کہ :۔

" مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آسکتا ہے ، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ ظاہر کیا جاسکے ، خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل ، اس طرح مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اُس زبان کی ہر آواز کے لئے ایک مخصوص نشان ہو ۔"

رسم الخط کی اس تعریف پر اُردو کا رسم الخط پورا اُترتا ہے ۔

اُردو رسم الخط کی جامعیت و ہمہ گیری سے قطع نظر ، اس کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ ناگری اور انگریزی رسم الخط کے مقابلے میں جگہ بہت کم لیتا ہے ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقت اور کاغذ دونوں کی بچت ہوتی ہے ، تیسری بات یہ ہے کہ دیکھنے میں بھی دیدہ زیب ہے انگریزی اور ہندی زبانوں کے حروف کے ساتھ اُردو کے حروف پر ایک نظر ڈالیئے تو اندازہ ہوگا کہ سادگی کے باوجود اُردو کے حروف نگاہ کے لئے ایک خاص قسم کی کشش رکھتے ہیں ، چوتھی خوبی یہ ہے کہ اُردو میں اعراب کی ضرورت نہیں پڑتی ، رومن میں u ، o ، i ، E ، A کے حروف زبر، زیر اور پیش کی آواز کے لئے جگہ جگہ استعمال ہوتے ہیں ، یہی حال ناگری یا ہندی رسم الخط کا ہے ۔

अ आ इ ई उ ऊ وغیرہ اور اُن کی منترائیں اعراب کی حرکتیں پیدا کرتی ہیں ۔ چنانچہ جگہ جگہ ان حروف علت اور اُن کی علامتوں سے کام لینا پڑتا ہے ، اُردو میں آسانی یہ ہے کہ اعراب کے لئے الگ سے حروف نہیں ہیں بلکہ اعراب کا کام زبر ، زیر ، پیش کے مختصر نشانات سے لے لیا جاتا ہے ، اس کی ضرورت بھی کچھ دنوں کے لئے رہتی ہے بعد کو جب مشق بہم

پر پہچانی جاتی ہے تو اِن نشانات کی بھی ضرورت نہیں رہتی جملے کی ساخت اور مفہوم کے لحاظ سے ہر لفظ کے اعراب خود بخود ذہن میں اُبھر آتے ہیں، یہ اُردو کا ایسا وصف ہے جو دوسری زبانوں میں بہت سے کم نظر آتا ہے۔

پانچویں امتیازی بات یہ ہے کہ اُردو رسم الخط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے اور اُس کے حروف اور اُن کی آوازیں عربی و فارسی سے بہت قریب ہیں، یہ قربت اُردو والوں کو عربی اور فارسی سیکھنے میں مدد دیتی ہے، عربی و فارسی والے بھی بہ آسانی اُردو میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں، عربی و فارسی سے ہمارا جو ثقافتی و تہذیبی اور اسلامی و دینی رشتہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اُردو کا رسم الخط ان رشتوں کو اُستوار کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

اُردو رسم الخط کی بعض کمزوریاں اور معترضین

اس طرح کی اور کئی باتیں اُردو رسم الخط کی خصوصیات میں شمار کی جا سکتی ہیں لیکن ان اوصاف کے باوجود بعض حضرات اُردو رسم الخط کو جامع اور مکمل نہیں سمجھتے، اُن کے خیال میں ناگری (ہندی) اور رومن (انگریزی) رسم الخط، زیادہ کارآمد اور سہل الحصول ہیں، بعض حلقوں کی طرف سے یہ آواز بھی اُٹھائی جاتی ہے کہ اُردو کا رسم الخط قابلِ اصلاح ہے اور جب تک اس میں مناسب اصلاحات نہ کی جائیں گی اُردو کی مقبولیت واشاعت محدود ہی رہے گی بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ اُردو رسم الخط سرے سے ناقص ہے اور جب تک اسے نہ بدلا جائے گا اُردو کی ترقی کے امکانات روشن نہ ہونگے۔ یہ باتیں غیروں کی طرف سے نہیں خود اُن لوگوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں جو اُردو ہی لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر توجہ دی جائے۔ اگر یہ باتیں سچ ہیں تو انہیں قبول کر لیا جائے اور غلط فہمی یا اُردو دشمنی کا نتیجہ ہیں تو اُن کی پُرزور تردید کی جائے۔

اُردو رسم الخط پر جو اعتراضات عام طور پر کئے جاتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) اُردو رسم الخط میں حروفِ تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ان کا سیکھنا اور سکھانا خاصہ مشکل ہے۔ اس کے برعکس دوسری زبانوں کے حروف تعداد میں بھی کم ہیں اور لکھنے میں بھی سادہ ہیں اس لئے بچے اُن میں جلد مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

(۲) اُردو رسم الخط کے حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں، کبھی پورے لکھے جاتے ہیں کبھی آدھے اور کبھی کبھی صرف اُن کا چہرہ بنا دیا جاتا ہے، یہ تبدیلی، اُردو لکھنا، پڑھانا سکھانے میں حارج ہوتی ہے، اور اُردو پر قابو پانے کے لئے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔

(۳) اُردو میں ہم صوت، یعنی ایک ہی قسم کی آواز رکھنے والے حروف متعدد ہیں، مثلاً ء اور ع، ت اور ط، ث، س، ص، ذ، ز، ظ، اور ض، ح اور ہ وغیرہ یہ آوازیں، لکھنا سکھانے میں خاص طور پر الجھن پیدا کرتی ہیں، طلبہ کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کونسا لفظ "ث" سے لکھیں کونسا "س" سے اور کون سا "ص" سے، چنانچہ املا کی غلطیاں ایک عرصے تک اُن سے سرزد ہوتی رہتی ہیں اور وہ اس پر بمشکل قابو حاصل کر پاتے ہیں۔

(۴) اُردو میں اعراب کی دشواریاں ہیں، یہاں ناگری اور رومن کی طرح زیر، زبر، پیش کے لئے حروف نہیں ہیں۔ صرف قیاس سے زیر، زبر، پیش لگا کر کام چلایا جاتا ہے۔ یہ چیز تلفظ اور املا کے تعین میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

(۵) اُردو رسم الخط میں بہت سے حروف لکھے جاتے ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے مثلاً خواب و خواہش کو "خاب" اور "خاہش" بولا جاتا ہے اور "و" کی آواز کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ لکھنے میں یا املا میں اس کا لانا ضروری ہے یہی حال "عبدالرشید" اور "فی الحقیقت" وغیرہ کے الفاظ کا ہے۔

(۶) ٹائپ اور طباعت کی مشینیں مشکل سے تیار ہوتی ہیں، ٹائپ اور طباعت کے کام میں وقت زیادہ لگتا ہے اور پیسے بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں یہ چیز اُردو کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔

یہ سارے اعتراضات، فارسی اور عربی رسم الخط پر بھی وارد ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اُردو رسم الخط ان دونوں سے بہت قریب ہے، صرف بعض آوازیں اور ان کے نشانات یعنی حروف تو اُردو میں زیادہ ہیں، لیکن جہاں تک جوڑ، شوشہ، مرکز، گشش اور دائروں کا سوال ہے، وہ بالکل ایک جیسے ہیں، تینوں زبانیں دائیں سے بائیں کو بالکل ایک ہی ڈھب سے لکھی جاتی ہیں، تینوں میں خط نسخ اور نستعلیق سے کام لیا جاتا ہے اور سب میں ٹائپ و طباعت کے مسائل ایک جیسے ہیں لیکن آج تک کسی نے فارسی یا عربی رسم الخط کو ناقص بتانے کی ہمت نہیں کی، خود ایرانی اور عربی علمائے زبان نے اس قسم کا خیال ظاہر نہیں کیا کہ اُن کے رسم الخط کے سبب فارسی اور عربی کی ترقی رُکی ہوئی ہے بلکہ عملاً یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ عربی و فارسی

کی کتابیں خوب صورت ٹائپ اور نستعلیق میں، اعلیٰ درجے کی طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آرہی ہیں اور مقبول ہورہی ہیں، کسی نے رسم الخط کو کتابوں کی اشاعت کی راہ میں حائل قرار نہیں دیا، پھر آخر، اُردو رسم الخط ہی کو اعتراضات کا نشانہ کیوں بنایا جارہا ہے؟ وجہ ظاہر ہے ہم میں غلامانہ ذہنیت کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ ہم اپنی چیزوں کو بے وقعت اور دوسروں کی ہر چیز کو بے سبب وقیع خیال کرتے ہیں کیا علم وفن، کیا فکر وخیال اور کیا زبان وبیان، سب میں ہماری حیثیت مقلّد کی ہو کر رہ گئی ہے ایجاد واختراع تو دور کی باتیں ہیں اپنی روایات واقدار کی پاسداری کا احساس بھی ختم ہوتا جارہا ہے، ورنہ بغیر سوچے سمجھے غریب اُردو رسم الخط کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جاتا اور اگر کوئی غیر اُس پر اعتراض کرتا تو عربی وفارسی رسم الخط کی مثالوں سے اُس کا منہ بند کر دیا جاتا، لیکن یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ اس لئے آئیے سارے اعتراضات کا ایک ایک کرکے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ معترضین اپنے موقف میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔

(۱) پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُردو میں حروفِ تہجی کی تعداد زیادہ ہے اور اُن کا سیکھنا سکھانا آسان نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ حروف کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن یہ چیز اُردو کی سرشت اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ بتایا جاچکا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں کی مدد سے تیار ہوا ہے۔ اس نے علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، اور ہندی کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے، یہ اثر الفاظ پر بھی ہے اور اصوات یعنی حروف پر بھی۔ اُس نے فارسی کے خاص حروف پ، گ اور ژ کو، عربی کے خاص حروف ث، خ، ذ، ض، ص، ط، ظ اور ع، وغیرہ کو اور سنسکرت وہندی کے خاص حروف ڈ، ڑ، تھ، ٹھ، پھ اور جھ وغیرہ کو بھی اپنے اندر جذب کرلیا ہے اور اسی جذب واخذ کی بدولت اسے بین الاقوامی مزاج ملا ہے، اس مزاج کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ کی ساری آوازوں کی متحمل ہے۔ اگر آوازوں کی یہ کثرت اُردو رسم الخط میں نہ ہوتی تو اس کا مزاج وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ ایسی صورت میں آواز یا حروف کی کثرت کو اس کا عیب نہیں ہنر کہنا چاہئے۔ اسی ہنر کی بدولت تو اُسے قبولِ عام نصیب ہے، اگر اس میں یہ ہنر نہ ہوتا تو وہ اب تک زندہ نہ رہتی کب کی مرگئی ہوتی اس لئے کہ اُسے عربی وفارسی یا ہندی وانگریزی کی طرح

کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی ، بایں ہمہ اُس نے ترقی کی دوڑ میں بہت سی زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے یہ گویا عملاً اِس بات کا ثبوت ہے کہ رسم الخط نے کبھی اُس کی راہ میں روڑا نہیں اٹکایا بلکہ اس کی بدولت دوسری زبان کے لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں ۔

اب رہ گئی سادگی اور سہل الحصول ہونے کی بات ۔ سب جانتے ہیں کہ بچوں کو لکھنا سکھانے کے سلسلے میں جو بڑی دِقّت پیش آتی ہے وہ یہ کہ حروف کے نشانات کے مطابق اُن کی انگلیاں آسانی سے نہیں چلتیں، ایک ایک حرف کو بار بار اُن سے لکھوایا جاتا ہے تب کہیں جاکر وہ اس کے بنانے پر قابو حاصل کرتے ہیں، ماہرینِ تعلیم نے اسی دِقّت کے پیشِ نظر یہ مشورہ دیا ہے کہ بچوں سے ابتدا میں چاک سے سیدھی سادی لکیریں کھنچوائی جائیں اور ہاتھ رواں ہو جانے کے بعد اُن کی توجہ حروف تہجی کی طرف مبذول کرائی جائے اس بنیادی اصول کو ذہن میں رکھئے اور ہندی و انگریزی اور اُردو کے چند حروف پر اک ساتھ نظر ڈالئے ۔

اُردو	ہندی	انگریزی
ا	अ	A
ب	ब	B
ک	क	C
ڈ	ड	D
ف	फ	F

ان حروف کو بچوں سے لکھوائیے اور خود لکھ کر دیکھئے ، مجھے یقین ہے کہ اُردو حروف ہندی ، انگریزی کے مقابلے میں آسان ثابت ہوں گے اور کم وقت اور کم جگہ میں بنائے جاسکیں گے ۔

یہاں ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے، اُردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ ہی لیکن تعداد کی زیادتی کے باوجود اُن کا بنانا اور اُن پر قابو پا لینا آسان ہے ۔ نیچے لکھے ہوئے حروف تہجی کو غور سے دیکھئے ۔

(۱) ا

(۲) ب ، پ ، ت ، ٹ ، ث

(۳) ج ، چ ، ح ، خ

(۴) د ، ڈ ، ذ

(۵) ر ، ڑ ، ز ، ژ

(۶) س ، ش

(۷) ص ، ض

(۸) ط ، ظ

(۹) ع ، غ

(۱۰) ق

(۱۱) ک ، گ

(۱۲) ل

(۱۳) م

(۱۴) ہ

(۱۵) ی

ان میں صرف پندرہ شکلیں بنیادی ہیں ، اگر بچہ ان پندرہ حروف پر قابو پا جائے تو وہ ان کی مدد سے سارے دوسرے حروف خود بخود بنالے گا ۔ اس لئے کہ باقی حروف صرف نقطوں یا مرکز کے اضافے سے بن جاتے ہیں ۔ جو بچہ "ب" لکھ سکتا ہے وہ اس سلسلے کے سارے حروف بنالے گا اور پہلے ہی دن یہ محسوس کرنے لگے گا کہ وہ استاد کی مدد کے بغیر اپنی طرف سے بہت کچھ کر لیتا ہے ، حروف کے سارے مندرجہ بالا سلسلے اسی نوعیت کے ہیں ۔ ان کا پہلا حرف بنوا دیا جائے ، باقی حروف بچے خود بنالیں گے ۔ ایسی صورت میں محض تعداد کی بناء پر یہ کہنا کہ اُردو کے حروف تہجی کا سکھانا مشکل ہے ، صحیح نہیں ہے ۔ اُردو کے حروف بناوٹ کے لحاظ سے حد درجہ سادہ اور اشکال کے اعتبار سے ناگری اور انگریزی سے بھی تعداد میں کم ہیں اور ایک اچھا اُستاد چند دن میں سارے حروف بچوں کے ذہن نشین کرا سکتا ہے ۔

(۲) اُردو رسم الخط پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں اس لئے اُن کے

پہچاننے اور لکھنے میں دشواری ہوتی ہے، یہ اعتراض بھی غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم الخط کی ظاہری صورت کو دیکھ کر وارد کر دیا گیا ہے، اُردو میں حروف یقیناً اپنی شکلیں بدلتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھئے ۔

باسط	طبیب	رباب
لباس	سامان	تسنیم
قلم	عقل	اخلاق

ان میں "ب" "س" اور "ق" کی شکلوں پر غور کیجئے ، لفظ کے آخر میں پورا حرف آیا ہے یعنی اصل شکل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ، لفظ کے آغاز اور وسط میں شکل بدلی ہے ، لیکن یہ تبدیلی دونوں جگہ ایک سی ہے ، گویا حروف نے صرف ایک شکل بدلی ہے ۔ پھر یہ تبدیلی ایسی بھی نہیں کہ حرف پہچاننے یا اُس کے بنانے میں دقت ہو ۔ پچھلے صفحات میں کسی جگہ اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اُردو کے حروف، افراد کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ افراد اپنے چہرے سے پہچانے جاتے ہیں جسم سے نہیں ۔ اگر چند آدمی اپنے اپنے چہرے ڈھانپ کر سامنے آجائیں تو ان کا پہچاننا مشکل ہوگا ، عدالتوں میں ملزمان کی شناخت کے لئے پریڈ ہوتی ہے ، اصل ملزمان چند دوسرے افراد ، کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں ، گواہاں سے نشاندہی کرنے کو کہا جاتا ہے ، چونکہ یہ ملزمان اپنے چہروں میں خاصی تبدیلیاں کر کے پریڈ میں شامل ہوتے ہیں اس لئے گواہ ، اکثر انہیں شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں ، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف چہرے کی تبدیلی ایسی چیز ہے جو شناخت میں حارج ہو سکتی ہے لیکن اُردو کے حروف کسی ایک جگہ بھی اپنا چہرہ مسخ نہیں کرتے ۔ اصل چہرے کے ساتھ سامنے آتے ہیں خواہ انہیں لفظ کے شروع میں جگہ دی جائے یا وسط میں یا آخر میں ـــــ اوپر دیئے ہوئے الفاظ بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ کے ذریعے بھی اس دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے ۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ سارے حروف شکلیں بدلتے ہیں اُردو کے حروف تہجی میں

ا ، د ، ڈ ، ذ ، ر ، ڑ ، ز ، ژ ، ط ، ظ ، و

ایسے ہیں جو ہر صورت میں پورے کے پورے لکھے جاتے ہیں ، مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالیے ۔

(۱) اسیر ، تالاب ، نانا

(۲) دوڑو ، کدورت ، اولاد

(۳) ڈول ، کبڈی ، ٹھنڈ

(۴) ذکر ، تذکرہ ، کاغذ

(۵) رشید ، کرنال ، افکار

(۶) پیڑ ، گڑبڑ ، پہاڑ

(۷) زہرہ ، مزاہ ، مرکز

(۸) ژالہ ، مژدہ ، رپورتاژ

(۹) طلب ، مطلب ، بط

(۱۰) ظاہر ، مظہر ، لفظ

(۱۱) وحید ، توحید ، قابو

ہر گروہ کے لفظوں کے آغاز، وسط، اور آخر میں جو حروف آئے ہیں وہ اپنی پوری شکل کے ساتھ آئے ہیں اور اُستاد کی ذرا سی توجہ، بچوں سے اِن حروف کی شناخت کرا سکتی ہے، رہ گئے باقی حروف، اُن کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اصل چیز، حرف کا چہرہ ہے، یہ چہرہ اُردو میں ہمیشہ ظاہر کیا جاتا ہے، اس لئے حرف کی شناخت میں دِقّت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بعض حروف مثلاً

ب ، ن ، ک اور ع

جب کسی دوسرے حرف سے مل کر آتے ہیں تو ان میں معمولی سا تغیر ہوتا ہے مثلاً

بس ، بط

نس ، نص

کل ، کا

بغداد ، مغرب

اوپر "ب" اور "ن" کو "ں" کی شکل میں س اور ص وغیرہ سے ملایا گیا ہے لیکن نقطوں کے ذریعے بچے انہیں پہچان سکتے ہیں اس لئے کہ اُردو میں "ن" کے سوا کوئی حرف ایسا نہیں جس کے اوپر ایک نقطہ آتا ہو۔ یہی حال "ب" کا ہے۔ کسی دوسرے حرف کے نیچے ایک نقطہ نہیں آتا۔ "ب" اور "ن"

کے شکلوں کی یہ تبدیلی بھی صرف چند حروف کے ساتھ ہوتی ہے باقی جگہوں پر وہ اصل چہروں ہی کے ساتھ آتے ہیں۔ک اور گ ، صرف "ل" اور "ا" سے مل کر قدرے بدل جاتے ہیں لیکن "مرکز" کے ذریعے انہیں آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ رہ گئے ۔ع اور غ ، نستعلیق میں یقیناً ان میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ نسخ میں یہ بھی پورے چہرے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی معمولی تبد ایسی نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ اُردو رسم الخط کا سیکھنا سکھانا بہت مشکل ہے۔اس سے کہیں زیادہ مشکلیں انگریزی حروف سیکھنے میں پیش آتی ہیں۔

انگریزی میں سب سے پہلے بچے کو ، A سے لے کر Z تک بڑے حروف CAPITAL LATTER سکھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مصرف انگریزی میں صرف اتنا ہے کہ وہ کسی اسم خاص (PROPER NOUN) اور (SENTENCE) کے آغاز میں بالعموم استعمال ہوتے ہیں۔ دو چار مقامات پر اور اُن کا استعمال ہوتا ہے لیکن یہ مقامات اسم خاص اور جملہ آجاتے ہیں۔ بڑے حروف (CAPITAL LETTER) کے بعد، ان حروف سے بالکل مختلف شکل کے حروف e ، d ، c ، b ، a وغیرہ بنوائے جاتے ہیں، حروف کی شکلیں اصل میں یہاں بدلی ہیں، پہلے حروف سے ان کا ذرا بھی تعلق نہیں ہے، چنانچہ جتنا وقت پہلے حروف کے سکھانے میں صرف ہوگا اتنا ہی ان کے سکھانے میں لگے گا، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی، یہ حروف تو صرف لکھنے کے لئے سکھائے گئے ہیں۔ پڑھنے کے حروف ٹائپ میں ، مندرجہ بالا دونوں قسم کے حروف سے الگ ہوں گے ، گویا جب تک کوئی بچہ انگریزی کے چھبیس (۲۶) حروف کو تین طرح سے لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ وہ انگریزی حروف شناسی جاننے کا دعویٰ ہی نہیں کرسکتا۔

ذیل کے انگریزی حروف دیکھئے۔

A	،	a	،	a
B	،	b	،	b
D	،	d	،	d
E	،	e	،	e
F	،	f	،	f

G ، 𝒢 ، g ، g
H ، h ، h
I ، I ، i

یعنی انگریزی کے اکثر حروف کم از کم تین طرح اور بعض چار طرح سے لکھے جاتے ہیں، چنانچہ جب تک کوئی بچہ انگریزی کے چھبیس ۲۶ حروف کو تین طرح سے یعنی اٹھتر ۷۸ شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا نہ جانتا ہو وہ انگریزی لکھنے پڑھنے کے لائق ہی نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ اس مشکل ترین حرف شناسی کو آسان سمجھا جا رہا ہے اور اُردو کے آسان رسم الخط کو بغیر سوچے سمجھے مشکل ترین بتایا جا رہا ہے، یہ لاعلمی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ اُردو رسم الخط میں حروف کا چہرہ کبھی مسخ نہیں ہوتا، ان چہروں کے ذریعے بچے بہ آسانی اُنہیں پہچان لیتے ہیں۔ رہ گئیں معمولی قسم کی بعض دوسری تبدیلیاں، وہ ہر زبان کے رسم الخط میں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی رسم الخط میں حروف کی تبدیلیوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، اب ذرا ناگری (ہندی) رسم الخط کو لے لیجئے، یہ سہل ترین رسم الخط سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ ہندی سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُس میں بعض حروف اپنی کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے۔

कृष्ण (کرشنا)، आदर्श (آدرش)، सरकार (سرکار)، प्रकाश (پرکاش)

ان لفظوں میں ہندی کا حرف र (ر) چار خاص شکلوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر شکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی طرح ہندی میں ا کی آواز अ اور अ دو شکلوں سے ظاہر کی جاتی ہے اور دونوں میں سے کوئی ایک جہاں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں یعنی आदर्श (آدرش) کو आदर्श کی شکل میں بھی لکھنا درست ہوگا۔ یہی حال "جھ" کی آواز کا ہے झमझम (جھم جھم) کو झमझम کی شکل میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔

نونِ غنہ کی آواز بھی ہندی میں کئی شکلوں سے پیدا کی جاتی ہے، ان لفظوں کو دیکھئے۔

(چاند) चाँद (گنگا) गंगा (کرشنٹر) कृष्णा

ہر لفظ میں نون غنہ کی آواز الگ الگ شکلوں سے پیدا کی گئی ہے علاوہ ازیں جس طرح اُردو میں بعض حروف صرف اپنا چہرہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندی میں بھی حرف کا صرف ابتدائی حصّہ بنایا جاتا ہے جیسا کہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہے۔

कच्चा (کچّا)، लट्टू (لٹّو) कल्लन (کلّن)

सज्जन (سجّن)

یعنی اُردو میں جہاں تشدید کا استعمال ہوتا ہے، ہندی میں وہاں آدھا حرف لکھا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ہندی میں آدھا حرف اکثر لکھا جاتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے جیسے

कष्ट (کشٹ) गन्द (گند) व्याकुल (ویاکل)

आत्मा (آتما) शब्द (شبد) وغیرہ

اس لئے حروف کی شکلوں میں بعض تبدیلیوں کا سہارا لے کر اُردو رسم الخط کو ناقص بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اس قسم کی دشواریاں، دوسری زبانوں میں اُردو سے بھی زیادہ ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض اُردو رسم الخط پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس میں ہم صوت (ایک ہی قسم کی آواز والے) حروف، املا میں الجھن پیدا کرتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کو ث سے لکھا جائے اور کس لفظ کو س یا ص سے۔ بظاہر یہ اعتراض بھی درست ہے، اُردو میں چند حروف ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کی آواز رکھتے ہیں اور لکھتے وقت اُن میں امتیاز کرنا کچھ عرصے تک مشکل ہوتا ہے، یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ا، ع

(۲) ت، ط

(۳) ث، س، ص

(۴) ذ، ز، ژ، ظ، ض

(۵) ح، ہ

ان میں سے ہر گروہ کی نمائندگی کے لئے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا، صرف نو حروف یا اُن

کی آوازیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُردو رسم الخط میں دقّت پیدا کرتی ہیں، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اُردو ایک مخلوط اور بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے، اس میں جگہ جگہ کے اور بھانت بھانت کے الفاظ شامل ہیں، اس کا اصل رشتہ آریائی زبانوں سے ہے لیکن سامی خاندان خاص طور پر عربی کے بھی بکثرت الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں مختلف زبانوں سے الفاظ داخل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو میں مترادف الفاظ کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا ہے' دوسری زبانوں میں کسی ایک چیز کے لئے ایک یا دو سے زیادہ الفاظ نہ ملیں گے لیکن اُردو میں ایک ہی چیز کے لئے متعدد الفاظ موجود ہیں مثلاً "چاند" کا لفظ لے لیجئے اس کے لئے

چاند، چندا، چندرما، قمر، ماہ، ماہتاب، ہلال، بدر وغیرہ سبھی استعمال ہوتے ہیں۔

اسی طرح تارا کے لئے

"تارہ، ستارہ، سیارہ، اختر، انجم، نجم، نجوم وغیرہ کے الفاظ مستعمل ہیں، ظاہر ہے کہ جب الفاظ دوسری زبانوں سے آئیں گے تو وہ اپنی آوازیں بھی ساتھ لائیں گے، چنانچہ اُردو میں جو بعض آوازوں کے کئی کئی حروف ملتے ہیں وہ اُس کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو اپنے ذخیرۂ الفاظ کو اصل آوازوں کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر رہتی۔ کامل اور بہترین رسم الخط وہ کہلاتا ہے جو اُن ساری آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو کسی خاص زبان کے بولنے میں نکالنی پڑتی ہیں، اُردو رسم الخط کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اُردو میں بولی جانے والی تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' اس بات کو ایک مثال سے سمجھنا آسان ہوگا، انگریزی میں

چ، د، اور ش

کی آوازیں مستعمل ہیں، سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جن میں یہ آوازیں نکلتی ہیں مثلاً

(۱) CHAPTER، MATCH، PICTURE، FUTURE وغیرہ

(۲) THAT، THIS، THOSE وغیرہ

(۳) MOTION، SHE، ADMISSION

لیکن چ، د، اور ش کی آوازوں کے لئے کوئی حرف مقرر نہیں ہے، حالانکہ یہ آوازیں طرح طرح سے پیدا کی جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کسی رسم الخط کا کھلا ہوا نقص ہے، اُردو رسم الخط اس نقص سے پاک ہے، وہ ساری مستعمل آوازوں کے لئے مستقل حروف رکھتا ہے۔

اس خوبی کے نتیجے میں یہ ضرور ہوا کہ بعض آواز کے لئے کئی کئی حروف داخل ہو گئے، لیکن اُردو میں ہم صوت حروف زیادہ نہیں صرف تیرہ ہیں، ان تیرہ کو ہم نے اوپر پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے، ہر گروہ سے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ صرف نو حروف ایسے رہ جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ املا میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں لیکن اس قسم کا مغالطہ پیدا کرنیوالے حروف دوسری زبانوں میں اُردو سے بھی زیادہ ہیں، انگریزی زبان میں تو آوازوں کا کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ نشانات کچھ ہیں آوازیں کچھ نکلتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اس زبان کے املا —— (SPELLING) اور تلفظ (TION) پر قابو پانا سخت مشکل ہے جب تک ہر لفظ کے معنی کے ساتھ اُس کا املا اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہ ہو لکھنا مشکل ہوگا، یہی وجہ ہے کہ بچے کو شروع ہی سے لفظ کے معنی کے ساتھ ساتھ اسپیلنگ بھی رٹائی جاتی ہے جس شخص کو جتنے لفظوں کی اسپیلنگ یاد ہوگی، عام طور پر وہ اتنے ہی الفاظ لکھنے پر قادر ہوگا، تجربہ بتاتا ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ ہمارے استعمال میں آتے رہتے ہیں صرف اُنہیں کے اسپیلنگ ہمیں یاد رہتی ہے اور اُنہیں کو ہم آسانی سے لکھ سکتے ہیں۔ باقی الفاظ کے املا میں ہمیں بار بار ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے، انگریزی ڈکشنری میں ہر لفظ کے ساتھ اُن کا تلفظ (PRONUNCIA) اسی لئے تو لکھا جاتا ہے کہ لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں، اُن کے متعلق یہ معلوم کر لینا کہ وہ کس قسم کی آواز پیدا کریں گے بہت مشکل ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

۱۔ انگریزی میں "س" کی آواز کے لئے بظاہر S کا حرف استعمال ہونا چاہئے اور اکثر ہوتا ہے جیسا کہ SUN، SEE، SENSE وغیرہ میں لیکن RECEIPT اور (CENTRE) میں س کی آواز "C" سے پیدا کر لی گئی ہے۔

۲۔ "ش" کی آواز بظاہر SH سے پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ SHE، SHOE، CASH سے ظاہر ہے لیکن "ش" کی آواز اس کے علاوہ بھی متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھئے۔

(۱) ADMISSION (آڈمیشن)

(۲) TIUTION (ٹیوشن)

(۳) PATIENT (پیشینٹ)

(۴) OCEAN (اوشن)

(۵) SURE (شور)

(٦) MACHINE (مشین)

(۷) PRESURE (پریشر)

(۸) FASHION (فیشن)

(۹) SCHEDULE (شڈول)

جس بچے کو یہ بتایا گیا ہو کہ "ش" کی آواز "SH" سے پیدا ہوتی ہے وہ کس قیاس پر سمجھ لے گا کہ مندرجہ بالا لفظوں میں "ش" کی آواز کن کن حروف سے پیدا ہوگی چنانچہ جب تک اسپیلنگ رٹی ہوئی نہ ہو کسی بچے کے لئے ان الفاظ کا لکھنا محال ہے، اگر اس طرح کے ایک دو لفظ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی، ہزارہا الفاظ ہیں جن میں یہ دشواری پیدا ہوگی۔

(۳) "ک" کی آواز کے لئے K اور Q، حروف موجود ہیں اس کے باوجود، CAT، اور TACT میں ک کی آواز "C" سے ظاہر کی گئی ہے۔

(۴) "ز" کی نمائندگی کے لئے Z موجود تھا لیکن HAS اور PLEASE میں ز کی آواز S کی مدد سے پیدا کی گئی ہے۔

(۵) "ف" کی آواز صرف F سے نہیں بلکہ PH اور OUGH سے بھی ظاہر کی جاتی ہے جیسے PROPHET اور ROUGH میں۔

(٦) "ج" کی آواز کی نمائندگی G اور J دونوں حرف کرتے ہیں جیسے JUDGE اور GENERAL میں

(۷) "چ" کی آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے پھر بھی کبھی CH سے اور کبھی TURE سے اُسے ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً

MATCH اور PICTURE وغیرہ میں۔

اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو انگریزی رسم الخط کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں سب جانتے ہیں کہ انگریزی میں حروف سے آواز کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا اسی لئے کسی خاص لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں اُنہیں حافظے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے، حروف اور آوازوں کی ایسی بدنظمی شاید ہی کسی اور زبان میں پائی جاتی ہو، سینکڑوں الفاظ ہیں جن میں حروف لکھے جاتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے جیسے MATCH میں T اور KNIFE میں K ۔ یہ چیزیں عام طور پر ایسی الجھن پیدا کرتی ہیں کہ ہر لفظ کی اسپیلنگ پر قابو پائے بغیر انگریزی کے دو جملے بھی بچہ نہیں لکھ سکتا ۔ بایں ہمہ کسی طرف سے کبھی یہ آواز نہیں بلند کی گئی کہ انگریزی کا رسم الخط بہت مشکل ہے اور اس مشکل کے سبب اُس کی ترقی رکی ہوئی ہے ۔ پھر اُردو رسم الخط میں چند ہم صوت حروف کے لئے یہ واویلا کیوں ۔ صرف اس لئے کہ قومی اور علاقائی زبانوں کو صحیح مقام نہ دیا جا سکے اور مٹھی بھر مفاد پرست، انگریزی کے ذریعے اپنا اُلو سیدھا کرتے رہیں ۔

اوپر ہم صوت حروف کی دقتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے ۔ ذِقتیں کم و بیش دنیا کی زبان میں موجود ہیں بطور مثال ہندی کو لے لیجئے، اس میں بھی بعض آواز کے لئے کئی کئی نشانات سے کام لیا جاتا ہے ۔

(۱) ش کی آواز کے لئے ष اور श

(۲) نون غنہ کے لئے ञ ، ण ँ ं

(۳) ت کی آواز کے لئے त اور त्र

اسی طرح رہ کی آواز کے لئے متعدد نشانات ہیں ان کی مثالیں پچھلے صفحات میں کسی جگہ دی جا چکی ہیں، ان حقائق کی روشنی میں چند ہم صوت حروف کی بنیاد پر اُردو رسم الخط کو ناکارہ بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔

(۴) اُردو رسم الخط کی چوتھی کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ اُس میں اعراب کا تعین کرنا مشکل ہے کسی لفظ کا تلفظ کرتے وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس جگہ زبر پڑھا جائے اور کس جگہ زیر یا پیش متصور کیا جائے اس لئے کہ اُردو میں اعراب کے نشانات زبر، زیر، پیش بہت کم استعمال ہوتے ہیں یہ صحیح ہے کہ ایک خاص منزل تک بچوں کو اس سلسلے میں دقت ہوتی ہے ۔ لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد وہ اس پر قابو پا لیتے ہیں اس لئے کہ تلفظ کا تعلق لکھنے سے اتنا نہیں جتنا کہ بولنے سے ہے اگر بچے صحیح تلفظ کے

ساتھ اُردو بول لیتے ہیں تو اسی قیاس پر وہ اُردو لکھیں گے اور صحیح لکھیں گے۔ پڑھنے کی بھی یہی صورت ہے جن الفاظ کے تلفظ سے اُن کے کان آشنا ہیں، اُن الفاظ کو پڑھنے یا لکھنے میں وہ کوئی خاص اُلجھن محسوس نہ کریں گے۔

اُردو رسم الخط کا وصف یہ ہے کہ اُس میں حروف علت صرف تین ا ، و ، ی ، ہیں ، یہ بھی اعراب کا کام کرتے ہیں لیکن اِن سے زیادہ زیر ، زبر یا پیش کے معمولی نشانات بطور اعراب استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ اُردو تحریر جگہ بہت کم گھیرتی ہے، اُردو کے برعکس ہندی میں جگہ جگہ منترائیں اور پائیاں لگانے کے لئے بار بار ہاتھ اُٹھانا پڑتا ہے اور حروف جگہ بھی خاصی لیتے ہیں۔ جگہ زیادہ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ انگریزی میں کہنے کو تو A ، E ، I ، O ، U ، Y ، کو حروف علت کہا جاتا ہے اور اعراب کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن عملاً انگریزی تحریریں ان کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کوئی قیاس کام نہیں کرتا اور صحیح تلفظ تک پہونچنا مشکل ہوتا ہے، چند الفاظ بطور مثال دیکھیے۔

(۱) GOOD ، SHOOT

(۲) RED ، READ

(۳) UGLY ، UNITY ، SHUT ، PUT

(۴) PIN ، SIR

(۵) EARLY ، ESCAPE

(۶) EYE ، ICE

(۷) BY ، YES

ان الفاظ میں O ، E ، U ، I اور Y کی آوازوں پر غور کیجیے، نہ کوئی اصول ہے نہ تنظیم ، ایک ہی حرف کی ایک ہی آواز کہیں زبر کا کام دے رہی ہے، کہیں زیر کا اور کہیں پیش کا ، ایک ہی حرف کہیں کھینچ کر پڑھا جارہا ہے کہیں یونہی اور کہیں سرے سے خاموش ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ متعین کرنا آسان ہے صحیح نہ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ حروف کی آوازیں جس بے ربطی اور بے معنویت کے ساتھ انگریزی رسم الخط میں استعمال ہوتی ہیں، مشکل سے

کسی دوسری زبان میں نظر آئیں گی ، اُردو رسم الخط اس سے ہزار گنا بہتر ہے ۔ اس میں اعراب کی ایسی دشواریاں نہیں ہیں کہ لکھنا پڑھنا مشکل ہو ۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اُردو میں بعض حروف آواز نہیں دیتے پھر بھی لکھے جاتے ہیں ۔ جیسے "خواہش" کی "و" اور "عبدالرشید" میں ال ، ـــــ معترض کو جاننا چاہئے کہ اُردو میں اس قسم کے الفاظ کی تعداد کثیر نہیں ہے تھوڑے سے الفاظ ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں ، حروف تو صرف دو یا تین ہیں ، جہاں تک " ال " کے آواز دینے اور نہ دینے کا تعلق ہے اُس کے متعلق اگر حروف شمسی اور حروف قمری کی تقسیم چند مثالوں کے ذریعے بچوں کے ذہن نشین کرادی جائے تو پھر یہ دِقّت خود بخود دُور ہو جائے گی ، بات یہ ہے ال کا استعمال صرف عربی ترکیب میں ہوتا ہے اور عربی ہی کے اصول کے مطابق وہ بولے اور پڑھے جاتے ہیں ، لیکن انگریزی میں تو آواز نہ دینے والے (SILENT) حروف بے شمار لفظوں میں آتے ہیں اور ایک نہیں کئی کئی آتے ہیں جیسے COMMITTEE اور HIGH میں — بایں ہمہ اس میں دشواری محسوس نہیں کی جاتی ، پھر محض چند الفاظ کی بناء پر اُردو رسم الخط کو موردِ الزام کیوں گردانا جائے ۔

(۶) چھٹا اعتراض یہ ہے کہ اُردو میں ٹائپ اور طباعت کی مشکلات نے زبان کی ترقی کا راستہ روک رکھا ہے ، یہ اعتراض اپنی جگہ وزن رکھتا ہے لیکن لسانی بحثوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ مشکلات اُردو رسم الخط نے نہیں بلکہ ملک کے سیاسی و معاشی حالات اور صنعتی و مشینی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں ، اس لئے ہم اس موضوع پر یہاں کے بجائے اگلے صفحات میں علیحدہ بحث کریں گے ۔

اُردو رسم الخط کے اصلاح کی بعض تجویزیں اور اُن کا جائزہ

پچھلے صفحات میں رسم الخط اور زبان کے تعلق کے ساتھ اُردو رسم الخط کی جامعیت و خصوصیات کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے، یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اُردو کو اُس کے اپنے رسم الخط کے سوا اگر کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے یا موجودہ رسم الخط میں غیر ضروری تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے وجود کو من وعن قائم نہ رکھ سکے گی اور اُس کا سرمایہ تباہ ہو جائے گا۔ پھر بھی بعض لوگوں کی طرف سے اصلاح و تبدیلی کی تجویزیں پیش کی جاتی ہیں آیئے دیکھیں یہ تجویزیں کیا ہیں اور اُنہیں قبول کر لینے سے اُردو کو کیا نفع یا نقصان پہونچے گا۔

۱۔ اُردو کے ہم صوت حروف اور املا کی دشواریاں

اُردو رسم الخط کے سلسلے میں ایک اصلاحی تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس میں لکھنے کے عمل کو صوتی بنیادوں پر قائم کیا جائے یعنی کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انہیں کا لحاظ رکھ کر اُس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے مثال میں وہ یہ کہتے ہیں کہ

(۱) ہُما اور شمع میں ا اور ع کی آوازیں

(۲) تالاب اور طالب میں ت اور ط کی آوازیں

(۳) سالم، ثابت اور صادق میں ث، س اور ص کی آوازیں

(۴) حاسں اور ہاتھی میں ح اور ہ کی آوازیں

(۵) ذاکر، زائر، ظاہر، ضامن میں ذ، ز، ض اور ظ کی آوازیں

ایک سی ہیں۔ عربی والوں کے نزدیک ان آوازوں میں فرق ہو تو ہو، اُردو والے ان آوازوں

میں کوئی فرق نہیں کرتے، ایک ہی طرح بولتے ہیں، اس لئے ان آوازوں کی ترجمانی کے لئے ہر گروہ سے صرف ایک ایک حرف کو لے لینا چاہئے یعنی اُن کی تجویز یہ ہے کہ

(۱) ا ، ع

(۲) ت ، ط

(۳) س ، ث ، ص

(۴) ز ، ذ ، ظ ، ض

(۵) ہ ، ح

میں سے صرف ا ، ت ، س ، ز اور ہ کو لے لیا جائے باقی آٹھ حروف یعنی ع ، ط ، ث ، ص ، ذ ، ظ ، ض اور ح کو اُردو رسم الخط سے خارج کر دیا جائے۔ اُن کے نزدیک اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اُردو املا کی وہ دقتیں ختم ہو جائیں گی جو آوازوں کی کثرت کے سبب محسوس ہوتی ہیں اور اُردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ یہ تجویز بہت معقول ہے اور اگر واقعی اس سے اُردو کو فائدہ پہونچ سکتا ہے تو اُسے قبول کر لینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔

اُوپر جن حروف کو حروف تہجی سے خارج کر دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ تعداد میں صرف آٹھ ہیں، گویا ان آٹھ آوازوں میں التباس کے سبب اُردو املا میں دشواری ہوتی ہے، حالانکہ پچھلی سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ آوازوں کا سب سے خراب نظام انگریزی میں ہے اور جب تک ہر لفظ کے ہجے (SPELLING) پوری طرح رٹی ہوئی نہ ہو کوئی شخص انگریزی لکھ ہی نہیں سکتا اس کے باوجود انگریزی برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور کسی ایک فرد نے کبھی یہ آواز نہیں اُٹھائی کہ انگریزی کے رسم الخط کو بدل دینا چاہئے۔ لیکن بعض حضرات اُردو کے مندرجہ بالا آٹھ حروف یا اُن کی آوازوں سے بڑی اُلجھن محسوس کرتے ہیں اور ان آوازوں کو اُردو رسم الخط سے خارج کر دینے کی سفارش کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اور اُس نے کم و بیش دنیا کی ہر زبان سے فائدہ اُٹھایا ہے اُس پر ہندی، فارسی اور عربی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ اثر اُس کے رسم الخط پر بھی صاف نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی قومی زبان صرف اس غرض سے نہیں پڑھائی جاتی کہ اُس قوم کے بچے اس میں معمولی

شدھ بدھ پیدا کرکے دال روٹی کما کھا سکیں، یقیناً یہ بھی ایک مقصد ہے لیکن جیسا کہ اس سے پہلے بھی اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے، قومی زبان کی تدریس کا ایک اعلیٰ مقصد ہے اور وہ یہ کہ جو بچے آج پڑھ رہے ہیں اُنہیں میں سے کوئی آگے چل کر اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر، انجینیر، ماہر قانون، ریاضی دان، سائنسدان، عالم ادب، عالم زباں، ماہر لسانیات، محقق اور نقاد بن سکے۔ ان میں کئی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے لئے اسے اردو کا عائر مطالعہ کرنا ہوگا، اُس کے حروف، اس کے نظام صوتیات اور اُس کے ذخیرہ الفاظ سب کا حقیقی جائزہ لینا پڑے گا اس کام کے لئے اُردو کا موجودہ رسم الخط ہی مفید مطلب ہوگا، یہ مانا کہ اُردو میں

ع، ط، ث، ص، ذ، ظ، ض اور ح

کی آوازیں (جنہیں خارج کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے) شروع میں بعض الفاظ کے املا میں، طلبہ کے لئے اُلجھن کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر بچوں کو ابتدائی اور ثانوی منزل ہی میں یہ بات بتا دی جائے کہ یہ حروف خاص عربی کے ہیں اور اُردو میں استعمال ہونے والے الفاظ میں سے کسی میں بھی ان میں سے کوئی حرف نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے اس سے آگے چل کر زباندانی اور اُردو کے لسانی مطالعے میں اُنہیں خاصی مدد مل جائے گی۔ اور الفاظ کی شناخت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی تک پہونچنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوگی۔

عربی کے ہر لفظ میں تین حرف بنیادی ہوتے ہیں، ان حرفوں کو اس لفظ کا مادہ کہتے ہیں، جس مادّے سے کوئی لفظ بنتا ہے اس کا اس مادے سے تعلق بہرحال باقی رہتا ہے مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے۔

(۱) علم، معلم، تعلیم، تعلّم، معلمہ، معلوم، عالم، علیم، متعلم، علّام، علّامہ، علوم

(۲) عقل، عقیل، معقول، تعقل، عقیلہ، عاقل، عاقلہ، عقلیت،

ان میں "ع" کی شمولیت سے بچے یہ سمجھ جائیں گے کہ یہ الفاظ اصلاً عربی کے ہیں۔ پہلے گروہ کے الفاظ میں "ع ل م" اور دوسرے گروہ کے الفاظ میں ع، ق، ل بنیادی حروف ہیں۔ چنانچہ اگر کسی طالب علم کو "علم" اور "عقل" کے معنی بتا دیئے جائیں یا اُسے ان دو لفظوں کے معنے پہلے سے معلوم ہوں تو پھر وہ باقی الفاظ کے معنی تک خود بخود پہونچ جائے گا، گویا ایک لفظ کے ذریعے وہ اس لفظ سے بنے ہوئے درجنوں الفاظ کی تفہیم پر قابو پالے گا۔ اس سے زباندانی میں بچوں کو جو مدد ملے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اُن کے ذخیرۂ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہوگا

اُن میں خود اعتمادی پیدا ہوگی، وقت کم لگے گا، اور معلم یا لغت سے مدد لیئے بغیر بھی طلبا اس قسم کے نفظوں کے معنیٰ تک پہونچ جائیں گے، جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ع کو خارج کر کے "ع" والے الفاظ بھی ا سے لکھے جائیں وہ اس تبدیلی سے پیدا ہونے والی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اگر "علم" اور "عقل" کو ا سے لکھیں تو "الم" اور "اقل" ہو جائیں گے، الم اور اقل، کے لفظ خود عربی کے ہیں اور اُردو میں مستعمل ہیں مثلاً "رنج والم" اور "ذو اضعاف اقل" میں۔ اسی طرح علیم اور عقلیت کو "ا" سے لکھا جائے تو ان کی صورت "الیم" اور "اقلیت" کی ہو جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی اُردو میں مستعمل ہیں، اندازہ کیجئے کہ اس سے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ا اور ع کے استعمال سے تو آدمی اُن کے معنی میں فرق کر لیتا ہے لیکن جب یہ فرق مٹ جائے گا تو جگہ جگہ معنی کی تفہیم میں الجھن پیدا ہوگی۔ اگر دو چار الفاظ کا مسئلہ ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ کچھ دنوں بعد، بچے معنی کے تعلق سے ان پر قابو پالیں گے۔ لیکن اُردو میں ہم صوت یا مشابہ الصوت الفاظ کثرت سے ہیں اور املا کا فرق ختم ہو جانے سے اُن کے معنی متاثر ہوں گے یعنی جب

اسل وعمل، تعمل وتامل، امارت وعمارت، توسل وتوصل، سدا وصدا، سفر وصفر، ماثوم ومعصوم، ثواب وصواب، نذیر ونظیر، ظرف وذرف، ظن وزن، کسرت وکثرت، عام اور آم، لعل اور لال، سریر اور صریر، نال اور نعل، جعل اور جال، باد اور بعد، باز اور بعض، عرض اور ارض، حال اور ہال، حل اور ہل، جالی اور جعلی، صورت اور سورت، مامور اور معمور، تانا اور طعنہ، ذکی اور زکی ــــ

وغیرہ کے املوں میں یکسانگی پیدا ہو جائے گی تو صرف یہی نہیں کہ اُن کے ماخذ کا پتہ لگانا مشکل ہوگا بلکہ ان کے معنی تک پہونچنے میں بھی دقت ہوگی۔

بالفرض اس تجویز کو قبول بھی کر لیا جائے تو اُردو جس بلند منزل پر پہونچ گئی ہے اس میں یہ تبدیلی خوشگوار ثابت نہ ہوگی، اس وقت کروروں آدمی ہیں جو صرف اِملا دیکھ کر لفظوں کی قرأت روانی اور تیزی سے کر لیتے ہیں یعنی اُن کی نظریں الفاظ کو خاص خاص املوں میں دیکھنے کی عادی ہو چکی لیکن جب

حضرت کو ہزرت

صاحب کو ساہب
حفیظ کو ہفیز
طرح کو ترہ
عرض کو ارز

وغیرہ کی صورت میں دیکھیں گے تو انہیں ایک طرح کی الجھن ہوگی اور وہ پوری روانی کے ساتھ عبارت کو نہ پڑھ سکیں گے۔ جو لوگ خارج شدہ حروف کی شکلوں سے یکسر ناواقف ہوں گے، وہ شاید اس کی مشق بہم پہونچا لیں لیکن عربی اور قرآن سے جو رشتہ اُستوار ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں جس وقت اُردو حروف تہجی سے مندرجہ بالا آٹھ آوازیں خارج کر دی جائیں گی۔ اور لفظ کے تلفظ یا آواز دینے والی حروف و حرکت ہی کی بنیاد پر اُس کا املا لکھا جائے گا۔ تو اُردو کے ہزاروں الفاظ کی ظاہری صورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔

(۱) فی الحال کو فلحال۔ فی الواقع کو فلواقع اور فی الوقت کو فلوقت لکھا جائے گا۔

(۲) عبدالرشید، خواہش اور صلواۃ کو عبدرّشید، خاہش اور سلات لکھا جائے گا۔

(۳) سمیع، بجیح اور قیع وغیرہ آوزمی، بجی، وقی ہو جائیں گے۔

(۴) رکعت، وقعت، بدعت وغیرہ کا لکھنا مشکل ہو جائے گا اور اگر لکھا گیا وہ رکات وقات اور بدات ہو جائیں اس لئے کہ ع، کی جگہ الف استعمال ہوگا۔

(۵) قاعدہ، شاعرہ، اور معمر وغیرہ کو قاادہ، شاارہ، اور مامر لکھا جائے گا۔

(۶) فوراً، ابتداً، رسماً وغیرہ کا املا فورن، ابتداان اور رسمن ہو جائے گا۔

(۷) عربی کے مروجہ الفاظ شریفؒ، مجیدؒ وغیرہ کو شریفن، مجیدن لکھا جائے گا۔

(۸) علیٰی، توسیع، اسمٰعیل وغیرہ ایسا، توسی اور اسماایل میں بدل جائیں گے۔

غرضکہ لاکھوں الفاظ کا املا بدل جائے گا اور اُردو زبان و ادب کا چار سو سالہ ذخیرہ خاک میں مل جائے گا، نہ کوئی اس کا پڑھنے والا ہوگا نہ سمجھنے والا، سارے کتب خانوں اور علمی و ادبی ذخیروں کو دریا برد کر کے ایک نئی زبان کے لئے کام شروع کرنا ہوگا۔ ہم بتا چکے ہیں زبان اور رسم الخط کی ترقی و تبدیلی عام طور پر، زندگی کے تقاضوں کے مطابق خود بخود ہوتی رہتی

کسی شخص یا گروہ کی شعوری کوشش اُس پہ بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، بفرضِ محال ایسی کوشش کی بھی جائے تو

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

آج کا اہمی دور بھلا اس کی اجازت کہاں دے گا؟ زبان اور رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمارا سارا ثقافتی وتہذیبی سرمایہ خود اپنے ہاتھوں خاک میں مل جائے گا۔ تجربہ کرنا ہو تو کسی علمی ادبی کتاب کا ایک پیراگراف لے لیجئے اور اُسے نئے املا کے مطابق لکھ کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کیجئے، وہ پیراگراف آپ کی نظروں کے لئے اتنا اجنبی ہوگا کہ پڑھنا مشکل ہو جائے گا ——— ایسی صورت میں اُردو رسم الخط کو، اُس کی معمولی دقتوں کی وجہ سے بدلنا اور اُردو کی لاکھوں علمی و ادبی کتابوں کو، نئی نسل کے لئے مہمل بنانا کہاں کی دانشمندی ہوگی ۔

۲۔ کیا اُردو کے لئے رومن رسم الخط مناسب ہوگا؟

اُردو رسم الخط کی اصلاح کے سلسلے میں دوسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ رسم الخط کو رومن رسم الخط سے بدل دیا جائے، مطلب یہ ہے کہ اُردو زبان وہی رہے جو ہم لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن اُسے ا، ب، پ، ت وغیرہ کے بجائے D ، C ، B ، A وغیرہ کے حرفوں میں لکھا جائے، یہ تجویز یوں تو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کی گئی تھی لیکن حکومت کے اشارے پہ پوری شدت سے ۱۹۵۶ء میں تعلیمی کمیشن کے سوال نامے کے ساتھ سامنے آئی اور اخبارات و رسائل کے ذریعے اس کے متعلق دوسروں کی رائیں طلب کی گئیں، کراچی کے اخبار جنگ نے اس مسئلے پہ رائے شماری کا سلسلہ شروع کیا اور نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا یعنی چند ایک کے سوا عام وخاص سب نے اُردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی تجویز کو رد کر دیا۔ اس کے باوجود رومن رسم الخط کی تائید میں، بعض لوگ اپنی انفرادی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں اس لئے بے جا نہ ہوگا اگر اس تجویز کا از سرِ نو اس جگہ مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

رومن رسم الخط کی تائید میں جو باتیں اُردو کے حق میں کہی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر رومن کو اپنا لیا گیا تو اُردو املا آسان ہو جائے گا۔ بین الاقوامی اتحاد میں اس سے مدد ملے گی ۔ علمی و ادبی ذخیرے میں

اضافہ ہوگا اور اُردو تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر کے دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہونے لگے گی ،
یہ باتیں جتنی آسانی سے کہدی گئی ہیں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں ہیں ، ہم پچھلی سطوروں میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ زبان اور رسم الخط میں جسم و جان کا تعلق ہوتا ہے وہ ساتھ ساتھ جی سکتے ہیں اس لئے اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا اُن کے ساتھ کھلی دشمنی ہوگی ، ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اُردو میں حروف کی تعداد پچاس سے زیادہ اور رومن میں صرف چھبیس ۲۶ ہے ظاہر ہے کہ چھبیس آوازیں کسی طرح بھی پچاس آوازوں کی نمائندگی نہیں کر سکتیں ، مثلاً

چ اور ش کی آواز کے لئے رومن میں کوئی حرف نہیں ہے ۔ حالانکہ یہ آوازیں ADM ISSION اور PICTURE وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ میں پائی جاتی ہیں ، لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کن کن حروف سے یہ آوازیں پیدا ہوں گی ۔

CHRISTIAN MATCH MIXTURE

میں ، چ کی آواز الگ الگ طریقوں سے پیدا کی گئی ہے ۔ ش کی آواز آٹھ دس طریقوں سے پیدا کیجاتی ہے یہی حال دوسری آوازوں کا ہے ، اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس رسم الخط میں اُردو کا لکھنا کتنا مشکل ہوگا ؟ سب جانتے ہیں کہ رومن میں حروف کی آوازوں اور الفاظ کے تلفظ کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے ہر لفظ کی اسپلنگ ازبر کرنی پڑتی ہے ۔ ایسی صورت میں اُردو کو رومن میں لکھ کر اس کے اصل تلفظ اور لہجے کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا ۔ سینکڑوں الفاظ کا تلفظ مسخ ہوگا ۔ علاوہ ازیں اُردو میں عربی اور ہندی کی بہت سی آوازیں شامل ہیں ، ان آوازوں کی علامتوں کے ذریعے ہم پہچان لیتے ہیں کہ کون لفظ کس زبان سے آیا ہے مثلاً ڑ ، بھ ، پھ ، کھ وغیرہ اور ع ، ث ، ص وغیرہ کو لے لیجئے جن لفظوں میں یہ آوازیں اور ان کے نمائندہ حروف آئیں گے وہ علی الترتیب ہندی اور عربی کے ہوں گے ۔ رومن میں ان کی آوازیں کہاں سے لائی جائیں گی ؟ اور بالفرض اگر انہیں ظاہر بھی کیا جائے تو وہ علامتیں کہاں ہونگی ۔ جن کے ذریعہ اُن کے لسانی رشتے کی شناخت کر لی جاتی ہے ، غرض کہ اُردو کو رومن رسم الخط میں اوّل تو لکھا ہی نہیں جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے تو اس سے فائدہ کے بجائے سخت نقصان پہونچے گا ۔

اسی لئے اُردو کے پارکھوں اور زبان کے عالموں نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور

بار بار سوچا ہے، تائید و تردید کی دلیلوں کو نظر میں رکھا ہے، سو دو زبانوں کے تناسب کا اندازہ کیا ہے اور آخر کار پُر زور طریقے سے رومن رسم الخط کی مخالفت کی ہے ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) رومن رسم الخط میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اُس میں اُردو زبان کی ساری آوازیں ادا کی جا سکیں۔

(۲) رومن میں تلفظ اور ہجے کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ اُس کے ذریعے اُردو لکھنا پڑھنا آسان ہونے کے بجائے اور مشکل ہو جائے گا۔

(۳) رومن رسم الخط، اُردو کے مقابلے میں زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ چنانچہ اس سے کتاب کا حجم خواہ مخواہ بڑھے گا اور لاگت زیادہ آئے گی۔

(۴) اُردو رسم الخط کا فارسی اور عربی سے گہرا رشتہ ہے، رومن کو اپنانے سے یہ رشتہ ختم ہو جائے گا اور ہمارے ثقافتی و تہذیبی مشترک سرمایہ کو نقصان پہونچے گا، عربی زبان سے ہم دور ہو جائیں گے اور اُس کے سیکھنے میں ہمیں بڑی دقت ہو گی۔

(۵) ہمارے اسلاف نے تحریری شکل میں جو کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ اُن سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ہم اپنی جڑوں کو کاٹ کر من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں گے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کے تحت آل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس منعقدہ کراچی ۲۶ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء میں متفقہ طور پر رومن رسم الخط کی تجویز رد کی گئی تھی اور اُسے اُردو زبان کے وجود کے لئے خطرہ بتایا گیا تھا، واقعہ بھی یہی ہے رومن رسم الخط اپنے ناقص صوتیات کے سبب اُردو الفاظ کے تلفظ کی ضمانت و کفالت نہیں کر سکتا ہر لفظ اس طرح مسخ ہو گا کہ اُس کا صحیح پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ اُردو کیا خود انگریزی الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط کی پیچیدگی کے سبب صحت کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا، نتیجہ یہ ہے کہ ہر مستند لغت میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے برنارڈ شاہ نے رومن رسم الخط کی اس خرابی کے سبب اس میں اصلاح کی تجویز پیش کی تھی، اُنہوں نے سات سو الفاظ تیار کر کے ماہرین انگریزی کو دیئے تھے اور کہا تھا کہ اسی نہج پر انگریزی رسم الخط کی از سر نو تشکیل کی جائے اور جن آوازوں کے لئے رومن میں حروف موجود نہیں ہیں اُن کے لئے حروف ایجاد کئے جائیں۔ چنانچہ ماہرینِ زبان کی ایک جماعت نے برنارڈ شاہ کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کر کے اُسے قبول بھی کر لیا تھا لیکن جیسا

کہ ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں کہ کسی زبان کا رسم الخط خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو، اُسے بدلنا یا اُس میں ایسی تبدیلیاں لانا، جس سے ماضی کے علمی و ادبی سرمایہ کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہو، بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ رومن رسم الخط اپنی ہزار خرابیوں کے باوجود اپنی پرانی ڈگر ہی پر قائم ہے

ان مباحث کی روشنی میں جو لوگ رومن رسم الخط کو اُردو کے لئے تجویز کر رہے ہیں وہ بالغ نظری کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔ اُن کی نظر میں اس تبدیلی کے وہ مضر نتائج نہیں ہیں جن کا اوپر مفصل ذکر کیا گیا ہے اور اگر ان نتائج سے باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ رومن رسم الخط کی تائید کر رہے ہیں تو یہی کہنا پڑیگا کہ وہ اُردو کے دوست نہیں چھپے ہوئے دشمن ہیں ان میں انگریزی زبان اور انگریزی ثقافت سے برسوں کی غلامی کی نتیجے میں، ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو بے وقعت اور مغرب کی ہر چیز کو قابل تقلید جانتے ہیں ——

۔ٹائپ وطباعت کے بعض مسائل اور خط نسخ و نستعلیق

اُردو رسم الخط کے سلسلے میں یہ بات بھی اکثر زیر بحث رہتی ہے کہ نستعلیق کو اپنایا جائے یا نسخ کو —— اب تک صورت یہ رہی ہے کہ نستعلیق اور نسخ، دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں، کبھی نسخ سے کام لیا گیا ہے کبھی نستعلیق سے، لیکن بہ حیثیت مجموعی زیادہ توجہ نستعلیق پر رہی ہے اور کتابوں کی طباعت عموماً نستعلیق ہی میں ہوتی رہی ہے۔ نظام تعلیم میں بھی کسی خط کو مستقلاً نہیں اپنایا گیا کبھی نسخ خط کا انتخاب کیا گیا کبھی نستعلیق کو کبھی ساری نصابی کتابیں نسخ میں چھاپ دی گئیں اور کبھی نستعلیق میں —— کبھی یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نصاب کی آدھی کتاب نستعلیق خط میں چھاپی گئی اور آدھی نسخ میں۔ طلبہ نہ اُس پر پوری طرح قابو پا سکے نہ اس پر اور طباعت کا کام نہ اس کے ذریعے فروغ پا سکا نہ اس کے ذریعے۔ یہ باتیں اُردو کی ترقی میں حائل رہیں اور آج بھی وہ اُردو کتابوں کی اشاعت وطباعت کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔

نسخ اور نستعلیق میں سے کس خط کو اپنانا چاہئے اور کیوں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خطوں کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں معلوم کر لی جائیں۔

خط نسخ، سامی زبانوں بخاص طور پر عربی رسم الخط کی وہ ترقی یافتہ صورت ہے جس کی ایجاد

کا سہرا ابن مقلہ کے سر ہے۔ ابن مقلہ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ خلیفۃ القاہر باللہ عباسی کا وزیر رہا اور ۳۱۰ھ کے قریب اس نے جدید خط کوفی اور معقلی کے امتزاج سے ایک نیا خط نسخ کے نام سے رائج کیا۔ عہد وزارت میں اُس نے خلیفۂ وقت کے خلاف سازش کی، گرفتار کیا گیا اور اس کا دایاں ہاتھ اور زبان کاٹ دی گئی۔ تقریباً ۵۶ سال کی عمر میں ۳۲۸ھ میں انتقال کیا۔ ابن مقلہ کا کمال یہ تھا کہ جب دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ کہنی میں کھپچی باندھ کر لکھتا تھا۔ اور لاجواب لکھتا تھا، اس نے ایک روشنائی بھی ایجاد کی تھی اور اس سے اس کا خط مزید روشن ہو جاتا تھا۔

خط نسخ کو مزید سنوارنے بنانے کا کام ابن بواب اور یاقوت نامی خطاطوں نے کیا، ابن بواب نسخ کا مشہور ترین خطاط تھا۔ وہ ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً ۸۰ سال بعد پیدا ہوا اور خطاطی میں نام روشن کرکے ۱۳ ۴ھ مطابق ۱۰۳۱ء کے لگ بھگ بغداد میں وفات پائی۔ ابن بواب کے بعد یاقوت کے نام کے تین خطاطوں نے نسخ میں نام پایا اور آخری یاقوت متوفی ۱۲۹۹ء مطابق ۶۹۸ھ نے خط نسخ کو حد کمال تک پہونچا دیا۔

"خط نسخ" ترچھے حروف میں لکھا جاتا ہے، نسخ کا ہر دائرہ شروع سے آخر تک یکساں ہوتا ہے اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری پائی جاتی ہے یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے اپنا نچلا حصہ چپٹا رکھتے ہیں جنکی وجہ سے اُن میں زاویئے پیدا ہو جاتے ہیں یہ خط ٹائپ کے لئے نہایت موزوں ہے چونکہ قرآن بھی اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اس لئے اسے قرآنی رسم الخط بھی کہتے ہیں عربی اور فارسی میں اسی خط کو اپنا لیا گیا ہے۔ نتیجتہً ٹائپ اور طباعت کی مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے اور نسخ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

"نستعلیق" کا لفظ "نسخ" اور "تعلیق" سے مرکب ہے، کہا جاتا ہے کہ امیر علی تبریزی نے ان دونوں خطوں کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد کیا "نسخ" کا "خ" ثقالت کے سبب غائب ہو گیا اور اس نئے خط کا نام "نستعلیق" پڑ گیا، نستعلیق ایرانیوں کی ایجاد ہے اور ان کی لطافت طبع و خوش ذوقی پر دلالت کرتا ہے اس میں مصورانہ شان اور نقاشی کا بانکپن ہے، اس کے حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک ہوتا ہے، دائرے خوشنما اور گول ہوتے ہیں، صحت تلفظ کے لئے اعراب (زبر، زیر، پیش) کا استعمال ان کے حسن کو کچھ اور بڑھا دیتا ہے۔ لیکن اردو والے دونوں خطوں سے شناسا ہیں اور دونوں کو لکھنا پڑھنا اُن کے لئے کچھ ایسا مشکل نہیں ہے لیکن ٹائپ اور طباعت کے لئے نستعلیق

اتنا کارآمد نہیں جتنا کہ نسخ ہے۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، نستعلیق حروف، ٹائپ کی کلید (KEYBOARD) کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ وہ طباعت واشاعت کے سلسلے کی جدید مشینی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے اُس میں دائرے، شوشے، کرسی اور نشست قائم رکھنے کے لئے ٹائپ کے اتنے جوڑوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ کمپوزنگ میں ہاتھ آسانی اور تیزی سے نہیں چلتا۔ ٹائپ میں بھی یہی دقت ہے دوسری خرابی یہ ہے کہ نستعلیق کے خوبصورت شوشے اور دائرے مشین میں جلد ٹوٹ جاتے ہیں اگر انہیں مضبوط بنانے کے لئے عام سیسے کی جگہ کوئی اور مضبوط دھات استعمال کریں تو خرچ زیادہ ہوگا اور کاروبار کے نقطۂ نظر سے مفید و مقبول نہ ہوگا۔ نستعلیق اس وقت تک ٹھیک تھا جب تک لیتھو یعنی پتھر کی چھپائی کا رواج تھا اور کاتب عبارت کو ہاتھ سے لکھتا تھا۔ مشینی دور میں لیتھو کی چھپائی عام طباعت کے لئے اختیار نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو اس میں دیر لگتی ہے دوسرے بڑی تعداد میں طباعت نہیں ہو سکتی، حروف اُڑنے لگتے ہیں، موسم کا اثر پڑتا ہے۔ مختلف کاتبوں کی وجہ سے یکسانیت نہیں رہتی۔ غلطیوں کی اصلاح میں دقت ہوتی ہے۔"

اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خط نستعلیق، دورِ حاضر کی مشینی طباعت کا ساتھ پوری طرح نہیں دے سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ نستعلیق حروف کے ٹائپ اب سے بہت پہلے حیدرآباد میں تیار کئے گئے تھے اور طباعت کا کام بھی لیا گیا تھا لیکن آخر اس کی مشکلات محسوس ہونے لگیں اور آج کے برق رفتار زمانے کے لئے ناکام قرار پایا، ایسی صورت میں نسخ ہی کو اپنانے سے اُردو کی ترقی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں، نستعلیق کی دیدہ زیبی کا سب کو اعتراف ہے لیکن محض آرائش سے کام نہیں چل سکتا خط کے افادی پہلو کو بھی پوری طرح نظر میں رکھنا ہوگا۔

"خط نسخ" اُردو داں طبقہ کے لئے اجنبی نہیں ہے، ہزاروں کتابیں خط نسخ میں پہلے بھی چھاپی گئی ہیں اور آج بھی چھاپی جا رہی ہیں۔ خاص طور پر عربی و فارسی نے نسخ کو اپنا کر طباعت و ٹائپ کے کام کو جس قدر آسان اور تیز تر بنا لیا ہے، وہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے چنانچہ مزید وقت ضائع کئے بغیر اُردو کے لئے نسخ کو اپنا لینا مناسب ہوگا۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے خط نسخ ہمارے لئے نیا نہیں ہے، قرآن کے توسط سے چھوٹے بڑے سبھی اس سے آشنا ہیں، عربی و فارسی ہی میں نہیں

خود اُردو میں نسخ کے نہایت کامیاب تجربے کئے جا چکے ہیں ۔ سرسید تحریک کا آرگن "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ" نسخ ٹائپ میں شائع ہوتا تھا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد، نسخ ٹائپ ہی میں نکلتا تھا ۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو خط نسخ کی تائید میں جاتی ہیں ۔ چنانچہ اگر ہمیں اُردو کو واقعی ترقی دینا ہے تو مزید بحثوں میں پڑنے کے بجائے متفقہ طور پر اُردو کی طباعت و اشاعت کے لئے نسخ ٹائپ کو اپنا لینا چاہئے ۔

لیکن محض نسخ کو اپنا لینے سے اُردو ٹائپ اور طباعت کی اصل دقتیں دُور نہیں ہو سکتیں ، اُردو ٹائپ رائٹر چونکہ کم بنتے ہیں اور کم بکتے ہیں اس لئے گراں ملتے ہیں اُن پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے یہی صورت طباعت کی ہے ۔ نتیجتہً اُردو کتابوں کی طباعت و اشاعت اُس تیز رفتاری کے ساتھ ممکن نہیں جو انگریزی ، یا فارسی و عربی کو میسر ہے ۔ اس سلسلے میں نسخ کو اپنا کے ساتھ ضرورت اس بات کی ہوگی ، کہ ٹائپ رائیٹر بنانے والوں کے ساتھ حکومت ترجیحی سلوک کرے یعنی اُنہیں ہر طرح کی سہولت بہم پہونچائے اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرے ۔ ٹائپ نویسوں کی تعلیم و تربیت کے لئے انسٹی ٹیوٹ کھولے جائیں اور ٹائپ نویسی کو پبلک کے لئے ارزاں بنایا جائے ۔ لیکن ان اقدامات سے بھی پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری و نیم سرکاری اداروں ، عدالتوں ، دفتروں اور کاروباری حلقوں میں اُردو ٹائپ کو مروج کرنے اور انگریزی کی جگہ قومی زبان اُردو کو اپنانے کے احکامات جاری کئے جائیں ساری خط و کتابت اُردو میں کی جائے ہر قسم کی ملازمتوں کے امتحانات میں اُردو کو ذریعہ جوابات بنایا جائے ، زبانی اور تحریری دونوں قسم کے امتحانوں میں اُردو کو انگریزی پر ترجیح دی جائے جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اُردو حقیقی ترقی سے محروم رہے گی ، نہ ٹائپ مقبول ہوگا نہ اُس کی طباعت ۔ اُنہیں مقبول اور ارزاں بنانے کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں اُردو کو عملاً نافذ کرنا ہوگا ۔

اُردو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے

اُردو کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اُسے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ملک کے مروجہ نظامِ تعلیم میں اپنایا جاسکتا ہے یا نہیں اس سوال کا جواب دینے والے اصحاب کئی طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے مغربی تہذیب خصوصاً انگریزی زبان و ثقافت کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے اس طبقے کے نزدیک صرف انگریزی ہی دنیا کی بہترین زبان ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم صرف انگریزی کے ذریعے ممکن ہے اور اگر پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے تو انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہئے۔ جس طبقے کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے اُس میں ممکن ہے کچھ صاحب الرائے لوگ بھی شامل ہوں۔ لیکن عام طور پر اس میں وہ حضرات شامل ہیں جو معیشت کے اعتبار سے ملک کے اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں، اور چونکہ اُن میں سے اکثر سرکاری ملازمتوں کی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والے ہیں اس لئے ملک کا معاشی نظام بھی زیادہ تر اُنہیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے یہ لوگ اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں جہاں انگریزی بولنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اسکول سے نکلنے کے بعد ان لڑکوں کو بطور خاص تعلیم کے لئے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ مغربی زبان اور مزاج لے کر آتے ہیں اور ایسے ٹپ ٹاپ رہتے ہیں کہ اُن کے سامنے ذہین سے ذہین اور محنتی سے محنتی اُردو بولنے والے طلبہ بھی بظاہر ماند پڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اعلیٰ ملازمتوں کے لئے جو امتحانات اور انٹرویو ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے انگریزی کے ذریعے ہوتے ہیں، اُردو میڈیم کے طلبہ تحریری امتحانوں میں تو انگریزی کا مقابلہ جیت لیتے ہیں لیکن زبانی امتحان (VIVA VOCE) میں اکثر ناکام ہو جاتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ انگریزی اس ٹھاٹ سے نہیں بول سکتے جس ٹھاٹ سے انگریزی کے ذریعہ پڑھے ہوئے امیدوار بول سکتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے، کم علم اور کم محنتی نوجوان صرف

انگریزی بول لینے کی بدولت اقتدار کی بلند کرسیوں پر پہونچ جاتے ہیں اور اُردو بولنے والے اُمیدوار ذہانت و محنت کے باوصف محروم رہتے ہیں۔

یہ بات میں یونہی نہیں کہہ رہا بلکہ میرے بیس لہ تدریسی تجربہ میں اس طرح کی سینکڑوں مثالیں آئی ہیں، میرے بعض احباب اور بعض طلبہ نے اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں اچھے نمبروں سے پوزیشن کے ساتھ کامیابیاں حاصل کیں مگر زبانی امتحان کے تین سو نمبروں میں سے اُنہیں چند نمبر دے کر ناکامیاب قرار دے دیا گیا۔ قصور صرف یہ تھا کہ وہ زبانی امتحان (VIVA VOCE) میں اپنی انگریزی گفتگو کا رعب داب دوسروں پر نہ ڈال سکے۔

اس سلسلے کا دوسرا تجربہ عام و خاص سبھی کو ہے۔ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کے انجینیرنگ اور میڈیکل کالجوں میں داخلے انٹر میجیٹ کے نتائج کی بنیاد پر بلحاظ قابلیت (MERIT) ہوتے ہیں۔ یعنی ان مقابلوں میں انگریزی میڈیم اور اُردو میڈیم کا فرق کئے بغیر صرف طلبہ کے حاصل کردہ مجموعی نمبر اور ڈویژن ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، یہ مقابلہ بڑا سخت ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ چھوٹے طبقے سے لے کر بڑے طبقے تک سب کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انٹر کے بعد میڈیکل یا انجینیرنگ کالج میں داخلہ مل جائے لیکن ان مقابلوں میں دیکھا یہ گیا ہے کہ زیادہ تر اُردو میڈیم کے طلبہ کامیاب ہوتے ہیں، پاکستان کے کسی بورڈ کا رزلٹ اٹھا کر دیکھ لیجئے فرسٹ ڈویژن میں انٹر سائنس پاس کرنیوالے زیادہ طلبہ وہ ہونگے جنہوں نے اُردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کی ہے، گویا میڈیکل کالج اور انجینیرنگ کالجوں میں داخلے کے وقت اُردو میڈیم کے امیدوار، انگریزی میڈیم کے طلبہ کو اپنی محنت، قابلیت اور ذہانت سے شکست دے دیتے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ انگریزی میڈیم کے یہی ناکام طلبہ جب گریجویشن کرنے کے بعد، اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے میں شریک ہوتے ہیں تو تحریری امتحان کے ذریعے نہ سہی زبانی امتحان کے ذریعہ سہی اقتدار کے بڑے منصبوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ ان منصبوں کے ذریعے وہ اُن ڈاکٹروں اور انجینیروں کی قسمتوں کے بھی مالک بن جاتے ہیں جنہوں نے میڈیکل اور انجینیرنگ کالج میں داخلے کے وقت اُنہیں شکست دی تھی ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بکجا

اس جگہ آرٹس کے طلبہ کا ذکر دانستہ نہیں کیا گیا اس لئے کہ آج کل عام رجحان کے مطابق آرٹس

کے مضامین وہی پڑھتے ہیں جو سائنس کے مضامین پڑھنے کے اہل نہیں ہوتے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ سائنس کے طلبہ کے مقابلے میں کم محنتی اور ذہین ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں کی معرفت صرف وہی اعلیٰ عہدوں تک پہونچتے ہیں جو زبانی امتحان (۷۵ ۱۷۵) میں انگریزی بولنے کی مہارت ظاہر کرتے ہیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خاص طبقے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جو بدستور کسی علمی استدلال کے انگریزی ہی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنا چاہتا ہے، وہ دراصل پوری ثروت، اعلیٰ منصب اور تعلیم کو اپنے طبقے کے لئے مخصوص رکھ کر، اقتدار کی کرسیوں پر قابض رہنا چاہتا ہے ورنہ اتنی بات تو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ حقیقی تعلیم کا حصول غیر زبان کے ذریعے نہیں اپنی ہی زبان کے ذریعے ممکن ہے۔ دنیا کے سارے مفکرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کسی قوم کو بہترین تعلیم صرف اس زبان کے ذریعے دی جاسکتی ہے جو اس قوم میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے، یہی سبب تو ہے کہ دنیا کی ہر آزاد اور غیور قوم نے اپنی ہی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے۔

انگریزی کی اہمیت اپنی جگہ ہے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں حسب ضرورت اس کی اہمیت کو محسوس بھی کیا گیا ہے لیکن انگریزی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اور یہ خیال کرنا کہ انگریزی کے سوا کسی اور زبان کے ذریعہ تعلیم کا معیار بلند نہیں کیا جاسکتا۔ غلامانہ ذہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے دنیا کے بڑے ملکوں میں امریکہ کی زبان تو اس لئے انگریزی ہے کہ وہ ابتداءً برطانیہ ہی کی نوآبادیات کا حصہ تھا اور وہاں کی آبادی برطانوی باشندوں ہی پر مشتمل تھی لیکن آج روس اور چین بھی امریکہ کے مقابلے میں کمتر درجے کے نہیں ہیں۔ ان کی سائنسی فتوحات معمولی نہیں غیر معمولی ہیں لیکن یہ فتوحات انگریزی کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنی اپنی یعنی روسی اور چینی کو ذریعہ تعلیم بنا کر حاصل کی گئی ہیں، جاپان اور جرمنی کم ترقی یافتہ نہیں ہیں، ایجادات اور مصنوعات کے سلسلے میں ان دونوں نے دنیا کی مارکیٹ میں اپنا سکہ جما رکھا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان ملکوں میں انگریزی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ بلکہ انگریزی داں طبقہ کو اپنے فائدے اور سہولت کے لئے جاپانی اور جرمن سیکھنا پڑتی ہے۔ یورپ کے سارے ملکوں کا یہی حال ہے انہوں نے اخذ و ترجمہ کے ذریعے دنیا کی ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ذریعہ تعلیم اپنی ملکی زبان ہی کو رکھا ہے —

ان مثالوں سے بھی زیادہ سبق آموز مثال، اسرائیلیوں کی ہے۔ اسرائیل ایک چھوٹے سے خطے کے مالک ہیں اور اُن کی مذہبی زبان عبرانی ہے، عبرانی ایک مردہ زبان ہے اور اُس کے بولنے اور سمجھنے والے دنیا میں بہت کم لوگ ہیں لیکن اُنہوں نے اس کی طرف خاص توجہ دی اور عبرانی ہی کو پرائمری اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ چند سال کے اندر اس سے یہودی مملکت کو جو فائدہ پہنچا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ترکی، انڈونیشیا، مصر اور دوسرے نو آزاد ممالک نے بھی یہی کیا ہے، اب ان ملکوں میں ترقی کے جو آثار نمایاں ہو رہے وہ ملکی اور قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ثمرہ ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک خاص طبقے کا یہ اصرار کہ ہمارے نظام تعلیم میں انگریزی ہی کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیئے مہمل اور مضحکہ خیز بات ہے۔

ہمارے ہاں ۱۹۵۸ء میں ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کو مختلف ماہرین تعلیم نے اپنی تجاویز بھیجی تھیں، ان تجاویز پر غور کر کے حکومت نے ایک رپورٹ شائع کی تھی اس رپورٹ میں قومی زبان اور اُس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں بعض باتیں بڑی کارآمد اور خیال انگیز کہی گئی تھیں اس رپورٹ کا ایک اقتباس دیکھئے:-

> "زبان ایک ملک کے رہنے والوں کے خیالات و نظریات اور تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کے ماضی کو حال سے ملاتی ہے۔ یہ قومیت کا ایک لازماً جزو ہے کیونکہ اس کے ذریعے قوم کے افراد میں سوچنے، محسوس کرنے اور عمل کرنے کی قوتوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، علاوہ ازیں زبان ہی کے توسط سے عوام میں علم پھیلایا جا سکتا ہے اور مختلف قسم کی دریافتوں اور ایجادوں کی اشاعت ہو سکتی ہے، چونکہ تعلیم کے بڑے مقاصد تہذیب و تمدن کا ارتقاء، علم کی اشاعت اور قومی اتحاد کی تکمیل ہیں، اُن سب کا انحصار زبان پر ہے اس لئے زبان اور تعلیم آپس میں ایک گہرے رشتے کے ساتھ منسلک ہیں اور دونوں کی حیثیت

لازم و ملزوم ہے۔

"ہمیں پوری قوت کے ساتھ ایسی کوشش کرنی چاہیے جس سے ہماری قومی زبانیں سب سے اونچے درجوں کے لئے بھی ذریعۂ تعلیم بن سکیں، اس سے نہ صرف وہ خلیج باقی نہ رہے گی جو عوام و خواص کے درمیان موجود ہے بلکہ اس سے اُن مقاصد میں سے ایک مقصد وہ بھی پورا ہو جائے گا جس کے لئے ہمارے ملک کا قیام عمل میں آیا ہے۔"

کمیشن کی رپورٹ میں مندرجہ بالا باتیں یونہی نہیں کہی گئیں، ان باتوں کی پشت پر ٹھوس دلائل اور حقائق ہیں۔ ان دلائل و حقائق کی وضاحت بہت طول کھینچے گی۔ اس جگہ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ

(الف) قومی زبان متحدہ قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے سب سے بڑی قوت محرکہ ہے یہ بنیادی عُنصر ہے جس کے ذریعے مختلف طبائع رکھنے والے افراد میں یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ قومی جھنڈے اور قومی ترانے کی طرح قومی زبان بھی عوام کے لئے افتخار کا موجب ہوتی ہے اور اس طرح وہ قومی وقار کی ایک علامت بن جاتی ہے۔

(ب) جب ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اور ملک کے عوام ایک ہی قومی زبان کو استعمال کرتے ہیں تو طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں ملک کے مصلحین، مفکرین اور ارباب تعلیم کے اعلیٰ خیالات تک رسائی ہوتی ہے۔

(ج) غیر ملکی زبان میں تعلیم دینے سے طلبہ پر بہت بوجھ پڑتا ہے اور غیر ملکی زبان سیکھنے میں اُن کا بہت زیادہ وقت ضائع ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اپنی قومی زبان میں تعلیم پاتے ہیں تو وہ علم کی تحصیل اور اپنی ذہنی قوتوں کی نشو و نما کے لئے زیادہ وقت دے سکتے ہیں۔ قومی زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے ان میں آزاد سوچ بچار کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور اُن کی قوتِ تحریر بڑھتی ہے۔ اس سے اُن میں بالغ نظری پیدا ہوتی ہے اور، اور یجبل تخلیقات کے لئے اُن کی قوتِ محرکہ اُبھرتی ہے۔

(د) اعلیٰ تعلیمی درجوں میں جب قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جاتا ہے تو نہ صرف

قومی زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے بلکہ چونکہ اس صورت میں ہمارے تمام ارباب دانش کی تخلیقات اور تحقیقات اسی زبان میں ہوتی ہیں اس لئے عوام کو بھی اُن سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے بالواسطہ زراعت، تجارت اور صنعت میں ترقی ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کی بنا پر ملک کا باشعور اور بہی خواہ طبقہ فوری طور پر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں ہے لیکن اس گروہ کو بھی دو خاص طبقوں میں بانٹ کر گفتگو مناسب ہوگی ایک وہ ہے جو زیادہ تر ماہرین تعلیم، اساتذۂ فن اور معلمین پر مشتمل ہے، گویا یہ وہ طبقہ ہے جو محض نظری طور پر بحث مباحثے میں حصہ نہیں لیتا بلکہ ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا حامی ہے۔ اس طبقے میں ملک کے بیشتر علمائے ادب، اساتذہ اور دانشور شامل ہیں۔ میں اس جگہ ذریعۂ تعلیم کے باب میں اختصار کے ساتھ چند ایسے علماء و اساتذہ کی رایوں کا بطور حوالہ ذکر کروں گا، جن کی ساری زندگی سائنس کی درس و تدریس بسر ہوئی، میری مراد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر قاضی سعیدالدین اور ڈاکٹر رفیق احمد خاں اور میجر آفتاب حسن وغیرہ سے ہے یہ سب سائنسی علوم پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ اپنے اپنے مضمون کی تدریس کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، ان بزرگوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جب تک ابتدائی جماعتوں سے لیکر اعلیٰ سطح تک اُردو کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے گا، پاکستان میں تعلیم کا بلند معیار قائم نہ ہو سکے گا۔ ڈاکٹر رضی الدین نے مولوی عبدالحق صاحب کو ایک استفسار کے جواب لکھا تھا کہ

> "اب اُردو میں وہی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے جو دوسری بڑی زبانوں میں ہے، طبعی، عمرانی، اقتصادی اور حیاتیاتی ہر قسم کے علوم کے لئے اُردو بخوبی ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے اگر اُردو پڑھنے پڑھانے والے، دونوں کی اپنی زبان ہو اور وہ اچھی طرح واقف ہوں تو اُس کو ذریعہ تعلیم بنانے سے وہی فوائد مرتب ہونگے جو ایک انگریز کو انگریزی زبان میں اور ایک جرمن کو جرمن زبان میں تعلیم دینے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقے کو اختیار کرنے سے ہمارے طلبہ کی آدھی مصیبت دُور ہو جائیگی۔ اس وقت ان کو اپنے مضمون کی مشکلات پر حاوی ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کی گتھیاں بھی سلجھانی پڑتی ہیں، اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے مضمون پر پوری توجہ صرف کر سکیں گے جس سے یقیناً علم کے معیار میں اضافہ ہوگا۔"

ڈاکٹر قاضی سعیدالدین کی رائے ہے کہ:

"اُردو، سائنس کی تدریس کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ طلبہ کو علم حاصل کرنے میں آسانی ہو جائے گی، کم وقت میں نصاب کو زیادہ خوبی سے پڑھ سکیں گے۔"

ڈاکٹر رفیق احمد خاں کی رائے کے مطابق

"اُردو سائنس کی تعلیم کا اطمینان بخش ذریعہ بن سکتی ہے اس سے خود اُستادوں کو لکچر دینے میں سہولت ہوگی، میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اکثر طلبہ اپنے وقت اور قوت دماغی کا زیادہ حصّہ، انگریزی کے فقروں کو زبانی یاد کرنے میں خرچ کرتے ہیں اگر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تو وہی وقت اور دماغی قوت سائنس کے حقائق سے آگاہی حاصل کرنے میں صرف ہوگی۔"

ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب کا خیال ہے کہ:

"اُردو، انٹرمیڈیٹ، بی، ایس سی اور ایم، ایس سی کے درجوں میں فوراً ہی ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے، فائدہ یہ ہوگا، مضمون سب سمجھ میں آئیں گے، عوام بلکہ ساری قوم، اُردو کے ذریعہ جلد از جلد سائنس شناس اور سائنٹفک ذوق اور تربیتِ دماغی کی حامل ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے اور زیادہ سخت الفاظ میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قائم رکھنے کی مخالفت کی ہے اُن کے خیال میں:

"سائنس اور فلسفہ کی اُن دشوار گذار حسین منزلوں تک رسائی جہاں

تخلیق و تکوین کے اُجالے آنکھوں کو چکا چوند کردیں اُن بہ خود داروں
کے بس کا روگ نہیں جن کا اپنے ادب اور اپنی تہذیب سے سروکار نہ ہو اور
جن کی تعلیم کا وسیلہ ایک مجرد اً غیر متعلق زبان ہو۔"

غرض کہ ملک کے ممتاز سائنسدانوں اور علمی و ادبی کام کرنے والوں کی رائے بالعموم یہی ہے کہ تعلیم کے سارے مدارج میں ملک کی مقبول ترین اور قومی زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے جب تک ایسا نہ ہوگا ہماری قوم میں نہ علمی نقطۂ نظر پیدا ہوگا اور نہ وہ سائنسی علوم سے حقیقی دلچسپی کا اظہار کرسکے گی، لیکن اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تائید میں مندرجہ بالا مثبت دلیلوں کے باوصف ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو اصولی طور پر تو اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا حامی ہے لیکن اُسے عملی شکل دینے کا سوال آتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے، بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :

"یہ وہ طبقہ ہے جسے اپنی زبان سے بھی ہمدردی ہے اور جس پر انگریزی اور انگریزی کے اقبال کا سایہ بھی ذرا ہلکا پڑا ہے۔ یہ لوگ اصولاً تو تسلیم کرتے ہیں کہ قومی ترقی کے لئے قومی زبان کی ترقی ضروری ہوتی ہے اور ملک میں تعلیم و تدریس کے معیار کو اعلیٰ کرنے کے لئے قومی زبان میں تعلیم ہونی چاہئے لیکن ان کے خیال میں اُردو ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ اُسے یہ منصب سونپا جائے۔"

اس طبقے کی طرف سے اُردو کو ذریعۂ تعلیم نہ بنانے کے سلسلے میں جو باتیں بطور اعتراضات کہی جاتی ہیں اگرچہ وہ نئی نہیں ہیں، اس سے پہلے بھی بارہا کہی گئی ہیں اور اُن کے جوابات دیئے جاچکے ہیں پھر بھی ان کے اعتراضات پر ایک نظر ڈالتے چلئے۔

(۱) اُردو زبان میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ سائنسی علوم کے لئے کامیاب ذریعۂ تعلیم بن سکے۔

(۲) اُردو میں سائنس کی اتنی تالیفات یا تراجم موجود نہیں جن کی مدد سے تدریس سے کارآمد اور موثر بنایا جاسکے۔

(۳) سائنس کے مختلف علوم کی اصطلاحات، اُردو میں موجود نہیں ہے اس لئے پڑھانے میں غیر معمولی دشواری پیش آئے گی۔

(۴) ایسے اساتذہ بھی مشکل سے مل سکیں گے جو اُردو کے ذریعے سائنس کی تعلیم دے سکیں۔

(۵) اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے سے انگریزی سے رابطہ ختم ہو جائے گا اور سائنسی علوم سے استفادہ کرنے میں دشواری ہو گی۔

(۶) اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے سے، تعلیم کا معیار گر جائے گا۔ اور طلبہ کی ذہنی و علمی سطح، پست ہوتی جائے گی۔

ان میں سے کئی اعتراضات کے جوابات پچھلی سطوریں دیئے جا چکے ہیں۔ باقی اعتراضات کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کام شروع کرنے ہی سے وہ کمزوریاں دُور ہو سکتی ہیں جو بطور اعتراضات پیش کی گئی ہیں۔ دنیا کے کسی ملک اور قوم میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ پہلے کسی خاص زبان کو بے ضرورت بلند معیار تک پہونچا دیا گیا ہو۔ اس کے بعد اُسے ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہو۔ ہر ملک نے یہی کیا ہے کہ پہلے اپنے ملک کی مروجہ زبان، کو بطور ذریعہ تعلیم اپنا لیا ہے۔ بعد ازاں اُس میں جدید علوم کا ساتھ دینے کی صلاحیت رفتہ رفتہ خود پیدا ہو گئی ہے۔ انگریزی، جرمن، جاپانی، روسی اور چینی زبانیں، آج دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت کیوں رکھتی ہیں، صرف اس لئے کہ انہیں پہلے ہی دن سے اپنے اپنے ملکوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ذریعۂ تعلیم بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبانیں، جدید علوم کی ترقی کے ساتھ آگے بڑھتی گئیں اور سارے زمانے کے لئے قابل رشک بن گئیں۔ سائنس کے مضامین کے لئے اُردو میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ضروری کتابوں کے ترجمے کئے جا سکتے ہیں، اساتذہ کو تربیت کے مواقع بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔ اصطلاحات مرتب کی جا سکتی ہیں اور اُردو کے اسلوب کو سائنٹفک بنایا جا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ اُسے پہلے ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے عملاً قبول کر لیا جائے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، کام شروع ہو گا تو وسائل خود بخود پیدا ہو جائیں گے یہی فطری عمل ہے اور اُسی کے مطابق کام ہونا چاہئے، بلا ضرورت کون کتاب لکھے گا، کیوں ترجمے کرے گا کس لئے کوئی چھاپے گا اور کس لئے کوئی استاد اس میں مشق و مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا؟ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ابتداءً اسی قسم کی کمزوریاں تھیں، آخر کار دُور ہو گئیں، اصطلاحات کی بھی یہی صورت ہے۔ یہ ایک دن میں نہیں حسب ضرورت بنتے بنتے بنتی ہیں، اُردو میں اصطلاح سازی کی صلاحیت موجود ہے اُس کا بنیادی رشتہ اُس لسانی خاندان سے ہے جس میں انگریزی، جرمن، فارسی اور

ہندی وغیرہ شامل ہیں چنانچہ جن اصولوں پر انگریزی میں سائنسی اصطلاحات، یونانی اور لاطینی کی مدد سے بنائی گئی ہیں انہیں اصولوں کے تحت اُردو میں فارسی اور عربی کی مدد سے اصطلاحات تیار کی جاسکتی ہیں، مختصر یہ کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں جو دشواریاں بتائی جاتی ہیں وہ ایسی نہیں کہ اُنکی وجہ سے کام کو روکا جائے، کام کا آغاز ضروری ہے تبھی تو سائنس کے باشعور معلمین و مفکرین اُردو کو جلد سے جلد ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں ہیں، مولوی عبدالحق صاحب نے اب سے بائیس تیئیس سال پہلے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تین سوالات قائم کئے تھے۔

(الف) کیا اُردو ذریعہ تعلیم ہونی چاہئے اور کیا اُردو تمام مضامین خصوصاً سائنس میں اعلیٰ مدارج تک ذریعہ ہوسکتی ہے۔

(ب) کیا مختلف مضامین میں مناسب کتابیں موجود ہیں اگر نہیں تو اُن کو تیار یا مہیا کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

(ج) ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے سلسلے میں کن کن ابتدائی دشواریوں کا امکان ہے اور ان دشواریوں کو حل کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے، کیا اساتذہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے لئے تیار ہیں، وہ کتنے عرصے میں اس قابل ہوجائیں گے کہ اُردو میں تعلیم دے سکیں؟

(د) اس تبدیلی سے معیار تعلیم پر کیا اثر پڑے گا؟

یہ سوالات ملک کے ممتاز سائنسدانوں اور سائنس کا تدریسی تجربہ رکھنے والوں کو بھیجے گئے تھے، اور جواب منگائے تھے۔ پہلے سوال کا جواب پچھلے صفحات میں تفصیل سے دیا جاچکا ہے دوسرے، تیسرے اور چوتھے سوال کے جواب میں چند علمائے سائنس کی رائیں دیکھئے۔

"اگر اُردو کی اصطلاحیں خصوصاً جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحیں اور علامتیں اختیار کی جائیں تو پھر ہر مضمون کی کتابیں اُردو میں دستیاب ہوسکتی ہیں"

کسی مضمون کے لئے نصابی کتابیں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتیں، جامعاتی تعلیم میں اساتذہ کے لکچروں کی اہمیت کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے اگر موزوں اساتذہ فراہم ہوجائیں تو پھر کتابوں کا سوال نہ یا ثانی

اہمیت نہیں رکھتا۔"

"بعض اساتذہ اس قابل ہونگے کہ اُردو میں فوری تعلیم دینا شروع کردیں ان میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو اُردو زبان سے کما حقہ واقف ہیں اور اُردو تعلیم کا تجربہ حاصل کرچکے ہیں، بعض لوگ اصطلاحات سے ناواقف ہیں وہ ایک دو سال میں واقفیت حاصل کریں گے"۔

"غیر زبان کی مشکلات اور اُن کی وجہ سے معیار علم پر جو بُرا اثر پڑا ہے وہ اس قدر بدیہی ہے کہ کوئی شخص دیانت داری کے ساتھ اُس سے انکار نہیں کرسکتا، نظری بحث کے علاوہ عملی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملک مثلاً سویڈن، ڈنمارک ہالینڈ اور پولینڈ وغیرہ اپنی ہی زبان کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ اُن کے چاروں طرف انگریزی، جرمن، فرنچ اور روسی جیسی ترقی یافتہ زبانیں بولی جاتی ہیں"۔

"میں مدراس، بمبئی، کلکتہ، الہ آباد، لکھنؤ، دہلی اور پنجاب وغیرہ تمام بڑی جامعات کا (ایم۔اے، پی، ایچ۔ڈی اور ڈی، ایس، سی کا ممتحن رہا ہوں، بے شمار مرتبہ ان جامعات میں لیکچر دے چکا ہوں اور طلبہ سے ملتا رہا ہوں، میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ استثنائی صورتوں کے علاوہ عام طور پر طلبائے جامعہ عثمانیہ کا معیار ریاضی میں دوسری جامعات کے طلبہ سے کافی اونچا تھا"

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی)

"میری رائے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر ماہر فن سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے مضمون پر ایک مستند کتاب تالیف کرے اسمیں شبہ نہیں کہ اُردو میں سائنس کی کتابیں لکھنے والوں کی پاکستان میں بہت کمی ہے، بہرحال یہ کمی اُردو کے عالموں کی مدد سے پوری کی جاسکتی ہے۔ اگر جادو ناتھ سرکار، منشیوں کی مدد لے کر اورنگزیب پر ایک کتاب لکھ سکتے تھے، اگر علامہ یوسف علی عربی کے عالموں کی مدد سے کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ کرسکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں ہمارے سائنس داں اُردو کے ماہرین کے ساتھ مل کر سائنس پر کتابیں نہ لکھ سکیں۔"

"سوال نمبر ایک کے ضمن میں بیان کرچکا ہوں کہ اگر اُردو کو ذریعہ تعلیم بنا لیا گیا تو معیار خود بخود بلند ہو جائے گا۔ یہ خیال کہ اگر اُردو میں تعلیم دی گئی تو معیار گر جائے گا نہ صرف یہ کہ بے بنیاد ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے"

(ڈاکٹر رفیق احمد خاں)

"حیدرآباد میں دارالترجمہ نے بہت سی مروجہ درسی کتابوں کا ترجمہ کردیا ہے، ان کتابوں کو نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ جدید کتابوں کا ترجمہ کرایا جاسکتا ہے۔ تراجم کے علاوہ بہت سے مصنفین نے انٹرمیڈیٹ وغیرہ کے لئے کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کو استعمال کیا جاسکتا ہے، اساتذہ اپنے نوٹوں سے بھی درسی کتابوں کی کمی ابتدائی دور میں پورا کرسکتے ہیں۔

" اساتذہ کی سائنسی اصطلاحات سے ناواقفیت اُن کے کام میں

رکاوٹ ڈالے گی۔ علاج یہ ہے کہ فرہنگ اصطلاحاتِ سائنس شائع کی جائے ۔"

"جب اُردو ذریعہ تعلیم ہو گی تو طلبہ کا معیار یقیناً بلند ہو جائے گا کیونکہ اُستاد اس مضمون کو بہتر طریقے پر سمجھا سکتا ہے، طالب علم بہتر طریقے پر سمجھ سکتا ہے اور اس کا اظہار کر سکتا ہے ۔"

(میجر آفتاب حسن)

"بیشتر سائنسی مضامین کے لئے اُردو میں کتابیں موجود ہیں، اُردو زبان میں جامعہ عثمانیہ میں تمام کلاسوں میں اور علی گڈھ میں انٹر میڈیٹ میں تعلیم ہوتی رہی ہے کچھ کتابیں چھپی ہوئی ہیں اُن پر نظر ثانی کی جائے جو کتابیں موجود نہیں اُن کا ترجمہ کرایا جا سکتا ہے اور نئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں جب تک کتابیں نہ ملیں اساتذہ اپنے تفصیلی لکچر نوٹس سے اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں ۔"

"کتابیں تو کچھ نہ کچھ ہیں بھی، لیکن نقشے اور چارٹ وغیرہ کمیاب ہیں، میری رائے میں مضامین مطلوبہ کے چارٹ، تصاویر، اشکال وغیرہ کی اُردو میں شائع کر کے فوراً کلاسوں میں پڑھانے کے لئے اُن سے مدد لی جائے ۔"

(ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری)

اسی قسم کے جوابات، تقریباً سارے علمائے سائنس کی طرف سے دیئے گئے ہیں اور اُردو کو ہر سطح پر ہر مضمون کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے کی پر زور سفارش کی گئی ہے، بعض اساتذہ اور سائنسدانوں نے جن میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور پروفیسر عبد السلام جیسے لوگ بھی شامل ہیں، نمونہ کے طور پر اُردو میں سائنس کے مضامین پر مختلف مقامات پر لکچر بھی دیئے ہیں۔ ڈاکٹر آئی، ایچ عثمانی صاحب نے

البتہ اپنے ایک مقالے میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ لیکن اُن کے اعتراضات وہی پرانے تھے بلکہ زیادہ تر اُردو کی ترقی اور اُس کی صلاحیتوں سے ناواقفیت کی بنا پر تھے۔ میجر آفتاب حسن صاحب اس مقالے کا ردّ شائع کر چکے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ خیال کرنا کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے کامیاب ثابت نہیں ہو سکتی محض بے بنیاد اور مضحکہ خیز بات ہے۔ اب سے سوا سو سال پہلے غیر قوم کے ہاتھوں یہ تجربہ کیا جا چکا ہے کہ اُردو ابتدائی اور اعلیٰ جماعتوں میں ہر قسم کی تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں بلکہ اُس سے بھی کچھ قبل، دلی کالج میں، اُردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے پرکھا جا چکا ہے، اس کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون حتیٰ کہ ریاضی اور اُس کی متعدد شاخوں کی تعلیم اُردو کے ذریعے دی جاتی تھی، اس تجربے کے متعلق ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے ۱۸۵۳ء کی رپورٹ میں یوں اظہارِ خیال کیا تھا:—

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اُسے دُوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اُردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور یہ امتیازی خصوصیت خاص طور پر ریاضی کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے، مناسب یہ ہے کہ اُسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے۔"

خود کالج کے انگریز پرنسپل ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے" اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا ایک اور تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں کیا جا چکا ہے یہاں ڈاکٹری۔ انجینئرنگ۔ قانون اور سائنس کی ہر شاخ کی تعلیم اُردو میں ہوتی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے جو گرانقدر نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ پاکستان میں اُردو کالج کراچی پچھلے کئی سال سے عثمانیہ کے طرز پر کام کر رہا ہے۔ اس میں سائنس۔ قانون۔ تجارت اور آرٹس کے سارے مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے ہیں اور اس کالج کے طلبہ و طالبات اُردو ہی میں امتحانات کے پرچے حل کرتے ہیں۔ امتحانات کے نتائج اور تعلیمی معیار کے لحاظ سے اُردو کالج شہر کے اچھے کالجوں میں شمار ہوتا ہے

اور اب تک کوئی ایسی چیز سامنے نہیں آئی جس کی بناء پر اس ذریعہ تعلیم کو ناقص قرار دیا جا سکے ۔ علاوہ ازیں پنجاب اور کراچی یونیورسٹی نے ڈگری کلاسوں کے امتحان میں بھی انگریزی کے ساتھ اُردو میں جواب دینے کی اجازت دے دی ہے ۔ نتائج سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اُردو میں جواب دینے والے طلبہ دوسروں سے بہت بہتر ہیں ۔ یہ تجربات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اُردو میں ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے ۔ کسی زبان کو ذریعہ تعلیم و تدریس بنانے کے لئے ضروری ہے ۔ کہ :۔

۱ ۔ وہ زبان عام فہم ہو اور عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہو ۔

۲ ۔ قوم و ملک کی معاشرتی و تمدنی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہو ۔

۳ ۔ زبان جامد نہیں ۔ بلکہ سیال ہو یعنی الفاظ کے اخذ و اختراع کی قوت رکھتی ہو ۔

۴ ۔ اس میں مختلف علوم و فنون خاص طور پر سائنس ، تجارت ، ڈاکٹری اور انجنیرنگ کی اہم اصطلاحات موجود ہوں ۔

۵ ۔ زبان اس درجہ وسیع اور جامع ہو کہ اس میں حسب ضرورت دوسری زبانوں کی فنی و علمی کتابیں آسانی سے ترجمہ کی جا سکیں ۔

۶ ۔ اس زبان کی اپنی قواعد ہو جس کی مدد سے وہ زبان دوسروں کو آسانی سے سکھائی جا سکے

۷ ۔ اس زبان کے ایسے ماہرین موجود ہوں جو ہر قسم کے علم و فن کی تعلیم اس میں دے سکتے ہوں ۔

۸ ۔ اس میں مختلف علوم و فنون پر متعدد لغات ۔ قاموس اور اصطلاحی کتابیں موجود ہوں جن سے وقتاً فوقتاً مدد لی جا سکے ۔

۹ ۔ اس زبان میں تصنیف و تالیف اور طباعت و اشاعت کی ایسی سہولتیں میسر ہوں جو کم وقت اور کم قیمت پر کتابیں مہیا کر سکیں ۔

۱۰ ۔ وہ زبان قومی مزاج سے ہم آہنگ ہو اور قومی خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر سکتی ہو ۔

۱۱ ۔ زبان الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہو اور اس میں سائنس و فلسفہ کے دقیق سے دقیق مسائل اور فنون لطیفہ کے نازک سے نازک پہلوؤں کی تشریح و توضیح کی جا سکتی ہو ۔

۱۲ ۔ ملک کے عام باشندے اس زبان میں تقریر و تحریر اور غور و فکر کے عادی ہوں ۔

۱۳ ۔ ملک میں اس زبان کی اعلیٰ تعلیم کا مناسب انتظام ہو اور اس میں ہر قسم کے تحقیقی موضوع پر کام کیا جا سکتا ہو ۔

۱۴ ۔ وہ زبان اپنے ارتقا کی تاریخ کے ساتھ علم و ادب کا نمایاں سرمایہ رکھتی ہو ۔

۱۵ ۔ اس کا رسم الخط ایسا آسان ہو کہ لکھنے پڑھنے میں مدد کر سکے ۔

یہ ساری خوبیاں اُردو میں کم و بیش موجود ہیں اگر کوئی کمی ہے تو اُسے پُورا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اُردو کو قومی زبان بنانے کے لئے حکومت نے جو مقاصد پیش نظر رکھے ہیں ۔ ان کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو زبان کو بنایا جائے کام شروع کر دیا جائے گا تو اُس کی تکمیل و تزئین کی صورتیں خود بخود پیدا ہو جائیں گی ۔

پاکستان اور اُردو

پاکستان میں اُردو کے علاوہ، اور کئی علاقائی زبانیں مثلاً پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی اور بنگالی وغیرہ بولی جاتی ہیں، یہ سب زبانیں اپنا اپنا ثقافتی اور ادبی سرمایہ رکھتی ہیں اور یک گونہ اہمیت کی حامل ہیں ان کی انفرادیت اور علاقائی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ اُردو کے مقابلے میں ان زبانوں کا حلقۂ اثر بہت محدود ہے یہ اپنے اپنے علاقوں میں موثر کردار ادا کرتی ہیں، دوسرے علاقوں میں جا کر بے اثر ہو جاتی ہیں، لیکن اُردو کی نوعیت ان سب سے بہت مختلف ہے اس کا حلقۂ اثر کسی خاص علاقے تک محدود نہیں بلکہ مُلک گیر ہے، چنانچہ پاکستان یا پاکستانی باشندوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جو اُردو سے گہرا تعلق نہ رکھتا ہو جسے اُردو نے متاثر نہ کیا ہو۔ تحریک پاکستان و قیام پاکستان سے لیکر پاکستان کی موجودہ سیاست و معاشرت، ثقافت و مذہب اور تعلیم و ادب میں سے کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی تعمیر و توسیع میں کم و بیش اُردو کا دخل نہ ہو جس دو قومی نظریئے کے تحت پاکستان وجود میں آیا ہے اُس کا اہم عنصر یہی اُردو زبان تھی، برصغیر کے مسلمانوں نے کانگریس یا گاندھی جی کے ایک قومی نظریہ سے بے سبب اختلاف نہیں کیا تھا، وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انہوں نے یک قومی نظریئے کو تسلیم کر لیا تو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ ہندو اکثریت میں گم ہو جائیں گے اور ایک دن وہ آئے گا کہ ان کا اجتماعی وجود برصغیر سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا ان کی زبان — ان کا مذہب ان کی تہذیب اور ان کے علوم و فنون سب

ایک ایک کر کے تباہ ہو جائیں گے۔ یہی وہ خطرہ تھا جسے دور کرنے کے لئے مسلمانوں نے مخلوط انتخاب اور ایک قومی نظریئے کی مخالفت کی۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک قوم خیال کیا جائے اور جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسے پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی آزاد و خود مختار مملکت تسلیم کیا جائے۔ تاکہ مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور اپنی خواہش و ضرورت کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی معاشری و مذہبی روایات اور علمی و ادبی اقدار کو ترقی دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے جس تہذیب و تمدن و مذہب و معاشرت کی تباہی کا خطرہ محسوس کیا تھا۔ اس کا تقریباً سارا سرمایہ اردو زبان میں تھا۔ اس لئے جیسے ہی گاندھی جی اور کانگریس نے اردو کے مقابلے میں ہندی یا ہندوستانی کو رائج کرنے کی حمایت کی اور اس قسم کی آوازیں بلند ہونے لگیں کہ

(۱) "ہم اردو کے اس لئے مخالف ہیں کہ اُردو قرآنی زبان میں لکھی جاتی ہے۔"

(۲) "اردو مسلمان بادشاہوں کی زبان ہے مسلمان چاہیں تو اسے باقی رکھ سکتے ہیں لیکن ہندوستانی زبان ہندی ہی ہوگی۔"

(۳) "ہندوستان میں ہندو تہذیب ہی کے ذریعہ سوراج قائم ہو سکتا ہے دھرم کی روشنی میں ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود کر دیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی تعلیم مسلمانوں کو دی جائے۔"

تو مسلمان سمجھ گئے کہ گاندھی جی اور ان کے ساتھی اردو کو ختم کرنے کے بہانے مسلمانوں کو ان کے سارے علمی و ادبی کارناموں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ اصل حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر اردو کی موت و زندگی کا مسئلہ سامنے نہ آجاتا تو ممکن تھا مسلمانوں کا سیاسی نقطۂ نظر کچھ اور ہوتا۔ بات یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اُردو کو مسلمانوں کے مزاج میں غیر معمولی دخل تھا۔ وہ عام طور پر اسی زبان میں سوچتے اسی میں تقریر کرتے اور اسی میں لکھتے تھے۔ ان کی معاشی ضرورتوں کا حل اور ان کے سیاسی خیالات کی ترجمان بھی یہی زبان تھی اسی میں ان کے اخبار و رسائل نکلتے تھے اور اس کے ذریعہ ان کی آواز دوسروں تک پہنچتی تھی۔ ظاہر ہے اس سے الگ رہ کر وہ قومی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے پاکستان کے نام سے ایک ایسے آزاد علاقے کا مطالبہ کیا جس میں ان کی وہ زبان زندہ رہ سکے جو ان کی قومی مذہبی اور علمی و ادبی قدروں کی محافظ اور ضامن ہو۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے کمزور جسم میں زندگی کی روح

اسی زبان نے پھونکی تھی۔ اسی زبان میں لوگوں کو پاکستان کا مفہوم سمجھایا گیا تھا۔ اسی کی آڑ لے کر برصغیر کے مسلمانوں کو جان و مال کی غیر معمولی قربانیوں پر آمادہ کیا گیا تھا اسی کے ذریعہ لوگوں کے ذہن دو قومی نظریئے کے لئے ہموار کئے گئے تھے اور اسی کا واسطہ دیکر پاکستان کے حق میں ووٹ حاصل کئے گئے تھے غرض پاکستان کی تحریک اور اس کی جنگ آزادی میں اردو زبان نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ پاکستان بڑی حد تک اُردو ہی کے تحفظ کے لئے خود اُردو کے دم قدم سے وجود میں آیا ہے۔ قائداعظم کی مادری زبان اگرچہ اُردو نہ تھی لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ پاکستان کے استحکام اور اس کی سالمیت کے لئے پاکستانی مدرسوں میں اردو کی تعلیم ضروری ہے۔ غالباً انہوں نے اُردو کی اسی سیاسی اہمیت کا لحاظ رکھ کر اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی۔

قائداعظم کا خیال بہت درست تھا۔ قومی زبان کو جن خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے وہ بدرجہ اتم اردو میں موجود ہیں اس کا مزاج اور ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ پاکستان کے داخلی و خارجی مسائل دونوں کے حل میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔ پاکستان ایک وسیع علاقہ ہے جو اپنے حالات کے ماتحت مختلف خطوں اور صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ آباد ہیں اور وہ اپنی اپنی الگ بولیاں بھی رکھتے ہیں مثلاً بنگالی۔ سندھی۔ بلوچی۔ پشتو اور پنجابی وغیرہ لیکن ان زبانوں کا حلقہ اثر بہت محدود ہے وہ اپنے مخصوص علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور قدرے علمی و ادبی سرمایہ بھی رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی ایسی جامعیت و ہمہ گیری نہیں ہے جو پاکستانی قوم کی نمائندگی کر سکے۔ وہ اپنے اپنے خطوں میں بولی جاتی ہیں۔ لیکن خطے سے باہر عموماً اجنبی خیال کی جاتی ہیں۔ زبان کے اجنبی ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خطے کے لوگ دوسرے خطے کے لوگوں کے لئے اجنبی رہتے ہیں جب تک تبادلۂ خیال اور باہم ربط و ضبط بڑھانے کے لئے کوئی مشترک زبان موجود نہ ہو قومی شیرازہ بندی ناممکن ہے۔ قومی کردار کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کے افراد میں ذہنی یگانگی و ہم خیالی پیدا کرنے کے لئے کوئی ایسی زبان موجود ہو جو علاقائی حدود کو توڑ کر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ پاکستان کی علاقائی یا مادری زبانیں بھی اپنے اپنے حلقوں میں اہم خیال کئے جانے کے لائق ہیں لیکن وہ قومی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق "مقامی بولی صرف ایک مقام کی ہے۔ قومی زبان ساری قوم کی ہے۔ قومی زبان پورے قومی خصائص اور اس کی روایات

کی رشتہ دار ہوتی ہے۔ مقامی بولی صرف ایک فرد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور بس۔ قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی ہے اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور قومیت کے ولولوں کو زندہ و تازہ رکھتی ہے اگر اس مسئلہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت و زبان ایک چیز ہیں"۔ اب زبان کی ان خصوصیات پر نظر رکھیں تو صرف اردو اس کے اہل نظر آتی ہے اول تو اردو کا حلقہ اثر یوں بھی اتنا وسیع ہے کہ ملک کے ہر گوشے میں وہ کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے دوم اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ ملک کے کسی علاقے کے لئے بھی اجنبی نہیں ہو سکتی۔ اس میں پنجابی سندھی۔ پشتو۔ بلوچی اور بنگالی ہر زبان کے الفاظ بکثرت موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ گویا اردو پاکستان کی ایسی وسیع زبان ہے جو مخلوط ہونے کی وجہ سے ہر صوبہ اور ہر خطے کے لوگوں کے لئے جذب و کشش کا سامان رکھتی ہے اور اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ ملک کے داخلی نظم و ضبط اور افراد کے باہم میں جول۔ پاکستانی قومیت کے استحکام اور ملکی سالمیت میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ صرف داخلی مسائل نہیں بلکہ بیرونی ممالک سے رابطہ قائم کرنے اور دوسری قوموں تک پاکستان کی آواز پہنچانے میں بھی صرف اردو ایسی زبان ہے جو ہماری مدد کر سکتی ہے۔ اردو چونکہ بین المملکتی یا بین الاقوامی مزاج رکھتی ہے۔ اس لئے وہ نہ مغرب کے لئے اجنبی ہے نہ مشرق کے لئے۔ یورپ کے لوگ کئی صدیوں سے اس سے واقف ہیں۔ اور انہوں نے اس زبان میں بعض گرانقدر علمی و ادبی کارنامے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ اردو سے اہل مغرب کی دل چسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی زبان کے ایک فرانسیسی عالم گارسین دتاسی نے حالی، آزاد اور سرسید کے دور سے پہلے انیسویں صدی کے وسط میں اردو ادب کی تاریخ تین جلدوں میں مرتب کر دی تھی اسے ایک فرانسیسی خاتون ڈاکٹر لیلیان نذور نے اردو میں ترجمہ کرکے چند سال ہوئے کراچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی شعبے کے سربراہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کو بھی اردو سے غیر معمولی شغف تھا۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی کے منشا سے یہ کالج قائم ہوا اور گلکرائسٹ کی کوششوں سے اس میں اردو نثر کو خوب پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ چند دن بعد ۱۸۳۲ء میں اہل یورپ ہی نے اردو کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان قرار دیا۔ مولانا حامد حسن قادری مصنف "داستان تاریخ اردو" نے اس موضوع پہ ایک طویل باب رقم فرمایا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور وغیرہ نے یورپی مصنفین کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے "اُردو کے یورپین مصنفین" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے "یورپ میں تحقیقی مطالعے" کے عنوان سے اہل یورپ کی اُردو خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی تازہ کتاب جامع القواعد کے آغاز میں یورپین قواعد نگاروں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ غرض کہ اہل یورپ نے شروع ہی سے اردو زبان سے عملی دلچسپی لی ہے اور ہر موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ اس سرسری ذکر سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اہل مغرب اردو کے نام اور اس کی وسعت و جامعیت سے بیگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ برصغیر کی کسی اور زبان سے اتنا واقف نہیں جتنا کہ اردو سے۔ مشرقی ممالک اردو سے اور بھی قریب تر ہیں۔ سنگاپور سے لے کر جدہ تک اس زبان کو بولنے اور سمجھنے والے مل جاتے ہیں۔ پاکستان کے پڑوسی ممالک جن میں بھارت۔ افغانستان۔ ایران اور عرب وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں اردو جاننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے۔ ان میں اردو کو ادنیٰ توجہ کے ساتھ مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ فارسی و عربی الفاظ تو اُردو میں اس کثرت سے ہیں کہ اہل ایران و عرب کے لئے یہ زبان کچھ ایسی مشکل نہیں رہ جاتی۔ مختصر یہ کہ اُردو میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ وہ دنیا کے مختلف قوموں اور ملکوں کی توجہ کا مرکز اور سفارتی و خیرسگالی رابطوں کا ذریعہ بن سکے ان امور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو پاکستان کے داخلی و خارجی سیاسی مسائل کے حل میں کس درجہ مدد دے سکتی ہے۔ اور اس کی تعلیم و تدریس سے پاکستان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے بھی پاکستانی مدرسوں میں اردو کی تعلیم بہت ضروری ہے مذہب پاکستانی قومیت کا ایسا اہم جزو ہے جسے ذرا دیر کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ مذہب ہی تو تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے ہندوؤں سے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور پاکستان کے نام سے اپنے لئے ایک خودمختار مملکت کو جنم دیا چنانچہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے باشندوں میں جو بھائی چارہ اور باہمی ملاپ نظر آتا ہے۔ اس میں لاشعوری طور پر مذہب کو بڑا دخل ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہماری مذہبی قدروں اور روایتوں کو آگے بڑھانے اور پاکستانیوں کی عملی زندگی میں

انہیں بروئے کار لانے کا ذریعہ کیا چیز ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام کا فروغ صرف اردو کے ہاتھوں ہوا ہے۔ برصغیر میں قدم رکھتے ہی مسلمان صوفیاء کرام نے اردو کو مذہبی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ مذہبی تبلیغ و اشاعت میں انہوں نے شروع ہی سے اُردو سے مدد لی ہے۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اردو کی قدیم ترین تحریریں اور اُردو رسالے بالعموم مذہبی موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ برصغیر کے مسلمان قرآن کو عربی فارسی کے ذریعہ نہیں بلکہ اردو ترجموں اور تفسیروں کے ذریعے سمجھتے ہیں وہ اسی زبان میں زیادہ تر روزہ نماز کی نیتیں باندھتے ہیں اور اسی میں دعائیں مانگتے ہیں۔ اخلاقیات و عبادات، سیرت و مذہبی تاریخ۔ حدیث و فقہ، علم الکلام۔ اسلامی تہذیب اور تصوف پر جو قابل قدر کتابیں یا مقالے لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب اردو میں ہیں۔ اُردو میں ایسے قصیدوں اور مثنویوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کا موضوع حمد و نعت و منقبت ہے اور جنہیں اُردو ادب کا اہم جزو خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اسلامی تصوف اور تفکر کی اشاعت و تبلیغ کا زیادہ کام اُردو نظم سے لیا گیا ہے غرض برصغیر میں اسلامی طرز فکر۔ اس کے نظام حیات اور اس کی افادیت کا سکہ مسلمانوں کے دلوں میں اردو ہی نے بٹھایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک پاکستان کے سلسلے میں آخر آخر اُردو اور اسلام مسلمانوں کے لئے مترادف چیزیں بن گئی تھیں۔ انہوں نے اردو کو خطرے میں دیکھ کر یہ نعرہ لگایا تھا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اردو مٹ گئی تو ان کے مذہب کے نقوش و آثار بھی جلد مٹ جائیں گے اور مسلمان اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گے۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز قابل توجہ ہے اردو کی تعلیم و تدریس کے ذریعے اسلام کے اصل ماخذ قرآن اور اس کی زبان عربی کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن کے الفاظ کثرت سے اردو میں شامل ہیں چھوٹے بڑے عورت مرد۔ عالم جاہل سب انہیں بے تکلف روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ فاتحہ کو لے لیجئے اس میں حمد۔ للہ۔ رب۔ عالم (عالمین) رحمٰن۔ رحیم۔ مالک۔ یوم۔ دین۔ صراط مستقیم اور مغضوب وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو اردو پڑھنے والوں کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ اب اگر اس قسم کے الفاظ قرآن

سے چھانٹ کر اردو کے نصابی کتابوں میں بتدریج شامل کر دیئے جائیں تو اردو کے ذریعہ بہت سے عربی الفاظ سے پاکستانی طلبہ مانوس ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اردو اور عربی میں وہ ایک خاص قسم کا تعلق محسوس کریں گے۔ اس سے ان میں قرآن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔ عربی زبان سیکھنے میں انہیں آسانی ہوگی اور رفتہ رفتہ وہ قرآنِ حکیم و حدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔

اردو کا ثقافتی پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ ثقافتی کارناموں سے کسی قوم و ملک کی مادّی ترقی نہیں بلکہ ایسی روحانی۔ اخلاقی اور ذہنی ترقی مراد ہوتی ہے جس کی بنا پر کسی قوم کو دوسرے قوم کے مقابلے میں زیادہ خوش فکر۔ خوش مذاق۔ متمدن۔ شائستہ اور ذہنی طور پر بلند مرتبہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں فنون لطیفہ یعنی ادب۔ شاعری۔ موسیقی۔ مصوری اور ایسے علمی و فنی مشاغل شامل ہیں جو ان کی حسِّ لطیف اور ذوق جمال کو اُبھارنے اور سنوارنے میں مدد دیتے ہیں یہ ذہنی اور حسّی کارنامے کسی قوم کے ذہن۔ مزاج۔ سیرت۔ اخلاق اور ذوق طبع کا اندازہ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔ جو قوم ان فنون میں جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اور جتنا سرمایہ رکھتی ہے اسی قدر وہ متمدن اور مہذب خیال کی جاتی ہے۔ یہ بات قابل فخر ہے کہ پاکستانی قوم غیر معمولی ثقافتی ورثہ کی مالک ہے لیکن یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ اس ورثے کا زیادہ حصّہ اردو زبان میں ہے اس لئے اردو کا مطالعہ کئے بغیر نہ ہم اپنے بزرگوں کے ثقافتی و ادبی کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اور نہ ان میں کسی قسم کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ علم و فن۔ موسیقی۔ مصوری اور ادب و شاعری ہر شعبے کی ترقی کے لئے اردو سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب اور اقبالؔ کے کلام کے جو مرقع تیار کئے ہیں وہ اردو ادب اور مصوری دونوں کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ہماری کلاسیکل موسیقی بھی یکسر اردو کی رہینِ منت ہے۔ ٹپہ۔ ٹھمری، دادرا، گیت سب میں اردو کا دخل ہے رقص و سرود کی نجی محفلوں سے لیکر سینما اور تھیٹر ہال تک اردو کا بول بالا ہے۔ قوالی اور ریڈیائی نغموں سے ہماری دلچسپی دراصل اردو کی بدولت قائم ہے۔ یہی نہیں بلکہ فن مصوری اور فن موسیقی پر اردو میں بہت سی گراں قدر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ہمارے نئے موسیقار، فنکار اور مصور ان فنون میں جو مشق و مہارت حاصل کر رہے ہیں اس کا بھی اہم ذریعہ

یہی اُردو زبان ہے۔

اُردو کا ادبی و علمی پہلو مصوری و موسیقی سے بھی گرانقدر سرمایہ ہے اور نثر و نظم اور اس کے مختلف شعبوں نے گذشتہ چار سو سال میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ دنیا کی قدیم زبانوں کے مقابلے میں اُردو اگرچہ بہت کم عمر ہے لیکن ادبی حیثیت سے اس کا پلہ دنیا کی سینکڑوں زبانوں سے بھاری ہے۔ اردو میں افسانہ و ناول۔ تنقید و تحقیق۔ انشاء و حکایات۔ ڈرامہ اور شاعری کا ایسا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے کہ دنیا کی اکثر زبانوں کے مقابلے میں اسے آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ ایشیا میں بہت کم زبانیں ایسی ہیں جو معیار و مقدار کے لحاظ سے اُردو ادب کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ابتدا میں اُردو نے عربی و فارسی سے یقیناً بہت کچھ لیا ہے لیکن ادبی اور علمی حیثیت سے اس کا مرتبہ اب ان زبانوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ پاکستان مانا کہ نیا ملک ہے لیکن پاکستان کی مقبول ترین زبان اردو کئی سو سال پرانی ہے۔ اس میں ہمارے بزرگوں کے ذہنی و حسی کارناموں کی تاریخ محفوظ ہے۔ اس کی بدولت ہم اپنے آپ کو ایک نہایت متمدن اور ترقی یافتہ قوم کا جانشین خیال کرتے ہیں اور اسی کی بدولت پاکستانی قوم کا شمار شائستہ و مہذب قوموں میں کیا جاتا ہے۔ اگر اردو زبان نہ ہوتی تو ہمارے پاس اعلیٰ درجے کے ایسے ادبی شاہکار نہ ہوتے جو بین المملکتی اور بین الاقوامی ادبی حلقوں میں ہماری نمائندگی کر سکتے۔ اب جبکہ پاکستان نے اسے قومی زبان قرار دیدیا ہے اس کی اہمیت غیر معمولی ہو گئی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق "قومی زبان کی اہمیت اور قوتِ اثر کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ۔ ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرہ کی ہر ہر ترکیب ہماری تہذیب ہمارے ادب اور ہمارے معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہونچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ و تہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہمارے اسلاف کی صدہا سال کی دماغی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی کاوشوں کا نتیجہ ہے اس زبان نے جسے ہماری قومی زبان ہونے کا فخر ہے ہر دور میں زمانے کا ساتھ دیا ہے اور ادبیات معاشرت و سیاست و علم و فن کی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کیا اور کبھی اس کی طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی" ان مباحث سے اردو کی ثقافتی و تہذیبی اہمیت کا کم و بیش اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن محض اس کے کارناموں پہ فخر کرنے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کے موجودہ ادبی ذخیرے کو روز بروز بڑھایا جائے۔ اس کی توسیع و اشاعت کی عملی صورتیں نکالی جائیں۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ جس طرح

پاکستان مادی ترقی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس طرح فنون لطیفہ اور اس کی اہم ترین شاخ ادب و شاعری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ رہ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اُردو کو نصاب تعلیم میں وہ مقام عطا کیا جائے جس کی وہ دراصل مستحق ہے۔

ہماری معاشرتی زندگی میں تو اردو اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ اسے ہم ایک لمحے کے لئے بھی اپنے گرد و پیش سے الگ نہیں کر سکتے۔ پشتو، سندھی، بلوچی اور پنجابی سب، اپنے اپنے حلقوں سے نکل کر دوسروں کے لئے اجنبی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اُردو ہر صوبے اور ہر علاقے میں کم و بیش سمجھی اور بولی جاتی ہے پاکستان کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے سمجھنے اور بولنے والے کثیر تعداد میں موجود نہ ہوں گویا اردو پاکستان کی واحد زبان ہے جو بہ حیثیت مجموعی پاکستانی شہریوں کے باہم تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔ دفتروں، ملوں اور کارخانوں سے لے کر صنعت و حرفت و تجارت و عدالت کے ایوانوں تک اس کا دخل نظر آتا ہے۔ شہر و دیہات و قصبات، مدرسہ، خانقاہ، سینما اور بازار کونسی جگہ ایسی ہے جہاں اس کا گذر نہ ہو۔ ناچ گانوں کے عوامی مجمع سے لے کر خواص کی محفلِ سماع تک میں اسے یکساں باریابی حاصل ہے۔ شعر و ادب کی مخصوص نشست ہو یا پبلک مذاکرہ و مشاعرہ، وعظ و پند کی نجی صحبتیں ہوں یا مولویوں کے کھُلے مناظرے ہر جگہ اس سے برابر مدد لی جاتی ہے۔ یہی زبان ہے جو بے تکلف دوستوں کی صحبتوں کو چٹکلے، اور لطیفے سُنا کر قہقہوں پر آمادہ کرتی ہے اور یہی زبان ہے جو سنجیدہ صحبتوں میں شائستگی و ادب قائم رکھتی ہے۔ اسی زبان میں ہم عام طور پر باتیں کرتے ہیں۔ اسی میں لکھتے پڑھتے ہیں اور اسی میں غور و فکر کرتے ہیں۔ اسی زبان میں ہم خط و کتابت کرتے ہیں اور اسی میں ہمارے اخبار و رسالے نکلتے ہیں یہ ہماری کاروباری زبان بھی ہے اور علمی و ادبی بھی۔ اسی میں ہم لین دین کے معاملات اکثر طے کرتے ہیں اور اسی زبان میں تصنیف و تالیف کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہی زبان سندھی، بنگالی، پنجابی، پشتو اور بلوچی بولنے والوں کی مشترکہ محفل میں ایکدوسرے سے تعارف کا ذریعہ ہے۔ اسی زبان میں تقریر و تحریر کے ذریعے ہماری قومی آواز پاکستان سے باہر دوسرے ملکوں تک پہونچتی ہے۔ غرض شادی بیاہ کی چہل پہل اور رنگ رلیوں سے لیکر تعزیتی جلسوں کے نالہ و شیون تک یہی زبان ہماری دمسازی و ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے اور یک زبانی و یک خیالی کا ذریعہ بن کر پاکستانی قومی شیرازہ کو بکھرنے سے بچاتی ہے۔ اردو کی یہ معاشرتی خصوصیت

کچھ نئی نہیں ہے۔ برصغیر کی معاشرت میں اس کا شروع سے گہرا دخل رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندوستانی شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے اُردو کے متعلق لکھا تھا کہ :-

"یہ ایک مشترکہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے باشندے اکثر جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں اس بیان کی صداقت کی تائید میں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی، ڈنمارکی، عرب، ترک، یونانی، ایرانی، مغل اور چینی بھی جو اکثر باہم ہندوستانی (اُردو) میں بات چیت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اپنی زبان کے مقابلے میں ہندوستان کی یہ ہر دلعزیز زبان زیادہ سہولت بخش ہے عام طور پر خانگی، تجارتی اور اہم سیاسی معاملات کے متعلق مراسلات اسی زبان میں کی جاتی ہے۔ دیسی علماء کا درس اور مضامین ادب پر ان کی بحثیں اور اور دلائل اسی زبان میں دی جاتی ہیں اور ہر حالت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی ہندوستان کا کوئی باشندہ اپنے خیال یا مضمون کو کسی دوسری زبان میں لکھتا یا ترجمہ کرتا ہے تو وہ ہمیشہ اپنے معاملات کو ہندوستانی (اُردو) میں ترتیب دیتا ہے اور اپنا مفہوم اسی زبان میں ادا کرتا ہے۔ سوداگر، ملّا، پادری، فلسفی، طبیب، سیاح، وکیل غرض ہر شخص کے لئے جو ہندوستان میں کسی قسم کا بھی کوئی کام کام کر رہا ہے یا یہاں امن و خوشی سے رہنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی زبان بہ نسبت کسی دوسری زبان کے عموماً نہایت ضروری اور مفید ہے یہ نہایت کارآمد زبان ہے جس پر ہندوستان جائز فخر کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ ہندوستان کی سب سے زیادہ عام فہم زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملاؤں اور دیگر متعلقین

سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے نحوی اصول
کے ساتھ اسے جسقدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے جس طرح
یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے بعض جدید اور قدیم زبانوں
کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان
میں سنسکرت فارسی عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہے۔ لیکن
ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں ہر شخص کے لئے ہندوستانی (اردو)
کا جاننا ایسا ہی ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لئے انگریزی کا
جاننا"۔

اسی طرح ایک دوسرے مستشرق گارسیں دتاسی نے اپنی "تاریخ ادب ہندوستانی" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:۔

"..... ہندوستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی (اُردو) سب سے
زیادہ وسیع البیان اور لچکدار زبان ہے اور اس کا جاننا سب سے زیادہ
سودمند ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان استعمال ہوتی ہے' شمالی
ہند اور شمالی علاقے کی عدالتوں اور دفتروں میں جب سے فارسی کی جگہ اُردو
استعمال ہونے لگی ہے اس نے اور زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے"۔

ان امور سے اُردو اور پاکستان میں اس کی تدریس و تعلیمی اہمیت کے متعلق اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔ اردو ہماری ثقافتی، علمی و ادبی معاشرتی و معاشی اور مذہبی و سیاسی اور عملی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور اسے نظر انداز کرکے ہم اپنی قومی خصوصیات کو برقرار نہیں رکھ سکتے ــــ یہ مانا کہ اُردو ہمارے نظام تعلیم میں تدریسی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے اور کراچی و پنجاب کے ثانوی مدرسوں میں اس سے ذریعہ تدریس کا بھی کام لیا جا رہا ہے لیکن اب جبکہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے دیا گیا ہے اس کی تعلیم و تدریس کی جانب بطور خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تدریسی مضمون کی حیثیت سے تو وہ برسوں سے ہمارے نظام تعلیم میں داخل ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں رواج دیا جائے اور ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ تعلیمی منزلوں تک اس کو ذریعہ تدریس قرار دیا جائے

اُردو سارے پاکستانیوں کی مادری زبان نہ سہی پھر بھی بعض وجوہ سے اس کی حیثیت مادری زبان سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ اس کا حلقۂ اثر کسی خاص فرقے یا رقبے تک محدود نہیں ہے وہ ملک کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک سمجھی اور بولی جاتی ہے اس میں ہر قسم کے جذبات و خیالات ادا کرنے اور ابتدائی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹی تک ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ اس لئے اُردو کو پاکستان میں بمنزلہ مادری زبان خیال کرنا چاہیئے۔

یہ بات خوش آیند ہے کہ نئی عوامی حکومت اُردو کی قومی اہمیت کو محسوس کر رہی ہے، قومی اسمبلی نے اسے ملک کی قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے اور مرکز میں انگریزی کی جگہ اسے جلد رائج کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان اور صوبہ پنجاب کی حکومتوں نے اسے اپنے صوبوں کی سرکاری زبان بنا کر عملاً اُردو میں کام بھی شروع کر دیا ہے۔ صوبہ سندھ میں سندھی اور اُردو دونوں کو ساتھ ساتھ فروغ دینے کے اقدامات کئے گئے ہیں اور اُردو کی قومی برتری کو برقرار رکھا گیا ہے۔ کاش! حکومت کی یہ کوششیں اس سلسلے میں تیز تر ہو جائیں اور ہماری قوم کو غیر ملکی زبانوں کی غلامی سے نجات مل جائے۔

اُردو اور علاقائی زبانیں

اردو اپنے نظامِ صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور مقامی بولیوں ہی کے الفاظ نہیں دنیا کی بیشتر زبانوں کے الفاظ کم و بیش شامل ہیں۔ لیکن آوازوں کے اختلاط اور الفاظ کے ارتباط کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اُردو اپنی ساخت اور مزاج میں کسی خاص زبان کی تابع یا مقلد ہے اس نے خام مواد یعنی گارا چونا اصوات و الفاظ کی شکل میں یقیناً ادھر ادھر سے لیا ہے لیکن اس کی تعمیر مخصوص تاریخی حالات کے تحت اپنے طور پر طبعی انداز میں ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رنگ روپ رعنائی و صناعی، روزمرہ، محاورہ، طرزِ ادا اور الفاظ کی ایجاد و استعمال کے لحاظ سے اپنا منفرد وجود رکھتی ہے۔ حرف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، تذکیر و تانیث کے قاعدے، واحد و جمع کے اصول، صحت تلفظ اور الفاظ کے استعمال تک سب میں اس کا اپنا مخصوص معیار و انداز ہے۔ اس لئے اُردو کو کسی خاص زبان کے آئینے میں دیکھنا مناسب نہ ہوگا بلکہ ہر لفظ کے تلفظ معنی اور استعمال کی صحت کے سلسلے میں اس کے اصل ماخذ کے بجائے اُردو ہی کی لغت اور اُردو ہی کے مستند ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں سے رجوع کرنا مفید ہوگا۔

انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں اب سے تقریباً دو سو سال پہلے اُردو کی صحت کا یہی معیار قائم کیا تھا۔ ان کے خیال میں :—

> "جو لفظ اُردو میں مشہور و مستعمل ہوگیا خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی یا پنجابی یا پوربی۔ اپنے اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح وہ لفظ بہر حال اُردو ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے

خلاف ہو تو بھی صحیح ۔ اس کا غلط و صحیح ہونا اُردو کے استعمال پر منحصر ہے
اس لئے کہ جو لفظ اُردو کے مزاج کے موافق نہیں غلط ہے ۔ خواہ اصل کے
لحاظ سے درست کیوں نہ ہو ۔ اور جو چیز اُردو کے مزاج کے موافق ہے وہ صحیح ہے
خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو"

اس اصول سے صاف ظاہر ہے کہ انشاءاللہ خاں نے اردو کے مزاج کے تعین کے سلسلے میں جو اہمیت مقامی آب و رنگ ۔ مقامی تمدن ۔ مقامی مؤثرات اور مقامی بولیوں کو دی ہے وہ دوسری زبانوں کو نہیں دی ۔ ان کے نزدیک اگرچہ اُردو نے باہر کی زبانوں کا گہرا اثر قبول کیا ہے ۔ خاص طور پر علمی و ادبی کاموں کے سلسلے میں اس نے الفاظ کا زیادہ ذخیرہ عربی و فارسی ہی سے لیا ہے ۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا رنگ روپ اور خمیر و مزاج مقامی ہی رہا ہے اور اسی مقامیت نے اسے عربی و فارسی سے الگ اپنی انفرادیت قائم کرنے میں مدد دی ہے ۔ اس انفرادیت میں جتنا ہاتھ مقامی اور علاقائی زبانوں کا ہے اتنا باہر کی زبانوں کا نہیں ہے ۔ بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے ۔

عربی و فارسی اور اُردو کے علمائے زبان نے ذخیرہ الفاظ کو بلحاظ قواعد تین خاص گروہوں میں تقسیم کیا ہے ۔

۱۔ اسم (NOUN)

۲۔ فعل (VERB)

۳۔ حرف (PREPOSITION)

ان میں صرف اسم کا ذخیرہ ایسا ہے جس میں مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی ۔ فارسی ترکی اور دوسری زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت شامل ہیں ۔ لیکن "فعل" جسے زبان میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کے بغیر بامعنی فقرہ وجود میں نہیں آسکتا اس کی نوعیت اسم کے ذخیرے سے بہت مختلف ہے اُردو کے سارے افعال اور ان کے مصادر مثلاً پڑھنا، لکھنا، سونا، جاگنا ۔ اُٹھنا ۔ بیٹھنا اور کھانا پینا وغیرہ یکسر مقامی ہیں یہی کیفیت "حرف" یا پری پوزیشن (PREPOSITION) کی ہے اُردو میں عام طور پر استعمال ہونے والے سارے حرف جار مثلاً نے، کو، سے، میں، تک، ساتھ وغیرہ بیرونی نہیں مقامی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں اردو میں فعل اور حرف کی یہ مقامیت ظاہر کرتی

ہے کہ اُردو کا حقیقی اور اساسی تعلق باہر کی زبانوں سے نہیں علاقائی زبانوں سے ہے۔ یہ تعلق آج کا نہیں صدیوں پرانا ہے۔ اس کی داغ بیل برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد ہی کے وقت بلکہ بعض کے نزدیک اس سے بھی پہلے پڑ گئی تھی۔

اب یہ خیال فرسودہ ہو چکا ہے کہ اُردو کسی خاص جگہ، خاص وقت میں کسی خاص گروہ کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ زبان کی پیدائش کا مسئلہ افراد کی پیدائش سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ زبان فطرت کے تقاضوں کے مطابق انجانے طور پر بنتی رہتی ہے اور صدیوں کے بعد جب وہ کسی خاص شکل میں نمودار ہونے لگتی ہے اس وقت ہمیں اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے اس لئے کسی زبان یا اُردو کے متعلق یہ حکم لگانا کہ وہ فلاں وقت، فلاں جگہ یا فلاں شہر میں پیدا ہوئی محض ایک بے معنی سی بات ہے علمی انداز پر اُردو کی پیدائش کے خواہ کتنے ہی نظریئے کیوں نہ قائم کرلئے جائیں لیکن اُردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے لفظوں میں اتنی بات تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ

"یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے۔"

اسے حسنِ اتفاق کہہ لیجئے کہ برِصغیر کے جس علاقے میں مسلمان پہلے پہل داخل ہوئے اور جس میں اُردو کا اولین خمیر تیار ہونا شروع ہوا اس کا نام آج مغربی پاکستان ہے۔ مغربی پاکستان میں اس وقت جو زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں اُردو۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی اور پشتو وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اُردو کو اپنی ہمہ گیری اور وسعت اثر کے لحاظ سے قومی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ باقی علاقائی زبانوں کے زمرے میں آتی ہے یہ سب زبانیں ایک مدت سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں اور تقریباً ایک قسم کی آب و ہوا اور ایک ہی قسم کے تاریخی و تہذیبی ماحول میں پروان چڑھی ہیں۔ ان سب پر عربی و فارسی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا غلبہ رہا ہے یہ برسوں سے ایک دوسرے کا اثر قبول کررہی ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈال رہی ہیں ان میں الفاظ اور خیالات کے باہم لین دین کا تعلق آج سے نہیں صدیوں سے قائم ہے لیکن اب جبکہ اُردو کو مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو اور علاقائی زبانوں کے اس تعلق کو زیادہ سے زیادہ موثر و مستحکم بنایا جائے اس لئے کہ پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لئے یہ تعلق آج جتنا ضروری ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

اُردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق کو استوار کرنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے

اُردو کے جو ادیب و شاعر۔ علاقائی زبانیں نہیں جانتے وہ ان کی طرف بطورِ خاص توجہ کریں۔ اگر اصل زبانوں سے استفادہ کرنے میں دشواری ہو تو اُردو یا انگریزی ترجموں کی معرفت علاقائی زبانوں کے ثقافتی اور ادبی ذخائر سے فائدہ اُٹھائیں جو لوگ اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی یا پشتو وغیرہ سے بھی واقف ہیں وہ اخذ و ترجمہ کے ذریعے اُردو کو علاقائی زبانوں سے متعارف کرائیں اس سے قومی اور علاقائی دونوں زبانوں کو فائدہ پہونچے گا اُردو کا دامن وسیع ہوگا۔ اس میں موضوع و مواد کی رنگا رنگی آئے گی۔ مقامی ثقافت کی نمائندگی و ترجمانی کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اور قومی زبان کی حیثیت سے وہ علاقائی زبانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن جائے گی۔ مختلف علاقوں کے لوگ جب اپنی علاقائی بولیوں کے اثرات و نقوش کو قومی زبان میں دیکھیں گے تو وہ فطرتاً اس کی طرف لپکیں گے۔ اس طرز عمل سے علاقائی زبانیں بھی گھاٹے میں نہ رہیں گی۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی۔ پشتو اور سرائیکی وغیرہ ابھی تک اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ نتیجتہً ان زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ اثر اتنا وسیع نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ لیکن اگر علاقائی ادب کے کارآمد پہلوؤں کو اُردو میں اور اُردو کے مفید عناصر کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی شعوری کوشش کی جائے تو پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی اور پشتو کے ادیبوں کا حلقہ اثر خاصا وسیع ہو سکتا ہے۔

یہ مانا کہ اُردو میں علاقائی زبانوں کے بکثرت الفاظ شامل ہیں اور علاقائی زبانوں کے برعکس اُردو کا حلقہ اثر بھی ملک گیر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبولِ عام اور اس کے ادب کو پاکستانی ثقافت و قومیت کا متحمل بنانے کے لئے اس میں علاقائی زبان و ادب کی اہم روایات و اقدار کو کیوں نہ داخل کیا جائے۔ مختلف علاقوں کے تاریخی مقامات، تہذیبی مراکز، دریا، پہاڑ، پھول پھل، باغ و راغ، ندی اور جھیل، قصے کہانیاں، رسم و رواج، پیر فقیر اور صوفی و شاعر سب کو بطور تلمیح و مثال اُردو نثر و نظم میں جگہ کیوں نہ دی جائے۔ جب عربی و فارسی سے گل و بلبل، لیلیٰ مجنوں۔ یوسف زلیخا۔ شیریں فرہاد۔ رستم و سہراب، وامق و عذرا، محمود و ایاز، سکندر و دارا، دجلہ و فرات اور اصفہان و شیراز کے طرز کی ہزاروں تلمیحیں ہزاروں اصطلاحات اور سینکڑوں اُردو میں جگہ پا سکتی ہیں اور سنسکرت و ہندی سے چاند چکور راون و سیتا، رام و لچھمن، بھیم و ارجن، گنگا جمنا، تربینی، پاربتی، شکنتلا۔ کرشن کنھیا۔ گوکل، گوپی، کام سروپ۔ گوبر گنیش۔ رام لیلا اور ہولی دیوالی وغیرہ جیسے الفاظ و تراکیب اپنائی جا سکتی ہیں تو پھر ہیر رانجھا، سسی پنوں، لیلا چنیسر

عمر ماروی، مرزا صاحباں، شالیمار، راوی، چناب، ستلج، وسنارھ، شاہی مسجد، شہید مینار، بھیو و اسلم، سچل سرمست، شاہ لطیف، بھلے شاہ، رحمٰن بابا، خوش حال خاں خٹک، داتا کی نگری، زیارت اور ہنٹ، خیبر اور سوات وغیرہ کو اُردو میں بطور تلمیح یا اصطلاح رواج کیوں نہ دیا جائے جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اُردو نہ تو صحیح معنوں میں پاکستانی تہذیب اور قومیت کی ترجمانی کا حق ادا کر سکے گی اور نہ اُس کے ادب کو پاکستانی ادب کی حیثیت سے الگ پہچانا جا سکے گا۔ گہرا مقامی رنگ ہی اسے دوسرے ملکوں کے ادب سے الگ کر سکتا ہے۔

ایک مفید کام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علاقائی زبانوں کی ساری مقبول عام کہانیاں خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں اُردو میں منتقل کی جائیں اور ان کہانیوں کے ممتاز کرداروں کو اُردو زبان و ادب کے رموز و علائم میں داخل کیا جائے۔ علاقائی زبانوں میں افسانوی ادب کا بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے کے بعض اجزا۔ مصحفی و انشا کے زمانے ہی میں غیر معمولی شہرت پا چکے تھے تبھی تو انشاء اللہ خاں نے ہیر رانجھا کی داد اس طور پر دی ہے۔

سُنا یار ات کو قصہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

علاقائی زبانوں میں اس طرح کی اور نہ جانے کتنے منظوم افسانے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ سسی پنوں کی داستان نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان کے باہر بھی مقبول ہوئی ہے۔ پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں میں اسے ایک بار نہیں کئی بار نظم کیا گیا ہے۔ سندھی زبان میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور پنجابی میں ہاشم شاہ کی بدولت اسے جو قبول عام حاصل ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پشتو میں بھی اسے نظم کیا گیا ہے اور متعدد فارسی شعرا نے بھی اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ہندوستان کے شمالی اور پوربی علاقے بھی اس داستان سے بے خبر نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے اُردو کے شعرا نے عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی کہانیوں کو جس انہماک کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا ہے وہ انہماک علاقائی زبانوں کے سلسلے میں نظر نہیں آتا پھر بھی قدیم شاعروں میں سے بعض نے اس طرف توجہ کی ہے مثلاً قلندر بخش جرأت کے شاگرد نواب محبت خاں نے اب سے دو سو سال پہلے ۱۱۹۷ھ میں سسی پنوں کو "اسرار محبت" کے نام سے مثنوی کی صورت میں نظم کیا تھا۔ اس مثنوی کا ایک صاف ستھرا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے

کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ مثنوی ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ ضرورت اس بات کی اس مثنوی کو مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ یہ کام اُردو کا ہر ادیب کرسکتا ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ وہ لوگ اس طرف رجوع کریں جو علاقائی زبانوں پر بھی پوری دسترس رکھتے ہوں تاکہ وہ یہ بھی بتاسکیں کہ اس اُردو مثنوی کا حقیقی ماخذ کیا ہے اور اصل قصے سے اس میں کس حد تک انحراف یا اتباع پایا جاتا ہے۔

علاقائی زبانوں کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی اسی انداز سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک اہم پہلو پاکستانی ثقافت کی تشکیل و فروغ کا ہے۔ یہ پاکستانی ثقافت سندھ۔ سرحد۔ بلوچستان اور پنجاب کے ثقافتی ورثوں کے امتزاج و اشتراک ہی سے وجود میں آسکتی ہیں۔ چونکہ پاکستان کی ساری علاقائی ثقافتیں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمان صوفیاء کرام کی آغوش کی پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ فروعات میں ایک دوسرے سے خواہ کتنی ہی مختلف کیوں نہ نظر آئیں لیکن رُوح کے اعتبار سے ان میں بڑی مماثلت ہے۔ ان مماثل پہلوؤں کو تلاش کرکے انہیں یک جا کرنے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اس ہم آہنگی کے بغیر پاکستانی ثقافت کا تصور خواب وخیال سے آگے نہ بڑھ سکے گا اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے علاقائی ثقافتوں کے سب سے قوی عنصر علاقائی زبانوں کا سہارا لینا ہوگا اگر زبانوں میں یکرنگی و ہم آہنگی کے آثار پیدا ہوگئے تو یہ آثار علاقائی ثقافتوں کو خود بخود ایک خاص رشتے میں پرودیں گے۔ یہ کام ادبی اور تعلیمی دونوں سطح پر ہونا چاہئے۔ ہماری جامعات میں ایم۔ اے اُردو کے نصاب میں ایک پرچہ "اُردو کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر" کے عنوان سے ہوتا ہے اس میں ہندی و فارسی شاعری کی تاریخ اور بعض ملی تحریکات پڑھائی جاتی ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ اس پرچے میں علاقائی زبانوں کے ادب و فنون لطیفہ کی تاریخ اور مختلف صوبوں کے بعض بزرگانِ دین و صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ بھی شامل کرلیا جائے اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی نئی نسل اُردو کے ساتھ اپنے ملک کے سارے ثقافتی ورثوں سے کم و بیش واقف رہے گی اور پاکستانی ثقافت کا تصور قائم کرنے میں اسے آسانی ہو جائے گی۔

ایک اور پہلو اس سلسلے میں قابل توجہ ہے ہمارے ہاں دخیل الفاظ کے سلسلے میں ابھی تک زیادہ تر صرف عربی و فارسی ہی کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہر قسم کی اصطلاحات ہر قسم کے نئے الفاظ اور ہر قسم کے انگریزی الفاظ کے تراجم کے لئے عربی و فارسی ہی کا سہارا لیا جاتا ہے اس رجحان کے نتیجے میں بہت سے

ثقیل اور بے ڈھنگم الفاظ اُردو میں داخل ہو رہے ہیں حالانکہ اگر کوشش کی جائے تو ان سے زیادہ سبک و شیریں متبادل الفاظ علاقائی زبانوں میں مل سکتے ہیں مقامی صنعت و حرفت زراعت و باغبانی کھیل کود، عدالت و پنچائت، آداب مجلس اور کاروبار وغیرہ کے سلسلے کے ہزاروں الفاظ علاقائی زبانوں میں ہوں گے۔ جنہیں اردو میں اپنا کر انگریزی الفاظ کے تراجم میں مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اُردو والوں نے اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی۔ نتیجۃً اُردو اور علاقائی زبانوں کا ناتا روز بروز مضبوط ہونے کے بجائے کمزور ہوتا چلا گیا ہے۔ اب اس ناتے کو استوار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سے قومی زبان کے جسم میں نیا خون دوڑے گا اور اُردو کو ہر صوبے، ہر علاقے میں اور ہر سطح پر رواج دینے میں آسانی ہو جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اُردو کے ادیب اور شاعر علاقائی زبانوں کی طرف سے یکسر غافل نہیں رہے۔ انہوں نے حکومت کی مسلسل بے اعتنائیوں کے باوجود اُردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق کی نوعیت و اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام بھی ہوا ہے۔ پنجابی اور اُردو کے تعلق پر سب سے اہم کتاب پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" ہے یہ پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں کالا سنگھ بیدی نے اُردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر تحقیقی کام کر کے دہلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں منیر فاروقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں اس موضوع پر مزید تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ان کا کام تکمیل کو پہونچنے والا ہے۔ پنجابی ادب کے عنوان سے بھی اُردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ سب اُردو اور اہل اُردو کے لئے بہت مفید ہے۔ پنجاب کے ادیب و شاعر چونکہ پنجابی اور اردو دونوں سے واقف ہیں اور دونوں میں لکھتے ہیں اس لئے ان کی تحریروں سے لاشعوری طور پر دونوں زبانوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے۔

سندھی اور اُردو کے لسانی تعلق پر علامہ سید سلیمان ندوی کے مقالات خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اُردو سندھی کے لسانی روابط پر ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تازہ کتاب قابل مطالعہ ہے یہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور نے شائع کی ہے اور سندھ یونیورسٹی کے اُردو شعبہ نے اس کام پر مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ سندھ کے صوفی شعراء میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست

نے اُردو خواں طبقے کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری کے بارے میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے ہیں۔ کتابیں بھی مرتب کی گئی ہیں اُردو کے بعض شعرا نے ان کے افکار و خیالات اور منظومات کا اردو نثر و نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ سندھی زبان کے کئی ایسے شاعر ہیں جو اُردو میں بھی خوب کہتے ہیں اور ان کی کوششوں سے اُردو سندھی دونوں ایک دوسرے سے قریب آ رہی ہیں۔

اُردو سے سرحد کی زبان پشتو کا رشتہ بھی بہت قدیم ہے۔ رام پور ٹونک اور بندیل کھنڈ کے دور دراز علاقوں تک کی اُردو پر پشتو کا اثر پایا جاتا ہے۔ پشتو نے اُردو سے اور اُردو نے پشتو سے بہت کچھ لیا ہے۔ اس لسانی لین دین پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مقالہ پشتو اور اُردو خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ سرحد کے ادیب و شاعر بھی عموماً پشتو اور اُردو دونوں کے ادب کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کے ہیں ان کی تحریروں کی بدولت اردو اور پشتو کو ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع مل رہا ہے۔ پشتو ادب کے متعلق اردو میں مضامین کی صورت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے "پشتو" نے "پشتو لوگ گیت" "پشتو ادب" اور "خوش حال خاں خٹک" کے نام سے کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کتابوں کی معرفت اُردو خواں طبقے کو پشتو ادب سے آگاہی اور شناسائی میں خاصی سہولت ہو گئی ہے۔

بلوچی اور سرائیکی کے رشتے بھی اُردو کے ساتھ بہت پرانے ہیں۔ بلوچی اور اُردو میں ہزاروں الفاظ مشترک ہیں اور فارسی کے زیر اثر دونوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی نظر آتی ہے بلوچی کے ادیبوں میں بھی کئی ایسے ہیں جو اُردو بلوچی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں ان کی کوششیں دونوں زبانوں کے حق میں مفید ہیں۔ اُردو بلوچی کے تعلق اور بلوچستان میں اردو کی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اُردو کو مختلف علاقائی زبانوں سے بیک وقت ہم آہنگ کرنے اور اسے پاکستان کے مختلف صوبوں میں مقبول بنانے کا کام بھی شروع ہوا ہے اس سلسلے کا سب سے اہم اور قابل ذکر کام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ہے۔ ان کی کتاب "بنیادی اُردو" جسے اُردو کے بنیادی الفاظ کا لغت کہنا

چاہیے۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ سندھی، پنجابی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اس کے تراجم طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ لسانی مطالعات پر مبنی ڈاکٹر سہیل بخاری کے بعض مضامین اور ان کی نئی کتاب "اُردو کا روپ" بھی اس سلسلے میں بہت کارآمد ہیں۔

عرصے سے اُردو اور علاقائی زبانوں کے رشتوں پر کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اب جبکہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں اُردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے اپنایا جا رہا ہے۔ کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ہر علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کو عموماً نہیں خصوصاً اس طرف متوجہ ہونا چاہیے زبان کسی خاص علاقے یا طبقے کی میراث نہیں ہوتی جو لوگ اور جہاں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں وہی اس زبان کے حقیقی وارث و مالک ہوا کرتے ہیں۔ اُردو کسی وقت لکھنؤ اور دلّی کی زبان رہی ہو گی لیکن ہمیں اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اب لکھنؤ یا دلّی کی زبان نہیں رہی۔ اب وہ لاہور، کراچی کوئٹہ، حیدرآباد، پشاور، پنڈی اور سرگودھا وغیرہ کی زبان ہے۔ یہیں کے لوگوں نے اسے اپنایا ہے یہیں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں۔ یہیں کے لوگوں کے ہاتھوں وہ آگے بڑھے گی اور یہیں کے لوگوں کے زیرِ اثر اس پر ایک نیا رنگ چڑھے گا یہ رنگ علاقائی زبانوں اور علاقائی تہذیبوں کا ہو گا۔ یہی رنگ پختہ ہو کر اُردوئے معلیٰ بنے گا اور اُردو کا مستند اسلوب کہلائے گا۔

تدریسِ اردو کے عناصرِ اربعہ

کسی مضمون کی کامیاب تدریس کے لیئے اس کے چار عناصر مدرسہ[1]، معلم[2]، نصاب[3]، اور طریقہ کار[4] خاص طور پر قابل توجہ ہوتے ہیں۔ بچے کی تعلیمی کامیابی کا دارومدار دراصل انہی چار چیزوں پر ہے۔ مدرسے کی خوشگوار و مانوس فضا، معلم کی شفقت و لیاقت، نصاب کی جاذبیت و جامعیت، اور طریقہ کار کی سادگی و جدت ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر کسی قسم کی تعلیم یا تدریس موثر نہیں ہو سکتی۔

۱۔ مدرسہ یہ صحیح ہے کہ ماں کی گود اور بچے کا گھر تعلیم کے اولین گہوارے ہیں، ان کی اہمیت مسلم ہے اور وہ بچوں کی آئندہ تعلیم و تربیت پر گہرا اثر بھی ڈالتے ہیں۔ لیکن عام اصطلاح میں جسے تعلیم کا نام دیا جاتا ہے، چونکہ وہ یکسر مدرسے سے تعلق رکھتی ہے اس لئے ہم گھر کی تعلیم و تربیت کو نظر انداز کرکے اس جگہ صرف مدرسے کی اہمیت کا ذکر کریں گے۔ مدرسہ دراصل ایک ایسے معاشرے کا نام ہے جس میں بچوں کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو ابھارنے اور بروئے کار لانے کی پہلی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس معاشرے کی مدد سے چھ سات سال کی عمر کے بچے کو پہلی مرتبہ رسمی تعلیم و تربیت کی طرف راغب کیا جاتا ہے اس سے پہلے وہ گھر میں جو کچھ سیکھتا ہے، کسی اصول یا نظام کے ماتحت نہیں سیکھتا علاوہ ازیں چونکہ ہر بچے کے گھر کا تعلیمی و تربیتی ماحول مختلف ہوتا ہے، اس لئے بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے یا ان کا کوئی معیار متعین کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس کام کی مناسب جگہ مدرسہ ہے۔ جہاں بچوں کی انفرادی و اجتماعی نفسیات اور مفید سے مفید طریقہ کار کی مدد سے بچوں کو یکساں ماحول میں رکھ کر ان کی ذہنی و جسمانی ترقی کے مواقع فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ موازنہ و مقابلہ کی مدد سے ہر بچے کی انفرادی صلاحیت کو پرکھنے اور اسے آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنے کا جیسا پاکیزہ اور منظم ماحول یہاں ملتا ہے وہ گھر میں بچے کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ رسمی تعلیمی ادارہ یا معاشرہ، جسے مدرسے کا نام دیا گیا ہے، بچوں کے لیئے جس قدر جاذب نظر

دلچسپ اور دلکش ہوگا، تعلیمی نقطۂ نظر سے اسی قدر کامیاب ہوگا۔ اگر یہ ادارہ یا معاشرہ بچوں کی جبلتوں، ان کی خواہشوں اور ان کے رجحانات و جذبات کو ملحوظ رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے، تو بچے یقیناً اس سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر مدرسے اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ہمارے بچے پہلے پہل مدرسے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کام کا بوجھ، وقت کی پابندی اور معلم کی سختی کی بعض روایات ہمارے معاشرے میں اس طرح جگہ پا گئی ہیں کہ بچے بالعموم مدرسے کے نام سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی انہیں سمجھا بجھا کر یا ڈانٹ ڈپٹ کر مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا ہے ان کی عمر اس وقت چھ سال ہوتی ہے ہر چند کہ مدرسے میں ان کے ہم عمروں اور ہم جولیوں کی تعداد گھر کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے پھر بھی بہت دنوں تک بچے مدرسے کی فضا سے مانوس نہیں ہو پاتے۔ بات یہ ہے کہ معلم، مدرسہ اور ماحول سب کے سب اجنبی ہوتے ہیں۔ وقت پر کام مکمل کرنے کا حکم، ہر کام میں وقت کی پابندی کا لحاظ اور معلم کا رعب داب انہیں اور بھی مضمحل بنا دیتا ہے وہ خاموشی اور حیرت سے اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ سوال کرنے یا زبان کھولنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ہر چند کہ معلم انہیں مدرسے اور تعلیم کے فائدے سمجھاتا ہے، پڑھنے لکھنے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے، پھر بھی بچوں کو معلم کے وعظ و پند میں کوئی کارآمد پہلو نظر نہیں آتا۔ تعلیم کیا ہے؟ تعلیم کیوں ضروری ہے؟ آئندہ زندگی میں اس سے کیا فائدے حاصل ہونگے؟ اس قسم کی ساری بحثیں ان کی نظر میں بے معنی ہیں۔ وہ فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ زندگی پر کان نہیں دھرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی کے خوف یا رعب داب سے جماعت میں خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور مدرسے کا کام بھی پورا کر لیتے ہیں، لیکن ان میں تعلیم کا وہ ذوق و شوق نظر نہیں آتا جس کے لئے انہیں گھر سے مدرسے بھیجا گیا تھا۔

مدرسے سے اس بیزاری کا عام سبب یہ ہے کہ ہمارے گھروں اور مدرسوں کی فضا میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ گھر میں بچوں کو جس قسم کی بے تکلف، آزاد اور شفقت آمیز فضا نصیب ہوتی ہے وہ بالعموم مدرسوں میں میسر نہیں آتی۔ گھر میں چھوٹے بڑے سب ان سے پیار کرتے ہیں، ان کے مشغلوں اور کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور تسلی بخش جواب دیتے ہیں، ان کی خواہش اور شوق کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور حتی الوسع ان کی ضرورتوں کو ان کی مرضی کے مطابق پورا کرتے ہیں اسکے برعکس

مدرسے میں بچّے خود کو اوّل اوّل تنہا اور بے یار و مددگار پاتے ہیں۔ گھر اور محلے کے پرانے اور بے تکلف ساتھی چھوٹ جاتے ہیں اور مختلف گھرانوں اور علاقوں کے ہمجولی ان کے سامنے آتے ہیں۔ یہ نئے ہمجولی، معلم، کتاب، مدرسے کی عمارت اور جماعت کا کمرہ، سب ان کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔ گھر میں وہ چھوٹے بڑے سب کی توجہ کا مرکز تھے۔ مدرسے میں ان کا پُرسانِ حال کوئی نہیں ہے۔ کسی نے ان کی انفرادی ضرورت اور خواہش کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ کسی نے ان سے اُس لاڈ پیار کا اظہار نہیں کیا جس کے وہ عادی تھے۔ کسی نے ان کو کھیل کود اور تفریحی مشغلوں کا وہ سامان فراہم نہیں کیا جو گھر میں میسر تھا نہ انہیں کبھی اپنے معلم سے غیر رسمی بات چیت کا موقع ملا۔ کسی نے شفقت آمیز لب و لہجہ میں انہیں اپنے پاس بلایا! اس بے اعتنائی، عدم توجہ اور اجنبی فضا کا اثر یہ ہوا کہ جو بچہ گھر میں شیر تھا۔ مدرسے میں آکر بلّی بن گیا۔ مدرسوں کو اس غیر صحت مند فضا سے پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ کاش ابتدائی تعلیم کو موثر اور کامیاب بنانے کے لئے مدرسوں میں گھریلو زندگی کی ایسی خوشگوار فضا قائم کی جائے جس میں تعلیم و تربیت حاصل کر کے بچے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ ہمت، خود اعتمادی، آزادی، طمانیت اور بے خوفی محسوس کریں۔ تعلیم کو بوجھ نہیں بلکہ کھیل کود اور تفریح کا دلچسپ مشغلہ خیال کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کریں جب تک مدرسوں میں گھریلو زندگی کی سی بے تکلف فضا اور بچوں کی دلچسپی کے لئے زیادہ سے زیادہ ساز و سامان فراہم نہ کیا جائے، بچے مدرسوں سے خاطر خواہ دلبستگی کا اظہار نہیں کر سکتے۔

جہاں تک اُردو تدریس کا تعلق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مدرسے میں اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا ایک خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔ تقریری و تحریری مقابلوں، ڈراموں، مکالموں اور مختلف قسم کے تعلیمی کھیلوں کے ذریعے زباندانی کے آسان اور دلچسپ ذرائع سارے بچوں کے لئے مہیا کئے جائیں۔ ہر جماعت میں بچوں کی عمر اور شوق کا لحاظ رکھ کر اُردو کے اشعار، اقوال، چھوٹی چھوٹی کہانیاں، تصویری کہانیاں، تعلیمی لطیفے، چٹکلے وغیرہ جلی حروف میں لکھ کر آویزاں کئے جائیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ یہ کام خود بچوں سے لیا جائے اور مختلف جماعتوں میں اس قسم کے مشغلوں سے دلچسپی لینے کا تقابلی جذبہ پیدا کیا جائے۔ بچوں کو جس قسم کی چیزوں یا مقامات اور اشخاص سے دلچسپی ہے یا ہو سکتی ہے ان کے مجسمے، چارٹ اور دیدہ زیب تصویروں سے کمروں کو

آراستہ کیا جائے، بیت بازی، قصہ گوئی، لطیفہ گوئی اور نظم خوانی کے مقابلے منعقد کرائے جائیں اور طلبہ کو ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کا موقع دیا جائے ان سے جو سوالات کئے جائیں اُردو میں میں کئے جائیں اور انہیں اپنی بات کہنے اور سُنانے کا آزاد موقع دیا جائے۔ مدرسے کے نظام الاوقات میں اُردو کو اہم جگہ دی جائے۔ معلومات عامہ اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل کتابیں مدرسے کے کتب خانے میں جمع کی جائیں اور مطالعہ کے لئے جاری کی جائیں۔ اس کام کے لئے جماعت وار چھوٹے چھوٹے کتب خانے اور زیادہ مفید ہوں گے۔ جو طلبہ اُردو میں کمزور ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے خاص انتظام کیا جائے جو بچے عضویاتی خامی کی بنا پر اُردو بولنے، پڑھنے یا لکھنے سے معذور ہوں طبی معائنے کے ذریعے ان کی درستی کی کوشش کی جائے۔ مدرسے میں ایک چھوٹے سے شفا خانے کا وجود اس سلسلے میں زیادہ مفید ہوگا اور طلبہ کو ہر وقت طبی امداد مل سکے گی۔ کبھی کبھی طلبہ کے والدین یا سرپرستوں سے مدرسے کے معلمین ملاقات کریں اور سراغ لگائیں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر کوئی خاص بچہ اُردو میں بہت کمزور ہے۔ اس سلسلے میں والدین کو بہت سے ایسے مشورے دیئے جا سکتے ہیں جو بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اُردو کے ریڈیائی گانے، تقریریں، ڈرامے، مکالمے اور خبریں بھی اردو تدریس میں خاصی مدد دے سکتی ہیں۔ اردو فلمیں مزید دلچسپی کا سبب بن سکتی ہیں۔ زبان کی تدریس کے سلسلے میں یہ ساری باتیں نہایت اہم ہیں۔ کوئی مدرسہ جس قدر مذکورہ بالا خصوصیات کا حامل ہوگا، اسی قدر وہ اردو تدریس کو کامیاب و مفید بنانے میں مدد دے سکے گا۔

۲- معلم

زبان کی تدریس کا دوسرا مؤثر ذریعہ معلم کی ذات ہے طلبہ کی توجہ کا اصل مرکز چونکہ مدرسہ نہیں، معلم ہوتا ہے' اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کا انحصار بھی زیادہ تر معلم کی شخصیت اور اس کے طرز عمل پر ہوتا ہے۔ معلم کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ طلبہ میں مدرسے اور تعلیم کی محبت اجاگر کرے اور زیر تدریس مضمون کو اس درجہ دلکش و دلچسپ بنا کر پیش کرے کہ وہ ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ بن جائے اس اہم منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لئے معلم میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) ان خصوصیات میں معلم کی شفقت و ہمدردی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ شفیق معلم سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں اُس سے ایک طرف معلم بچے کو انفرادی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے دوسری

طرف بچے معلم کی ذات و صفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ معلم کی سخت مزاجی اور ترش روئی ابتدائی مدرسوں کی تدریس کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اس طرز عمل سے بچوں میں خوف، غصّہ اور نفرت کے جذبات قوی ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت کی وہ تعمیر نہیں ہو پاتی، جس کی غرض سے وہ معلم کے سپرد کئے گئے تھے۔ اس کے برعکس استاد کی شفقت و ہمدردی طلبہ میں خود اعتمادی اور بے باکی پیدا کرتی ہے اور ان کی نرم و نازک شخصیتوں کو آزاد فضا میں پروان چڑھنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ مرعوب کن گھٹی گھٹی فضا میں بچوں کی فطری صلاحیتیں ابھرنے کی بجائے اکثر مردہ ہو جاتی ہیں اور ان کی ذہنی و جسمانی نشو و نما اس طور پر نہیں ہو پاتی جو تعلیم و تدریس کا مقصد ہے کامیاب تدریس کے لئے ضروری ہے کہ معلم ہنس مکھ اور خوش مزاج ہو اور اس کا رویہ مشفقانہ اور ہمدردانہ ہو تاکہ طلبہ اس سے جلد مانوس ہو جائیں اور اس کی شخصیت و کردار سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۲) ان ذاتی محاسن کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ معلم طلبہ کی نفسیات سے کم و بیش آشنا ہو وہ چھ سال سے پندرہ سولہ سال تک کے طلبہ کے جبلی رجحانات اور ان کے فطری ذوق و شوق سے آگاہ ہو، مثلاً کھیل کود میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنا، دوسروں کی نقل اتارنا، نئی نئی چیزوں کو سیکھنے اور دیکھنے کی تلاش میں رہنا، اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں خوشی محسوس کرنا اور گروہ بندی سے دلچسپی لینا طلبہ کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے جب تک تعلیم و تدریس میں بچپن اور لڑکپن کی ان اہم خصوصیات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا، طلبہ تدریس سے خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار نہیں کریں گے۔

(۳) طلبہ کی نفسیات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ معلم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون سے گہری دلچسپی رکھتا ہو۔ جو مضمون وہ پڑھا رہا ہے اس سے اس کو فطری لگاؤ ہو اور اکتسابی طور پر اس نے اپنے مضمون میں اتنی قابلیت پیدا کر لی ہو کہ وہ معلمی کے اہم منصب پر فائز ہو سکے حقیقتاً یہ معلم کا اپنے مضمون سے فطری لگاؤ اور دلچسپی ہے، جو اس میں تازگی و زندگی کے آثار پیدا کر کے طلبہ میں اردو کے مطالعے کا مستقل ذوق و شوق پیدا کرتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے معلمین، اُردو کو آسان مضمون سمجھ کر اس کی تدریس میں کسی خاص تیاری یا محنت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ طرز عمل اردو کی تعلیم و تدریس کے حق میں بہت مضر ہے اردو زبان پاکستان کے نظام تعلیم اور

معاشرے میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں سارے مضامین اُردو کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں اور اکثر طلبہ کے عام اظہار خیال کا واحد ذریعہ اُردو ہے اس لئے دوسرے مضامین کے مقابلے میں اس کی تدریس سب سے زیادہ محنت اور توجہ کی مستحق ہے جب تک طلبہ صحیح اُردو بولنے پڑھنے اور لکھنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، وہ کسی مضمون میں بھی نمایاں ترقی نہیں کر سکتے۔ عوامی بول چال کے لئے اُردو آسان سہی، لیکن تدریسی مضمون کی حیثیت سے اس کا پڑھانا کچھ ایسا سہل نہیں ہے۔ بظاہر اردو ایک مخلوط زبان ہے اس میں مختلف زبانوں یا بولیوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنا الگ مزاج رکھتی ہے۔ اس مزاج سے آشنائی کے بغیر تدریس اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اُردو کے معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کی ارتقائی منزلوں، اس کی سرشت اور لب و لہجہ سے آشنا ہو۔

(۴) معلم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مطالعے کا مستقل ذوق رکھتا ہو اور اُردو تدریس کو محض کام یا منصبی فریضہ نہیں بلکہ اپنا محبوب ترین مشغلہ خیال کرتا ہو۔ اس میں تحقیق و تنقید کی کم و بیش لگن ہو، جن الفاظ کے معنی، تلفظ یا استعمال میں اسے شبہ ہو ان کی تصدیق سبق پڑھانے سے قبل ضروری سمجھتا ہو، زبان و بیان کے بدلتے ہوئے رجحانات اور الفاظ سازی کے ساتھ ہی تذکیر و تانیث واحد و جمع اور صرف و نحو کے عام قاعدوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ حروف کے مخارج ان کی آوازوں اور الفاظ کے صحیح اور مروج تلفظ سے آگاہ ہو۔ نثر و نظم کو بلحاظ موضوع مناسب لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ موثر انداز میں پڑھ سکتا ہو۔ تحریر صاف ہو۔ لکھنے میں املا کی صحت، حروف کی نوک پلک، جوڑ، شوشہ، مرکز اور نقاط کے صحیح استعمال کا ہر قدم پر لحاظ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں معلم سے مسلسل مطالعے اور محنت کا مطالبہ کرتی ہیں اس کے بغیر کوئی معلم اردو تدریس کو موثر اور کامیاب نہیں بنا سکتا۔

(۵) یہ بھی ضروری ہے کہ معلم نے طریقۂ تدریس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہو اور وہ تدریس اُردو کے عام و خاص مقاصد اور اس کے طریقۂ کار سے واقفیت رکھتا ہو۔ تدریس کے جدید و قدیم اصول اس کی نظر کے سامنے ہوں اور وہ انہیں عملی طور پر تدریس میں استعمال کر سکتا ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ معلم لکیر کا فقیر بن جائے اور کتابی طریقۂ کار کے سوا اپنی

ذہنی اپج سے کام لینا چھوڑ دے۔ اچھا معلم تعلیم کے عام اصول اور طلبہ کی عام نفسیات کا لحاظ رکھتا ہے، لیکن وہ کسی خاص طریقہ کار کا غلام بن کر نہیں رہ جاتا۔ ذہین، طباع اور تدریس سے دلچسپی رکھنے والا استاد ہر سبق کو اپنے طور پر تیار کرتا ہے، اپنی ذہانت و شخصیت کی مدد سے اس میں تازگی، جدت اور اثر خیزی کا سامان پیدا کرتا ہے، سبق کی تمہید، تفہیم اور اعادے کے لئے موضوع و مواد کی مناسبت سے نئے نئے پیرائے اختیار کرتا ہے اور طلبہ کی عمر اور جماعت کا لحاظ رکھ کر سبق کو مختلف توضیحی اشیاء کی مدد سے کامیاب و دلچسپ بناتا ہے۔ گویا اچھا معلم اکتسابی مہارت اور فنی تربیت کے ساتھ اپنے اندر ایک جوہر ذاتی رکھتا ہے، یہ جوہر ذاتی معلم کی محنت و توجہ کی بدولت بروئے کار آتا ہے اور یہی جوہر تدریس کو جاندار اور موثر بنانے میں مدد دیتا ہے۔

شفقت آمیز لب و لہجہ، خوش طبعی، بردباری، محنت اور اردو سے فطری لگاؤ علم و ادب کے مطالعے کا شوق، اصول تعلیم سے واقفیت، درس و تدریس سے گہری دلچسپی، بچوں کی نفسیات سے آگاہی، اردو تدریس کے مقاصد و اصول سے شناسائی اور زبان و بیان کی مختلف صورتوں، ان کے عام محاسن و معائب اور بدلتے ہوئے رجحانات و عوامل سے کم و بیش واقفیت ایسی چیزیں ہیں جو اردو کے معلم کے لئے ضروری ہیں۔ جب تک اردو کے معلمین اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں گے وہ تدریس اردو کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

۳۔ نصاب مدرسے اور معلم کی طرح نصاب کو بھی تدریس اردو کا نہایت موثر جزو خیال کرنا چاہئے۔ جب تک معلم کو واضح طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ اسے کیا پڑھانا ہے وہ طلبہ کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اچھا نصاب، معلم اور متعلم دونوں کی یکساں رہبری کرتا ہے اس سے ہر جماعت کا دائرہ عمل اور عمل کی نوعیت کا احاطہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ ان ساری خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، جو کسی خاص مضمون کے تدریسی مقاصد کے حصول کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں مختصر یہ کہ ایک طرف وہ طلبہ کی دلچسپی اور توجہ کا سامان فراہم کرتا ہے، دوسری طرف معلم کے درس کو زیادہ سے زیادہ آسان، دلچسپ اور مفید بنانے میں مدد دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی جماعت کے لئے معیاری اور کامیاب نصاب کس نہج پر اور کن اصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے۔ اس کے تفصیلی جواب کی گنجائش اس جگہ نہیں نکل سکتی، اول اس لئے

کہ اصولوں پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، دوسرے یہ کہ اس موضوع پر اصولِ تعلیم و تدریس کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے خصوصاً انگریزی زبان میں جو وافر مواد، نصاب کی تدوین کے بارے میں موجود ہے اُس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سابق ڈائرکٹر بیورو آف ایجوکیشن ویسٹ پاکستان کے اُن مقالات کا مطالعہ بھی بطور خاص مفید ہوگا جو بیورو آف ایجوکیشن کے سہ ماہی رسائل "ثانوی تعلیم" اور "تعلیم و تدریس" کے مختلف شماروں میں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیان شائع ہوئے ہیں، ان مقالات میں مغرب کے خیالات سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے اور مشرق کے مزاج اور ذہن کا لحاظ رکھ کر ابتدائی اور ثانوی جماعت کے نصاب کے بارے میں نہایت کارآمد اور فکر انگیز باتیں کہی گئی ہیں۔ چنانچہ اس جگہ نصاب کے متعلق مختصراً جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ زیادہ تر انہیں مقالات سے ماخوذ و مستفید ہے۔

نصاب، خواہ کسی جماعت کا ہو اور کسی مضمون کا ہو، ضروری ہے کہ وہ خاص حدود میں رہ کر بھی اپنے اندر ایک خاص قسم کی لچک رکھتا ہو، لچک سے مراد یہ ہے کہ اُس میں وقتاً فوقتاً، حسبِ ضرورت تبدیلیاں لانے اور جامعیت و رنگا رنگی پیدا کرنے کی گنجائش ہو۔ ایسا نہ ہو کہ جو بات آج کہی جا رہی ہے وہ پتھر کی لکیر ہو جائے اور اس میں اُس کے بعد کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ یا حذف و اضافہ ممکن نہ ہو۔ اصول اپنی جگہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ اور انہیں کی پابندی کسی عمل کو نتیجہ خیز بناتی ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ اصول کسی نہ کسی آدمی ہی کے تیار کئے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی خاص قسم کے ماحول اور معاشرتی زندگی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جیسے جیسے اس ماحول اور معاشرے کی ضرورتیں بدلتی جائیں ویسے ویسے نصاب میں مناسب تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ آج کے تقاضے کچھ ہیں: کل کے کچھ اور رہے ہونگے، اور مستقبل کے تقاضے ماضی و حال، دونوں سے بہت مختلف ہوں گے، اس لئے پیچھے سے کہیں زیادہ آگے کی طرف دیکھنا ہوگا اور علم و فن کی ترقی و توسیع کا لحاظ رکھ کر تدوینِ نصاب کے اصول مرتب کرنے ہوں گے علامہ اقبال نے یوں ہی نہیں کہا کہ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا ⁂ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

تدوینِ نصاب کے سلسلے کی دوسری اہم کڑی اُس کا تسلسل ہے۔ تسلسل سے مراد،

مختلف جماعتوں کے نصابوں کے درمیان وہ گہرا تعلق ہے جو نصاب کے تدریجی ترقی کی ضمانت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بتا دیتا ہے کہ پچھلی جماعت میں کیا کچھ ہو چکا ہے اور اگلی جماعت میں اُس سے آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مختلف جماعتوں کے نصاب، مختلف افراد مرتب کرتے ہیں، ایک نے پانچویں کا نصاب تیار کر دیا، دوسرے نے چھٹی کا، تیسرے نے ساتویں کا، اور چوتھے نے آٹھویں کا۔ یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ایک کو دوسرے کی خبر بالعموم نہیں ہوتی۔ خبر ہو بھی تو اُس پر چنداں توجہ کرنے یا مختلف جماعتوں کے نصابوں پر تقابلی نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی جاتی۔ اس بے خبری اور بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو نصابوں میں بعض بعض مضامین و موضوعات کی تکرار ہو جاتی ہے ایک طالب علم ساتویں یا چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھ کر آئے گا جب اُسی قسم کی اور اُسی معیار کی چیزیں اُسے آٹھویں جماعت میں پڑھنے کو ملیں گی تو صاف ظاہر ہے کہ اُسے نہ تو ایسے نصاب سے دلچسپی ہوگی اور نہ یہ اُس کی ذہنی و علمی ترقی کا وسیلہ بن سکے گا۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ساتویں کا نصاب، آٹھویں سے مشکل تر اور دسویں کا نصاب، نویں سے آسان تر ہو جاتا ہے، اس شتر گربگی سے طلبہ کے ذہن بتدریج نشوونما پانے کے بجائے ایک طرح کی اُلجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس الجھن سے طلبہ کو نجات دلانے اور اُن کے ارتقائے ذہنی کے لئے موثر مواد فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف جماعتوں کے نصاب میں نفسیاتی اور منطقی تسلسل کا خاص خیال رکھا جائے جب تک ساتویں جماعت کے نصاب کے مرتب کو یہ نہ معلوم ہو کہ چھٹی جماعت کا نصاب کیا ہے اور آٹھویں کا کیا ہونا چاہئے اس وقت تک ساتویں جماعت کا نصاب معیاری اور کامیاب نہیں ہو سکتا اور آسان سے مشکل اور مشکل سے مشکل تر کی جانب لے جانے کا اصول بے معنے ہو کر رہ جائے گا۔

لچک اور تسلسل کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ ہر جماعت کا نصاب اُس جماعت کے طلبہ کی عمر، اُن کی عمر کے تقاضوں، اُن کی نفسیاتی خواہشوں اور اُن کی ضرورتوں کے مطابق مرتب کیا جائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ نصاب کا مواد ایسا ہو جو اُن کی دلچسپی کا سبب بھی بن سکے اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے میں مددگار ثابت ہو۔ یہ کام تعلیمی نفسیات کے گہرے مطالعے کے ساتھ زبان و ادب کا بھی گہرا مطالعہ چاہتا ہے اُردو میں ایسی بے شمار نظمیں، غزلیں، اور نثری تحریریں بکھری پڑی ہیں جو ہر

جماعت کے اردو نصاب کو حد درجہ دلچسپ اور مفید بنانے میں کام دے سکتی ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے محنت درکار ہے اور محنت کا رواج تیجیسے ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے یہاں تو نصاب تیار کرنے کی عام روش یہ ہے کہ جو کتابیں اچھی یا بُری پچھلے نصاب میں داخل تھیں اُن کو سامنے رکھ کر کچھ مضامین اس میں سے کچھ کہانیاں اُس میں، کچھ نظمیں یہاں سے، کچھ وہاں سے لے لی گئیں اور اس بے ربط، مجموعۂ نظم و نثر کو نصاب کا نام دے دیا گیا۔ آج کا طالب علم کل کے طالب علم سے مختلف ہے، آج کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں کل کیا تھے؟ طلبہ ان دنوں کس قسم کے مضامین اور کس قسم کی نظمیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اور کیا ناپسند کرتے ہیں اُن کی دلچسپی اور اہمیت کے موضوعات کل کیا تھے اور آج کیا ہو سکتے ہیں؟ اس قسم کے اہم سوالوں سے نصاب کے مرتب کو سروکار نہیں ہوتا۔ طلبہ کی دلچسپی کا لحاظ کئے بغیر، جو چیزیں اسے پسند آجاتی ہیں اور آسانی سے مل جاتی ہیں وہ انہیں نصاب میں شامل کر دیتا ہے۔ اس سہل انگاری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصابی کتابوں میں طلبہ کے لئے کشش کا کوئی سامان نہیں ہوتا اور نصاب کی تدوین و ترتیب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے دراصل نصاب کو ایسا ہونا چاہئے کہ اسے پڑھنے کو طلبہ کا جی چاہے اور وہ اسے دل لگا کر سمجھنے میں خوشی محسوس کریں۔

ہمارے یہاں ابتداءً اردو کے ابتدائی اور ثانوی نصاب کی جانب کوئی توجہ نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب پچھلے چند سال سے ہماری حکومت جدید تعلیمی نظام میں نصاب کی تدوین کو بھی اہم جگہ دے رہی ہے چنانچہ ملک کے تجربہ کار ماہرین تعلیم پر مشتمل جو نصابی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں وہ اُردو کے ابتدائی و ثانوی نصاب کی حدود متعین کرنے میں خاصی توجہ سے کام لے رہی ہیں اور مختلف جماعتوں کے بچوں کی عمر اور نفسیات کا لحاظ رکھ کر موضوع و مواد کی نوعیت اور اس کے معیار و مقدار کا تعین کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ مزید احتیاط برتی گئی ہے کہ پہلے کی طرح عام کتب فروشوں یا ناشروں کو نصابی کتابیں تیار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ معقول معاوضہ دے کر یہ کام ملک کے تجربہ کار اور لائق معلمین پر مشتمل ایک بورڈ کے سپرد کیا گیا ہے۔ نصاب کے بعض خارجی پہلوؤں کا ذکر بھی اس جگہ ضروری ہے نصابی کتابیں اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے خواہ کیسی ہی افادی اور معیاری کیوں نہ ہوں، جب تک انہیں ظاہری طور پر بھی جاذب نظر اور دلکش نہ بنایا جائے گا، کم از کم ابتدائی مدرسوں کے طلبہ اُن کی طرف آسانی سے متوجہ نہ ہوں گے اس لئے ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابوں کو معنی کے ساتھ

ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔ کتاب سے دلچسپی پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں طلبہ کی پسندیدگی کا لحاظ رکھ کر سبق کی مناسبت سے جابجا رنگین چارٹ اور جاذب نظر توضیحی تصویریں اور خاکے دیئے گئے ہوں۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور جلد نہایت مضبوط اور خوب صورت ہو۔ کتابت اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہو اور کتاب میں عمدہ سے عمدہ کاغذ استعمال کیا گیا ہو۔ ہر سبق کے آخر میں ایسے مفید اور دلچسپ مشقی سوالات دیئے گئے ہوں جن سے طلبہ معلم کی مدد کے بغیر بھی استفادہ کرسکیں۔ ثانوی جماعتوں کی کتابوں کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی مفید ہوگی اور آئندہ چل کر اس سے طلبہ میں لغت کے استعمال کا شوق پیدا ہوگا۔ کتاب کا سائز اور حجم بھی ایسا ہو کہ کتاب بچوں کے ہاتھ میں آسانی سے آسکے۔ تحریر ایسی صاف اور دلکش ہو کہ طلبہ آسانی سے پڑھ سکیں۔ ملک کی عام معاشی حالت کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہے کہ کتاب کی قیمت زیادہ نہ ہو تاکہ طلبہ کے والدین یا سرپرستوں پر ان کا خریدنا گراں نہ گزرے۔

۴۔ طریقۂ تدریس سے واقفیت تدریس اردو کے سلسلے میں مدرسہ، معلم اور نصاب سب اپنی جگہ اہم خیال کئے جانے کے لائق ہیں۔ لیکن جب تک ان وسائل کو کسی خاص طریقۂ کار کے تحت عمل میں نہ لایا جائے، تدریس دلچسپ اور موثر نہیں ہو سکتی اس لئے اردو کی تدریس میں کسی مخصوص طریقۂ کار کو اپنانے کے ساتھ ساتھ ان عام اصولوں کا لحاظ بھی ضروری ہے، جو تدریس کو موثر بنانے کے لئے بہ حیثیت مجموعی نہایت مفید ہیں۔ مثلاً آسان سے مشکل، معلوم سے نامعلوم، محسوس سے غیر محسوس، مقرون سے مجرد، آسان سے پیچیدہ اور کل سے جزو کی طرف چلنے کی پابندی تدریس اردو کے لئے بھی لازمی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اردو کے استاد کو ایسا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے جو دلچسپ بھی ہو اور طلبہ کی جبلت، تجسس اور استفسار کو حرکت میں لاسکے۔ مل جل کر کام کرنے، اپنی مدد آپ کرنے اور مشاہدہ و مطالعہ کرنے کا شوق و ذوق پیدا کرسکے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب پہلے سے سبق کے اشارات مرتب کر لئے جائیں اس کے متعلق ضروری توضیحی اشیاء فراہم کرلی جائیں، اس کے بعد تدریس کا آغاز کیا جائے طلبہ کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا جائے ان کی شخصیت کی

تعمیر کے لئے ان کی انفرادی فطرت اور ماحول کا مطالعہ بھی ضروری خیال کیا جائے ۔ صرف کتاب کے بندھے ٹکے اصول کی پابندی پر اکتفا نہ کیا جائے ۔ بلکہ سبق کو دلچسپ اور کامیاب بنانے کے لئے ذاتی اپج اور جدت سے بھی کام لیا جائے ۔ نصاب کے علاوہ طلبہ میں زائد مطالعہ اور اپنی پسند کی کتابوں کے انتخاب کا شوق پیدا کیا جائے ۔ تدریس اردو کے لئے خاص طور پر ضروری ہے کہ طلبہ کو علمی کاموں کی طرف رغبت دلائی جائے یعنی جب طلبہ کو بولنا، پڑھنا یا لکھنا سکھایا جائے تو طلبہ کو خود بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے ۔ ساتھ ہی جو چیزیں سکھائی جائیں ان میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مشق کرائی جائے ۔ مشق جس قدر زیادہ ہوگی، کام اسی قدر سہل اور آسان معلوم ہوگا ۔ لیکن ان تمام چیزوں سے ضروری یہ چیز ہے کہ تدریس اردو کو کھیل کھیل میں تعلیم کے اصول کا پابند بنایا جائے ۔ طلبہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کھیل بہت پسند کرتے ہیں ۔ کھیل ان کی فطرت کا جزو اور ان کی بے ساختہ حرکات کا سب سے بڑا مظہر ہے اس سے ان کی فطری دلچسپیوں اور تخلیقی قوتوں کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے ۔ کھیل میں وہ روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس کے ذریعے مشکل سے مشکل چیزوں کو بڑی آسانی سے سیکھ لیتے ہیں ۔ تدریس اردو کے سلسلے میں زبانی و تحریری مشقوں اور ڈرل کے ذریعے متعدد کھیل کھلائے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً الفاظ کے ہجے درست کرنے یا الفاظ بنانے کا مقابلہ، الفاظ و محاورات میں جملوں کے استعمال کا مقابلہ، خالی جگہوں کو پُر کرنا، بیت بازی، نظم خوانی، قصہ گوئی اور ڈرامے کے مقابلوں کے ذریعے ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں اکثر اسباق کو آسانی سے کھیل میں بدلا جا سکتا ہے ۔ بالکل چھوٹی جماعتوں میں گیلی مٹی کے حروف بنانا، گتے یا کاغذ کے حروف کاٹنا، ریت یا مٹی کے حروف بنانا ۔ فلمیں بنا کر حروف و الفاظ کی شناخت کرانا، کٹے ہوئے حروف کو جوڑ کر الفاظ بنانا اور اس قسم کے بہت سے کھیلوں سے کام لیا جا سکتا ہے ۔

اُردو تدریس کا مقصد و معیار

اب تک ہمارے یہاں عام طور پر یہی ہوتا آیا ہے کہ مختلف مضامین جمع کرکے ایک کتاب بنا دی گئی اور معلم نے اُسے اپنے طور پر طلبہ کے ذہن نشین کرا دیا۔ ظاہر ہے اس قسم کی بے مقصد تدریس کسی فرد یا جماعت کو وہ فائدے نہیں پہونچا سکتی جو قومی یا مادری زبان سے وابستہ کئے جاتے ہیں جب تک کسی کام کے پیچھے کوئی واضح مقصد نہ ہو اس وقت تک نہ کام کرنے والوں میں کوئی امنگ یا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور نہ بے مقصد کام سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس لئے آئیے سب سے پہلے اُردو تدریس کا مقصد و معیار طے کرتے چلیں تاکہ تدریس کے وقت ہمارے سامنے ایک واضح نصب العین ہو اور ہم اندھیرے میں تیر نہ چلائیں۔

دنیا کی ساری زبانوں کی تدریس کے مقاصد کم و بیش ایک سے ہوتے ہیں پھر بھی چونکہ مختلف زبانیں اپنا مخصوص پس منظر اور ماحول رکھتی ہیں اور ان کی ملکی و قومی ضرورتیں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں اس لئے ان کے مقاصد بھی اہمیت و نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک پاکستان میں اردو تدریس کے مقاصد کا تعلق ہے وہ پچھلے باب کی روشنی میں بڑی آسانی سے متعین کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی زبان جن امور کی بنا پر ملکی و قومی زندگی کے لئے اہم خیال کی جاتی ہے دراصل انہیں امور کی تکمیل، زبان کی تدریس کا عین مقصد ہے پچھلی سطور میں بحث کی جا چکی ہے کہ اردو پاکستان کے جسّہ کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے کاٹ دینے کے بعد ہم من حیثیت القوم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا پاکستان کے ہر شعبہ زندگی سے گہرا تعلق ہے اور اب اگر ہم اس تعلق کے سارے مسائل کو ذہن میں رکھ کر اعلیٰ پیمانے پر اردو تدریس کے مقاصد کا تعین کرنا چاہیں تو ان کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہوگی۔

۱۔ پاکستانیوں کو باہم تبادلۂ خیال کے لئے ایک مشترکہ ذریعہ مہیا کرنا۔

۲۔ اس مشترکہ ذریعۂ اظہار کے توسط سے پاکستانیوں میں سیاسی و قومی یک جہتی پیدا کرنا۔

۳۔ پاکستانی قومیت۔ آزادی اور سالمیت کا تحفظ کرنا۔

۴۔ عام معاشرتی زندگی میں سہولتیں پیدا کرنا اور کامیاب زندگی گذارنے کا راستہ دکھانا۔

۵ - معاشرتی ربط وضبط کو فروغ دے کر پاکستانیوں میں رشتہ اتحاد استوار کرنا اور قومی شیرازے کو منتشر ہونے سے بچائے رکھنا۔

۶ - معاشی زندگی کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنا۔

۷ - ہم زبانی وہم خیالی کے ذریعے پاکستانی قومی کردار کی تشکیل کرنا۔

۸ - اسلام کی اہم قدروں اور روایتوں کو محفوظ رکھنا اور فروغ دینا۔

۹ - مذہبی اور دینی علوم کی ترقی واشاعت میں آسانیاں پیدا کرنا۔

۱۰ - موجودہ علمی وادبی اور تخلیقی و تحقیقی سرمائے کو محفوظ رکھنا اور اس میں روز بروز اضافہ کرنا۔

۱۱ - زبان وخیال میں ہم آہنگی پیدا کر کے حصول تعلیم کو آسان بنانا۔

۱۲ - بلند پایہ مفکر۔ ادیب۔ شاعر۔ سائنسدان۔ ڈاکٹر۔ انجینیر۔ ریاضی دان اور ماہر تعلیم پیدا کرنا۔

۱۳ - اپنی چیزوں کی اہمیت کا احساس دلا کر ذہنی غلامی سے نجات دلانا۔

۱۴ - وطن، قوم اور مذہب کی اہمیت کا احساس دلانا اور ان کی خاطر ایثار وقربانی کا جذبہ پیدا کرنا۔

۱۵ - ملک وقوم کو روحانی اور مادّی ترقی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مہذب اور شائستہ بنانا۔

اس قسم کے اور کئی مقاصد اردو تدریس سے وابستہ کئے جا سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہی وہ اعلیٰ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے قومی یا مادری زبان کی تدریس ضروری خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ان مقاصد کا تعلق اردو تدریس کی ابتدائی وثانوی منزلوں سے نہیں بلکہ اعلیٰ اور تکمیلی منزلوں سے ہے ہمارے موضوع کا تعلق چونکہ تدریس کے ابتدائی اور ثانوی درجوں سے ہے اس لئے اس جگہ ہم صرف ان محدود و مخصوص مقاصد کا ذکر کریں گے جو پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے حصول کے بغیر وہ اعلیٰ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیمی اداروں اور ان میں کام کرنے والوں کی اہمیت ابھی ہمارے یہاں پوری طرح محسوس نہیں کی گئی۔ حالانکہ یہ تعلیمی ادارے تعلیمی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم خیال کئے جانے کے لائق ہیں۔ ایک مثل مشہور ہے کہ جس کام کا آغاز اچھا ہوتا ہے۔ عموماً اس کا انجام بھی خوش آئند ہوتا ہے یہ بہت درست ہے۔ جب تک پہلی اینٹ سیدھی نہ رکھی جائے کوئی دیرپا عمارت وجود میں نہیں آسکتی۔ تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔ جب تک ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی طرف توجہ نہ کی جائے گی اعلیٰ تعلیمی ادارے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسے ایسے اہم ادارے ہیں جہاں بچے کی اعلیٰ تعلیم کا حقیقی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اس کی شخصیت۔ سیرت اور مزاج کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے اس کے اعضائے جسمانی اور حواسِ خمسہ پہلی مرتبہ شعوری طور پر حرکت میں آتے ہیں۔ یہیں وہ اپنے ہم جولیوں اور ہم عمروں کے ساتھ باہم مل جل کر زندگی بسر کرنے کا پہلا سبق لیتا ہے۔ بچے کی مذہبی۔ قومی اور وطنی حس بھی پہلے پہل اسی جگہ بیدار ہوتی ہے اس کی تخلیقی اور اختراعی قوتیں اوّل اوّل یہیں بروئے کار آتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بچے میں خود اعتمادی اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا شوق و رجحان پیدا ہوتا ہے اور اس کی عادتیں پختہ ہوتی ہیں۔ ثانوی اور ابتدائی مدرسے ہی میں بچے کا ذہن عملاً حرکت میں آتا ہے یہیں وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچ بچار کی ابتدا کرتا ہے اور یہیں سب سے پہلے اس کو اپنی جبلّی خواہشوں کو آسودہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہیں اس کا ذہن تیزی سے آگے بڑھنا شروع کرتا ہے اور یہیں اُس کے مستقبل کا تانا بانا تیار ہوتا ہے مختلف قسم کے جذبات بھی ابتداءً یہیں ظہور میں آتے ہیں۔ تقریر و تحریر سے دلچسپی اور مصنف و شاعر بننے کا شوق بھی اسی منزل میں پیدا ہوتا ہے غرض ابتدائی اور ثانوی مدرسے بچّے کی تعلیمی زندگی کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور جب تک کسی مقصد کو ذہن میں رکھ کر ان مدرسوں میں اردو تدریس کا مناسب انتظام نہ کیا جائے گا اردو تدریس کے وہ اعلیٰ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو اردو تعلیم کی آخری اور تکمیلی منزلوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے آئیے ابتدائی اور ثانوی منزلوں میں اردو تدریس کے مقاصد واضح کرتے چلیں تاکہ ان کے حصول کے وقت ہمارے سامنے کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں اردو تدریس کے چار خاص مقاصد ہیں۔

(۱) اُردو بولنا

(۲) اُردو پڑھنا

(۳) اُردو لکھنا

(۴) اُردو سمجھنا

ان چاروں عناصر کی تہ میں یہ مقصد پوشیدہ ہے کہ پاکستانی بچّے اردو زبان کو اپنی عمر و تعلیمی معیار کے لحاظ سے ہر شعبے میں استعمال کر سکیں۔ ان میں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے اور سمجھنے کی اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ہم عمروں اور ہم جماعتوں میں تحریر و تقریر دونوں ذریعوں سے اظہار خیال کر سکیں اپنے گرد و پیش اور ماحول کے زیر اثر طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اور جس قسم کے سوالات ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں انہیں دوسروں کے سامنے پیش کر سکیں۔ گھر اور مدرسے کی فضا میں رہ کر انہوں نے جو باتیں سیکھی ہیں انہیں حسب خواہش دُہرا سکیں۔ جو چیزیں ان کے مشاہدے اور مطالعے میں آتی ہیں یا جن چیزوں سے انہیں خاص لگاؤ یا دلچسپی ہے ان کے متعلق وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ یہ اظہار ادھورا۔ نامکمل، مبہم، یا مہمل نہ ہو بلکہ واضح۔ مکمل، بامعنی اور روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہو۔ بات اس طرح کہی گئی ہو کہ خود کہنے والے نے ایک خاص قسم کی طمانیت اور خوشی محسوس کی ہو۔ جب تک تکلم یا گفتگو سے کوئی بچہ اپنے اندر مسرت کی ایک لہر محسوس نہ کرے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا اظہار خیال ناقص رہ گیا۔ وہ اپنی بات پوری طرح نہیں کہہ سکا۔ خیالات و جذبات کے بھرپور اظہار کے لئے اسے الفاظ نہیں مل سکے اور اس کا بیان تشنہ ہے اس تشنگی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کے ذخیرہ الفاظ میں روز بروز اضافہ کیا جائے اس کے مشاہدے اور مطالعہ میں نت نئی چیزیں لائی جائیں تاکہ اسے غور و فکر کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے اور وہ نئے نئے الفاظ برابر سیکھتا رہے۔ جب تک کسی بچے کے پاس ہر قسم کے اظہار خیال کے لئے کثرت سے الفاظ موجود نہ ہوں وہ اپنی بات پوری طرح واضح نہیں کر سکتا لیکن بامعنی اور واضح اظہار کے لئے صرف الفاظ کی نہیں بلکہ سوچ بچار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، بغیر سوچے سمجھے گفتگو اظہار خیال کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ خیالات میں ترتیب اور اثر پیدا کرنے کے لئے سوجھ بوجھ سے بھی کام لینا ضروری ہے تاکہ آدمی دوسروں کی بات بھی سمجھ سکے اپنے ہم عمروں اور ساتھیوں کی بات چیت اور تقریر و تحریر سے لطف اندوز ہو سکے زبان کے رسم الخط سے بچہ واقف ہو اور تحریری

صورت میں جو خیالات و افکار اس زبان میں موجود ہیں ان سے اپنے معیار کے مطابق استفادہ کر سکے اب اگر ان مباحث کی تلخیص کریں تو ابتدائی اور ثانوی منزلوں میں اردو تدریس کے خاص مقاصد مندرجہ ذیل قرار پائیں گے۔

۱۔ طلبہ کو اُردو بولنا۔ پڑھنا اور لکھنا سکھانا۔

۲۔ اُردو کے ذریعے ان میں صحیح اور واضح اظہار خیال کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۳۔ اظہار خیال کے ذریعے بچوں کی نفسیاتی تسکین اور طمانیت کا سامان فراہم کرنا

۴۔ اظہار خیال پر قابو پانے کے لیئے ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا۔

۵۔ طلبہ کی ذہنی نشو و نما یعنی ان کی قوت تخیل و ایجاد کو ابھرنے کا موقع دینا۔

۶۔ دوسروں کی تقریر و تحریر کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۷۔ طلبہ میں غور و فکر اور مشاہدہ و مطالعہ کا شوق پیدا کرنا۔

۸۔ طلبہ میں شعر و ادب کے مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا کرنا اور اُردو زبان و ادب کی قدر و قیمت کا احساس دلانا۔

۹۔ طلبہ کے اندر چھپی ہوئی تخیئلی، تخلیقی اور استحسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مقاصد کی نوعیت اور ان کا معیار کیا ہو۔ طلبہ میں اُردو بولنے، پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے کی کس درجہ صلاحیت پیدا کی جائے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے تقریری یا تحریری اظہار خیال کا معیار کیا ہو۔ انہیں کس انداز کی تقریر و تحریر سے استفادہ کرنے کا اہل بنایا جائے۔ ان کے ذہنی نشو و نما کی پیمائش کا پیمانہ کیا ہو وہ کس قسم کی چیزوں اور کس قسم کے موضوعات پر اظہار خیال کر سکیں اور اس اظہار کے لیئے ان میں اردو کی کس درجہ استعداد اور قابلیت پیدا کی جائے۔ اس قسم کے اور کئی سوالات اُردو تدریس کے مقاصد کے ساتھ ذہن میں ابھرتے ہیں اور جب تک ان کے جوابات تلاش نہ کر لیئے جائیں ثانوی اور ابتدائی مدارس میں اُردو تدریس کا مقصد مبہم رہ جاتا ہے اس لیئے ان مقاصد کے حدود کا تعین اور ان کے معیار کی وضاحت ضروری ہے۔

جہاں تک اردو بولنے پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کا تعلق ہے اس کا سلسلہ تو کسی نہ کسی طور پر عمر بھر جاری رہتا ہے لیکن ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں اُردو تدریس کے مقاصد کی نوعیت و

خصوصیت صرف یہ ہونی چاہئے کہ طلبہ اپنے آس پاس کی چیزوں اور واقعات کے بارے میں آسانی سے بات چیت کر سکیں، آسان اور معمولی کتابیں پڑھ سکیں۔ اخبار رسالے اور دوسری ہلکی پھلکی تحریروں کو بآواز بلند یا خاموشی سے جیسی ضرورت ہو پڑھ سکیں۔ ریڈیائی خبریں مکالمے تقریریں اور ڈرامے سمجھ سکیں اور لطف اٹھا سکیں۔ نجی اور کاروباری خطوط، دعوت نامے، رقعے اور خانگی حساب کتاب کے گوشوارے اردو میں مرتب کر سکیں۔ نظم و نثر صحیح تلفظ اور مناسب و موثر لب و لہجے میں پڑھ سکیں، روزمرہ کے واقعات کہانیاں اور نظمیں حسب ضرورت دوسروں کے سامنے دُہرا سکیں۔ منی آرڈر فارم بھر سکیں اور معمولی درخواستیں لکھ سکیں۔ لغت، فہرست کتب۔ فہرستِ مضامین۔ فرہنگ ریلوے ٹائم ٹیبل وغیرہ کا استعمال کر سکیں۔ اپنے ذوق و شوق کے مطابق کتابوں اور رسالوں کا انتخاب کر سکیں۔ لکھنے پڑھنے میں فنی مہارت حاصل کر کے اسے اپنے فرصت کے اوقات کا محبوب مشغلہ بنا سکیں اور عملی زندگی میں اس مشغلے سے خوشی اور نفع حاصل کر سکیں۔

اب تک ہمارے یہاں اردو تدریس پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں تدریس کے مقاصد کے حدود و معیار کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس لئے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے معلمین کو اُن سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ مانا کہ معلم کو مختلف جماعتوں کے سلسلے میں اُردو تدریس کے مجموعی معیار کا کم و بیش اندازہ تو ہوتا ہے لیکن وہ ہر جماعت کے انفرادی تدریسی مقصد سے بالعموم واقف نہیں ہوتا۔ یہ بات پوری طرح ان کے ذہن میں واضح نہیں ہوتی کہ وہ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت کے مقاصد تدریس میں کیسے فرق قائم کریں اور ان کا معیار کس درجہ اور کس طرح بلند کرتے جائیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تدریسی مقاصد و معیار کے حدود کا جماعت وار ایک خاکہ دے دیا جائے تاکہ تدریس کے وقت مجموعی مقصد و معیار کے ساتھ ساتھ درجہ وار معیار و مقصد بھی معلم کے سامنے رہے۔

پہلی جماعت میں اُردو تدریس کا مقصد و معیار صرف اس قدر ہونا چاہئے کہ طلبہ سال کے آخر تک اپنے پسندیدہ مشغلوں، کھلونوں، تصویروں، ماڈلوں گرد و پیش کی مانوس چیزوں اور اپنے مدرسہ و ماحول کے متعلق باہم بات چیت کر سکیں۔ تصویروں، ماڈلوں اور کہانیوں کے ذریعے جو باتیں ان کے سامنے پیش کی گئی ہیں ان پر توجہ دینے اور انہیں غور و فکر سے سننے کے عادی ہو جائیں۔ چھوٹی چھوٹی سادہ نظموں اور کہانیوں کو زبانی دُہرا سکیں۔ حروف تہجی اور ان کی آسان شکلوں کو پہچان

سکتے ہوں۔ حروف علت یعنی ا ۔ و اور ی کی آوازیں فرق محسوس کر سکتے ہوں۔ ایسے الفاظ آسانی سے پڑھ سکتے ہوں جن میں حروف صحیحہ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً دوات ۔ دادا ۔ تارا وغیرہ ۔ اس قسم کے الفاظ سے بنی ہوئی آسان اور مختصر کہانیاں اور نظمیں یا عبارتیں پڑھ سکتے ہوں ۔ چاک، پنسل اور انگلی کے ذریعہ سیدھے اور ٹیڑھے خطوط کھینچ سکتے ہوں۔ حروف تہجی ۔ سادہ الفاظ اور آسان فقروں کو تختہ سیاہ یا کتاب دیکھ کر نقل کر سکتے ہوں۔

دوسری جماعت کے لئے ضروری ہے طلبہ گھر اور مدرسے کے متعلق اپنے ذاتی تجربات وخیالات کا اظہار کر سکیں جو کہانیاں حکایتیں اور نظمیں انہوں نے پڑھی ہیں انہیں سُنا سکیں ۔ اپنی پسندیدہ چیزوں کھیلوں اور محبوب مشغلوں پر بات چیت کر سکیں ۔ اپنے ہم عمروں اور ہم جماعتوں کے مکالمات میں حصہ لینے کے اہل ہوں ۔ تصویروں کے ذریعہ کہانی سمجھ سکتے ہوں اور آسان نظموں کو سمجھ کر پڑھ لینے کے ساتھ نصابی کتاب صحیح اور مناسب لب و لہجے میں روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہوں آسان الفاظ فقرات اور نصابی کتاب کی عبارت کو دیکھ کر اور بعض آسان الفاظ کو املا کی صورت میں لکھ سکتے ہوں ۔ تحریر واضح اور اور خط نمایاں ہو۔

تیسری جماعت کے طلبہ اس لائق ہو جائیں کہ وہ اپنے ماحول اور تجربات پر زیادہ واضح طریقہ سے اظہار خیال کر سکیں ۔ تصویروں کی مدد سے کہانیاں مکمل کر کے سُنا سکیں ۔ مکالموں ۔ مباحثوں اور فیچروں میں اپنے دوستوں اور ہم جولیوں کے ساتھ حصہ لے سکیں ۔ اپنی عادات واطوار ۔ اپنے مشغلوں، مشاہدوں ۔ تجربوں ۔ پالتو جانوروں اور چڑیوں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہوں ۔ نصابی کتاب کو سوچ سمجھ کر پڑھ سکتے ہوں اور مشقی سوالات اور اشارات کو سمجھ سکتے ہوں ۔ صاف اور خوشخط لکھنے پر توجہ دیتے ہوں ۔ نصابی کتابی کی عبارت کا املا لکھ سکتے ہوں ۔ جانی پہچانی چیزوں اور افراد کے متعلق جو سوالات کئے جائیں ان کے جوابات دے سکتے ہوں ۔ اپنے پسندیدہ موضوعات پر مختصر اور آسان مضامین یا جملے لکھ سکتے ہوں ۔ کہانیاں اور نظمیں خود اعتمادی کے ساتھ سنا سکتے ہوں ۔ بآواز بلند پڑھنے کے ساتھ درسی اور غیر درسی مختصر مضامین کا خاموشی سے مطالعہ کر سکتے ہوں ۔

چوتھی جماعت کے طلبہ معمولی اور آسان موضوعات پر دو چار منٹ آسانی سے تبادلۂ خیال کر سکتے ہوں ۔ دیئے ہوئے خاکوں اور تصویروں سے کہانیاں بنا کر سُنا سکتے ہوں ۔ آسان نثری اسباق

اور بیانیہ سادہ نظموں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھ سکتے ہوں ۔ ڈرامہ ۔ مکالمہ اور فیچر پروگرام میں کامیابی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہوں ۔ نصابی کتابوں کے علاوہ آسان قسم کے رسالے ۔ اخبار ۔ خطوط اور دوسری آسان عبارتیں روانی سے پڑھ سکتے ہوں ۔ غیر درسی کتابوں کا خاموشی سے مطالعہ کر سکتے ہوں ۔ خانگی خطوط اور درخواستیں لکھ سکتے ہوں ۔ منی آرڈر فارم اور دوسرے فارم پُر کر سکتے ہوں، اپنے تجربات و معلومات کے متعلق مختصر مضامین لکھ سکتے ہوں ۔ قواعد میں اسم ۔ ضمیر ۔ اور صفت وغیرہ کی شناخت کر سکتے ہوں ۔ بڑی کہانیوں کو مختصر کر کے اور نظموں کو سمجھ کر زبانی سنا سکتے ہوں ۔

پانچویں جماعت کے طلبۂ جماعتی مباحثوں ۔ مکالموں اور تعلیمی مشغلوں میں تحریر و تقریر کے ذریعے حصہ لے سکتے ہوں ۔ اپنے پسندیدہ موضوعات پر دو چار منٹ خود اعتمادی کے ساتھ برجستہ اظہار خیال کر سکتے ہوں ۔ نصابی کتابوں کے علاوہ غیر درسی کتابوں کا خاموشی سے مطالعہ کر سکتے ہوں ۔ اور سمجھ سکتے ہوں ۔ اخبارات و رسائل ۔ خطوط ۔ رقعات ۔ اور اشتہارات وغیرہ کو چوتھی جماعت کے مقابلے میں زیادہ خوش اسلوبی سے پڑھ سکتے ہوں مانوس چیزوں ۔ اشخاص، مقامات واقعات اور حالات کو بیان کر سکتے ہوں اور مضمون کی صورت میں لکھ سکتے ہوں ۔ خانگی اور تجارتی خطوط اور ہر قسم کی درخواستیں ۔ رقعے ، دعوت نامے اور رسید وغیرہ لکھ سکتے ہوں ۔ آمد و خرچ کا حساب اور اپنا روزنامچہ مرتب کر سکتے ہوں ۔ نظم و نثر کے ٹکڑوں کی وضاحت کر سکتے ہوں ۔ قواعد میں ۔ فعل ۔ حرف ۔ ضمیر کے ساتھ زمانے کی تین صورتوں ۔ واحد ۔ جمع ۔ تذکیر و تانیث اور مفرد جملوں کی بناوٹ سے واقف ہوں ۔

چھٹی جماعت میں تدریس کا مقصد و معیار اس قدر ضرور ہونا چاہئے کہ طلبۂ خاموش مطالعہ کے مزید عادی ہو سکیں اور نثر و نظم دونوں میں یکساں دلچسپی لے سکیں، نصاب کے علاوہ دیگر منظومات و مضامین کے مطالعے کا شوق پیدا ہو سکے ۔ تخیئلی افسانوں ، جانبازی کی داستانوں ، تاریخ کے اہم کارناموں ، قومی و ملی شخصیتوں کی زندگی اور سیرت کے بعض اجزاء اُن کے مطالعہ میں آ سکیں پسندیدہ اشخاص و مقامات اور اشیاء کے بارے میں مضمون ، مکالمہ یا کہانی کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور اس طور پر اُس سے اُن کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھی تھوڑا بہت اظہار ہو سکے ۔ یہ بھی ہونا چاہئے کہ پچھلی جماعت کے مقابلے میں وہ زیادہ بہتر طور پر شعر کے آہنگ اور موزونیت

سے لطف اُٹھا سکیں اور نظم کے مفہوم کے ساتھ ساتھ اُس کی بعض نمایاں خوبیوں کو بھی محسوس کر سکیں اشعار کی نثر بنا لینے کے علاوہ، آسان لفظوں میں، ان کے مطالب اور نثری سبق کے خلاصے لکھ سکیں۔ نظم کے سلسلے میں بند اور نثر کے بارے میں پیراگراف کا تصور اُن کے ذہنوں میں واضح ہو سکے، اُن سے یہ بھی توقع کی جائے گی کہ اُنہیں متعدد کہانیاں اور نظمیں زبانی یاد ہوں اور وہ انہیں صحت کے ساتھ اپنی تقریر و تحریر میں استعمال بھی کر سکتے ہوں۔

وسطانی درجوں یعنی ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طلبہ میں اتنی قابلیت ضرور آجانی چاہئے کہ وہ نصابی کتابوں کے علاوہ اپنے پسند کے موضوعات کی بعض دوسری کتابوں کے مطالعہ کے شوق میں کتب خانوں سے رجوع کر سکیں ان جماعتوں میں خاموش مطالعہ کی عادت ایسی راسخ ہو جانی چاہئے کہ طلبہ جماعت کے باہر اور اندر، ہر جگہ خاموش مطالعہ سے پوری طرح کام لینے لگیں مباحثوں اور دوسرے تقریری یا تحریری مقابلوں میں حصہ لینے کے ساتھ طلبہ میں اتنی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہو جانا چاہئے کہ وہ اپنے دلچسپی کے مضامین و تقاریر پر آپس میں تبادلۂ خیال اور رائے زنی کر سکیں، کچھ متفرق اشعار، نظم کے ٹکڑے اور نثری اقوال بھی اُن کے حافظے میں اس طرح رہنا چاہئے کہ وہ حسب ضرورت اُنہیں اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کر سکیں۔ نظم و نثر کی تشریح اور خلاصوں کے سلسلے میں اُن کی تحریر کا انداز محض بیانیہ نہیں بلکہ قدرے تخئیل آمیز اور فکر انگیز ہونا چاہئے یعنی طلبہ کی تحریر و تقریر سے یہ پتہ چلنا چاہئے وہ اپنے ذہن میں محفوظ معلومات کو فکر و تخئیل کی مدد سے، تھوڑی بہت رنگ آمیزی، ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کے ساتھ بھی پیش کر سکتے ہیں یا نہیں، جن شعراء و مصنفین کی تخلیقات اُن کے نصاب میں شامل ہوں، ضروری ہے کہ طلبہ اُن میں سے اکثر کے حالات زندگی اور شخصیت سے واقف ہوں یا واقف ہونے کی خواہش رکھتے ہوں۔ مرکب الفاظ کی تشریح، تلمیح اور تشبیہ کی تعریف مختلف مصادر سے بنے ہوئے محاورات کے استعمال، محاورہ اور ضرب المثل کا فرق، قواعد کے اہم صرفی اجزاء مثلاً اسم، صفت، فعل، ضمیر، حرف وغیرہ کی اقسام اور فرہنگ و لغات کے استعمال سے آگاہی بھی، ان جماعتوں میں اردو تدریس کے مقصد و معیار کا جزو خاص ہونا چاہئے۔

نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کے لئے محض نثر و نظم کی تفہیم کافی نہ سمجھی جائے گی بلکہ زبان و بیان کی لفظی خوبیوں کے ساتھ ساتھ عبارت و اشعار کے معنوی محاسن کا بھی اُنہیں احساس دلانا ہوگا، شاعری کی اصناف میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور جدید نظم وغیرہ اور اصناف نثر میں، قصہ، افسانہ، ناول، سوانح عمری اور مضمون وغیرہ کے فنی لوازم اور ہر صنف ادب کے ممتاز شعراء و مصنفین کے اوصاف کلام اور سوانح حیات کو بھی ان طلبہ کی واقفیت اور معلومات کا اہم جزو سمجھا جائے گا اُن سے یہ بھی توقع کی جائے گی کہ وہ دوسرے مضامین کو بھی اُردو میں بہ آسانی لکھ پڑھ سکیں گے اور زندگی کے سارے شعبوں میں وسیلۂ اظہار کے طور پر اُردو سے کام لے سکیں گے، تقریر و تحریر دونوں میں یہ بھی دیکھا جائیگا کہ اُن کا لب و لہجہ کتنا پُراثر اور اُن کا طریقۂ اظہار کتنا جامع اور انفرادی ہے، اور وہ اپنی تخلیقی و استحسانی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لا رہے ہیں۔ اپنی پسند کے شعراء کی متعدد غزلیں، نظمیں اور قطعات و رباعیات بھی اُن کے حافظے میں رہنا ضروری ہے۔ نصاب سے الگ بعض ممتاز شعراء کے حالات و کلام سے بھی اُنہیں کچھ نہ کچھ واقفیت ہونی چاہئے، صحت تلفظ اور الفاظ و محاورات کا صحیح استعمال بھی طلبہ کی زباندانی کا ایسا جزو ہونا چاہئے کہ وہ ہر قسم کی تقریر و تحریر میں اُن کی غلطیوں کو محسوس کر سکیں۔ واحد و جمع کے قاعدے تذکیر و تانیث کے اصول، اضافت کی قسمیں، مرکب الفاظ کی مختلف صورتیں اور رموز اوقاف کو برتنے کے طریقوں سے آگے بڑھ کر جملوں کی ساخت، اقسام اور نحو کے بعض دوسرے قاعدے بھی اچھی طرح اُن کے ذہن نشین ہونا چاہئے۔ نصاب کے ساتھ ساتھ، ایک خاص معیار کی غیر نصابی تحریروں کی موثر قرأت اور تفہیم و تحسین کی بھی اُن سے توقع کی جائے گی۔

یہ ہیں وہ چند باتیں، جو ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اُردو تدریس کے مقصد و معیار کا تعین کرتی ہیں، اُنہیں مقاصد و معیار کو ذہن میں رکھ کر اُردو کے ہر معلم کو مختلف جماعتوں میں تدریس کے لئے طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے، وجہ یہ ہے کہ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک ہر جماعت کے طلبہ کے لسانی مسائل، نفسیاتی تقاضے، ذہنی رجحانات اور علمی و فنی ضرورتیں الگ الگ ہیں اور جب تک ان سب کا الگ الگ لحاظ رکھ کر کام نہ کیا جائیگا زبان کی تدریس موثر اور کارآمد نہ ہوگی۔

اُردو تدریس کے تین بنیادی مقاصد

بولنا ــــــــ پڑھنا ــــــــ لکھنا

اور

اُن کے حصول کا طریقۂ کار

۱۔ بولنا اُردو تعلیم کے تین اہم اجزاء ہیں ۔ بولنا ۔ پڑھنا اور لکھنا ۔ ماہرین تعلیم بالاتفاق اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ بچّے کو سب سے پہلے بولنے کی رغبت دلانی چاہیئے ۔ کیونکہ زبان کا یہی ایک ایسا پہلو ہے ۔جس سے بچے آنکھ کھولتے ہی دوچار ہوتے ہیں وہ اپنے معاشرے اور گھر سے کچھ اور سیکھ کر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں لیکن کسی نہ کسی معیار کا بولنا ضرور سیکھ کر آتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے ماحول میں زبان کے جس شعبے کی سب سے زیادہ کارفرمائی دیکھتے ہیں وہ یہی بولنا ہے ۔ چھ سات سال کی عمر تک گھر اور باہر کی فضائیں انہیں جس چیز کی حکمرانی نظر آئی ہے وہ صرف تقریر یا بولنا ہے ۔ ماں باپ ۔ بھائی بہن ۔ دوست ۔ دشمن رشتہ دار ۔ نوکر چاکر ۔ پڑوسی ۔ مہمان ۔ راہ گیر ۔ گداگر ۔ دکاندار ۔ خونچہ بردار ، چھوٹے ، بڑے بوڑھے ، جوان ۔ مرد ۔ عورت ۔ عالم ، جاہل حتیٰ کہ بعض جانور اور پرندے مثلاً کتا ۔ بلی ۔ طوطا مینا تک سبھی کسی نہ کسی طور پر آواز لگاتے اور بولتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ کھانا ۔ پینا ۔ اُٹھنا ۔ بیٹھنا ۔ نہانا ۔ دھونا ۔ لکھنا پڑھنا ۔ کھیل کود ۔ خرید و فروخت غرض ہر قسم کے کام ہیں وہ کم و بیش بولنے کا اثر و نفوذ پاتے ہیں غرض کہ سماجی زندگی کا انہیں کوئی ایسا پہلو نظر نہیں آتا جس میں بولنے سے مدد نہ لی جاتی ہو ۔ علاوہ بریں خود بچّوں میں بولنے کی صلاحیت جبلّی ہوتی ہے ۔ یہ جبلّی صلاحیت معاشرے کی اثر پذیری سے بہت جلد روبکار آجاتی ہے اور بچّے بہت جلد روزمرہ کی بول چال سے تھوڑی بہت

واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ واقفیت سابقہ معلومات کی حیثیت سے بچوں کو نئی چیزیں سکھانے میں معاونت کرتی ہے اس سے معلوم/نامعلوم اور آسان سے پیچیدہ اصول کے ماتحت بچوں کو پڑھنا یا لکھنا سکھانے میں قدرے سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بولنے یا تقریر کرنے کی مدد سے جب بچے اپنی بات دوسروں تک پہونچا دیتے ہیں تو اپنے اندر ایک طرح کی طمانیت اور خوشی محسوس کرتے ہیں اور خود کو وقیع و مہذب خیال کرنے لگتے ہیں۔ نتیجتہً انہیں زبان کی افادیت اور عملی زندگی میں اس کے اثر و رسوخ کا احساس قوی ہو جاتا ہے۔ یہی احساس زبان سے بچوں کی دلچسپی بڑھاتا ہے اور یہی دلچسپی نہ صرف یہ کہ لکھنے اور پڑھنے کے مرحلوں کو آسان بنا دیتی ہے بلکہ آگے چل کر انہیں عالم زبان۔ شاعر۔ ادیب۔ انشاء پرداز اور مقرر بننے میں مدد کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح اُردو بولنے پڑھنے اور لکھنے کا مدار بڑی حد تک صحیح اُردو بولنے پر ہے۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ لوگ جیسا بولتے ہیں ویسا ہی لکھتے ہیں۔ جنہوں نے تقریر یا بولنے کی مشق بہم پہونچالی ہے انہیں پڑھنے لکھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔ جو اثر و حسن ان کے زبانی اظہار خیال میں نمایاں ہوتا ہے وہی پڑھنے یا لکھنے میں بھی کم و بیش برقرار رہتا ہے۔ مزید براں بچوں کو بولنے کی مہارت ان کی سیرت و کردار کی تعمیر میں بھی مدد کرتی ہے۔ غرض بولنے کا عمل زبان کی تدریس میں نہایت مفید ہے۔ ہمیں عملی زندگی میں تقریر یا بولنے سے جس قدر سابقہ پڑتا ہے اس قدر لکھنے پڑھنے سے واسطہ نہیں رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم ابتدائی مدرسوں میں زبانی یا تقریری کام پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں اور بولنا سکھانے سے مقدم واہم خیال کرتے ہیں۔

بولنے کی اہمیت سمجھ لینے کے بعد آئیے ابتدائی مدرسوں میں بولنا سکھانے کی نوعیت اور اس کے معیار اور طریقہ کار پر غور کریں۔ عام طور پر بچے جن مشاغل سے دلچسپی لیتے اور جن موضوعات پر بات چیت کرنا پسند کرتے ہیں اس کی تفصیل تدریس کے مقصد و معیار کے باب میں دی جا چکی ہے اور بچوں کے مذاق و رجحان سے تعلق رکھنے والے اشخاص و مقامات اور اشیاء و موضوعات کا ایک خاکہ بھی بلحاظ جماعت دیا جا چکا ہے۔ اس جگہ صرف اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جو بچے مدرسے میں آتے ہیں وہ مختلف حیثیت کے خاندانوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے گھریلو ماحول و تربیت کے زیر اثر مختلف قسم کے لب و لہجے لے کر آتے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے بچے ہوتے ہیں جو صحیح اور موثر لب و لہجے کے ساتھ اُردو میں زبانی اظہار خیال کر سکتے ہوں۔ بعض بچوں کا ش۔ ق۔ درست نہیں ہوتا۔ بعض غلط

تلفظ ادا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بعض بچے ضرورت سے زیادہ مدھم اور بعض ضرورت سے زیادہ بلند آواز سے بولتے ہیں۔ بعض اتنا ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں کہ سننے والے کو ان کی گفتگو سے الجھن ہونے لگتی ہے اور بعض تیز رفتاری سے بولتے ہیں کہ ان کی بات کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض بچے بغیر سوچے سمجھے بولتے چلے جاتے ہیں بعض غور و فکر میں اتنا زیادہ وقت لیتے ہیں کہ ان کی گفتگو کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ بعض بچے ہکلاتے ہیں یا تتلانے کی وجہ سے صحیح اور مناسب طریقے سے نہیں بول سکتے بعض بچے کسی خاص لفظ کی تکرار یا تکیہ کلام کے استعمال سے اپنے اظہار خیال کو بے لطف اور پھیکا بنا دیتے ہیں کچھ بچے ساکت و جامد کھڑے رہ کر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور بے جان گفتگو کرنے کے عادی ہوتے ہیں کچھ بے ضرورت حرکات و سکنات سے کام لیتے ہیں اور بے سبب ہاتھ پیر اور گردن ہلا کر اپنی گفتگو کو مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ بعض بچے طبعاً شرمیلے ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کرتے بعض معلم کے خوف سے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ بعض کو طبعاً زیادہ بولنے کی عادت ہوتی ہے اور بعض بچے فطرتاً خاموش طبع اور کم سخن ہوتے ہیں غرض جو بچے مدرسے میں داخل ہوتے ہیں ہرچند کہ وہ اپنے گھروں سے کم و بیش بولنا سیکھ کر آتے ہیں پھر بھی ان کے انداز تقریر اور بولنے کے لب و لہجے میں مختلف قسم کی بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں۔

بولنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی ان کمزوریوں کو رفع کیا جائے اور انہیں صحیح تلفظ اور درست لب و لہجے کے ساتھ بات کرنے کا عادی بنایا جائے۔ صحیح تلفظ اور درست لب و لہجے میں بولنے کا مفہوم یہ ہے کہ بچے جو کچھ بولتے ہوں ش۔ق کی درستگی کے ساتھ بہت واضح اور صاف بولتے ہوں۔ حروف و الفاظ اور مرکبات کی آوازیں صحیح مخرج سے نکالتے ہوں الفاظ کا تلفظ لغت اور روزمرہ کے مطابق ادا کرتے ہوں۔ بات کرنے میں مناسب آواز و رفتار کو ملحوظ رکھتے ہوں۔ جو کچھ بولتے ہوں سوچ سمجھ کر بولتے ہوں۔ رواں بولتے ہوں اور بولنے میں زیادہ وقت نہ لیتے ہوں جو کچھ بچے بولتے ہوں وہ بے معنی اور مبہم نہ ہو بلکہ واضح اور بامعنی ہو۔ الفاظ و محاورات کا استعمال درست ہو فقروں کی ساخت اور جملوں کی بناوٹ قواعد و روزمرہ کے مطابق ہو۔ آواز ایسی مناسب و موزوں ہو کہ سننے والے آسانی سے سن سکیں، سمجھ سکیں اور لطف اندوز ہو سکیں۔ بچے جو کچھ بول رہے ہوں۔ خود اعتمادی اور آزادی سے بول رہے ہوں۔ اپنی گفتگو کو موثر بنانے کے لئے ضروری حرکات و سکنات سے بھی کام لیتے ہوں اور اظہار خیال کے بعد وہ خوشی اور طمانیت بھی محسوس کرتے ہوں جو اپنی بات

دوسروں تک پوری پہونچانے کے بعد انسان کو میسر آتی ہے ۔ یہ چند چیزیں ابتدائی مدرسوں میں بولنا سکھانے کے لئے معیار کا تعین کرتی ہیں اور اُسی معیار کا حصول دراصل بولنا سکھانے کا عین مقصد ہے

صحیح بولنے کے اس معیار و مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ذہنوں کو ہر قسم کے خوف وہراس سے پاک کیا جائے ۔ مدرسے کی فضا کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار ۔ دلچسپ اور گھریلو زندگی کی طرح شفقت آمیز و بے تکلف بنایا جائے جب تک ایسا نہ کیا جائے گا بچے بولنے یا بات کرنے کی ہمت نہ کریں گے ۔ ان کی جھجک اور شرمیلے پن کو دور کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ معلمین بچوں کے لئے اپنے طرز عمل میں ماں باپ کی سی شفقت و محبت اور مدرسوں کی فضا میں گھر جیسی آسائش و آزادی کی فضا پیدا کریں ۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بچے عام طور پر شرم ۔ جھجک ۔ احساس کمتری یا خوف کی وجہ سے زبان کھولنے میں ہچکچاتے ہیں ۔ یہ چیزیں گویا اظہار خیال کی دشمن ہیں اور جب تک بچوں کے ذہن و دل سے ان چیزوں کو دُور نہ کیا جائے بچوں کے بولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ ملی ، شفیق و مہربان استاد موقع بہ موقع بچوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان چیزوں کو بڑی آسانی سے بچوں کے ذہن سے نکال سکتا ہے اور انہیں زیادہ سے زیادہ بولنے پر آمادہ کر سکتا ہے ۔

صحیح اردو بولنا سکھانے میں اُردو کے معلم کا بڑا دخل ہوتا ہے معلم ہی کی توجہ اور دلچسپ تدریس کی بدولت بچوں میں موثر انداز میں اردو بولنے کے ساتھ اُردو مطالعے کا مستقل شوق پیدا ہوتا ہے اور معلم ہی کی بے قرینہ تدریس اور عدم توجہ کے سبب وہ اُردو زبان سے بیزاری محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ اس لئے معلم کو اپنے ش ۔ ق اور لب ولہجہ کی طرف بھی توجہ رکھنی چاہئے بچوں کے سامنے بولنے میں خاص احتیاط سے کام لینا چاہئے ۔ جن الفاظ کے تلفظ و استعمال میں شبہ ہو پہلے ان کی تصدیق کر لینی چاہئے اس کے بعد تقریر و تحریر میں استعمال کرنا چاہئے بغیر اس کے زبان کی تدریس میں بچوں کی صحیح رہنمائی نہیں کی جا سکتی ۔ معلم کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات بچوں کے لئے سند کی حیثیت رکھتی ہے وہ آنکھ بند کر کے اس کی تقلید کرتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معلم کے تلفظ ولب ولہجے کی کمزوریاں بچوں کے ذہن میں بھی رچ بس جاتی ہیں اور پھر ان کا ازالہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے چونکہ بولنا سکھانے میں کتاب کے بجائے صرف زبانی اظہار خیال اور باہم بات چیت سے مدد لی جا سکتی ہے اس لئے نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ معلم ہمیشہ مصدقہ و مروجہ تلفظ اور موثر لب ولہجے کے ساتھ بچوں سے

ہم کلام ہو اور دانستہ یا نا دانستہ زبان و بیان کی ایسی غلطیاں نہ کرے جن کی تقلید بچوں کی زباندانی میں حارج ہو سکتی ہو۔

اس سلسلے میں ایسے تدریسی طریقوں کا انتخاب بھی مفید ہوگا جن میں بچوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اس کے لئے "منصوبہ بندی" اور کھیل کھیل میں تعلیم کے اصول خاص طور پر مدد دے سکتے ہیں۔ منصوبہ بندی طریقہ تدریس میں چونکہ بچے اپنے ہم جولیوں اور ہم جماعتوں کے ساتھ مل جُل کر بیٹھتے ہیں اور کام کرتے ہیں اس لئے باہم بات چیت اور تبادلۂ خیال کا جیسا موقع انہیں اس میں ملتا ہے وہ جماعت میں نصیب نہیں ہوتا۔ کھیل کھیل میں تعلیم کا طریقہ کار اس سے بھی زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ کھیل سے دلچسپی لینا بچوں کی فطرت ہے۔ کھیل میں وہ جیسی آزادی و خوشی محسوس کرتے ہیں وہ کسی اور کام میں محسوس نہیں کرتے۔ کھیلوں میں چونکہ معلم کی شخصیت کم سے کم دخیل ہوتی ہے اور سارا عمل خود بچے کرتے ہیں اس لئے انہیں اپنے ساتھیوں میں بے جھجک ہو کر زیادہ بے تکلفی اور بے باکی سے ہنسنے بولنے کا موقعہ ملتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں جوش و خروش اور آزادی سے کہتے ہیں رفتہ رفتہ ان کے ذہن سے خوف یا جھجک نکل جاتی ہے وہ رواں اُردو بولنے کی مشق بہم پہونچا لیتے ہیں اور پھر انہیں جماعت یا جماعت کے باہر کہیں بھی بولنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

بچے کی انفرادی بول چال اور لب و لہجے کا مطالعہ بھی اس ضمن میں نہایت سود مند ہوگا انفرادی مطالعے کی مدد سے اس بات کا پتہ لگانا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر بعض بچے صحیح تلفظ اور درست لب و لہجے کے ساتھ بولنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں جو بچے محض خوف کی وجہ سے جماعت میں خاموش بیٹھے رہتے ہیں ان سے خصوصی شفقت کا برتاؤ روا رکھا جائے اور جماعت سے الگ نجی مشغلوں کے ذریعے انہیں بولنے کا موقع دیا جائے۔ شرمیلے اور ضرورت سے زیادہ کم سخن بچوں کو کھیل کود اور منصوبہ بندی کے طریقوں میں خاص طور پر شامل کیا جائے اور موقع بہ موقع ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ جو بچے عضویاتی یا کسی حسّی کمزوری کی بناء پر صحیح اُردو بولنے سے قاصر ہیں طبّی امداد اور معائنے کے ذریعے ان کی کمزوریوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے جو بچے اُردو میں کمزور ہیں اور جماعت میں احساس کمتری کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی طرف انفرادی توجہ کرنی چاہئے اور خصوصی ہمت افزائی سے کام لینا چاہئے۔ بعض بچے اپنے گھر کی تربیت کے زیر اثر غلط تلفظ کے عادی ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر والدین

اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ پیار میں چبا چبا کر اور تتلا تتلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس سے بچوں کے کان حروف کی غلط آوازوں سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ اور غلط تلفظ اس طرح زبان زد ہو جاتے ہیں کہ ان کی درستگی دشوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے مل کر انہیں مشورہ دینا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں سے حتی الوسع صحیح زبان میں بات چیت کیا کریں۔ جب تک بچوں کے لب و لہجے کی یہ انفرادی کمزوریاں نظر میں نہ رکھی جائیں گی اور ان کو رفع کرنے کی انفرادی تدبیریں نہ کی جائیں گی بچوں کو صحیح اور موثر اردو بولنے کا ڈھنگ نہ آئے گا۔

بولنا سکھانے کے سلسلے میں بڑی ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ تقریری یا زبانی کام کو ابتدائی مدرسوں کے نصاب میں خاص اہمیت دی جائے۔ زبانی اظہار خیال کو بچوں کے امتحانات کا ایک جزو قرار دیا جائے۔ باہم گفتگو اور بات چیت کے لئے الگ گھنٹے مقرر کئے جائیں اور تدریسی عمل میں بچوں کو زیادہ سے زیادہ زبانی اظہار خیال یا تقریری مشق کا موقع دیا جائے۔ اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں مثلاً ایسے تدریسی کھیلوں کا انتخاب کیا جائے جس میں بولنے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت پیش آئے۔ انہیں اپنے محبوب مشغلوں اور چیزوں پر اظہار کرنے کا موقع دیا جائے انہیں پہلے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں سُنائی جائیں۔ پھر ان سے وہی کہانی سُنانے کے لئے کہا جائے نئی نئی چیزیں اور مقامات دکھا کر انہیں زیادہ سے زیادہ سوالات کا موقع دیا جائے اور تسلی بخش جوابات کے ذریعے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ عام تدریس میں زیادہ بولنے یا سب کچھ بتا دینے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ درمیان درمیان مناسب سوالات کے ذریعہ ہر بچے کو جواب دینے یا بولنے کا انفرادی موقع دیا جائے۔ کہانی کے بعض اجزاء انہیں بتا دیئے جائیں اور بعد ازاں کہانی مکمل کر کے سُنانے کو کہا جائے۔ تصویری کہانیاں اس سلسلے میں اور مفید ہونگی۔ تصویروں پر معلم سوال کرتا رہے اور بچے جوابات کے ذریعے کہانی مکمل کرتے چلیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچے اپنی پسند کی کہانیاں سُنائیں یا تصویری کہانیوں کو خود مکمل کر کے پیش کریں۔ نظم خوانی اور گانوں سے بھی بچوں کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے یہ چیزیں بولنا سکھانے میں بہت مدد دے سکتی ہیں پہلے بچوں کے سامنے گانا گایا جائے یا نظم پڑھ کر سنائی جائے پھر ان سے اسی نظم کو دہرانے یا کوئی نیا گانا سنانے کو کہا جائے۔ نظم خوانی یا گانوں کا مشغلہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے مفید ہو سکتا ہے

بچے الگ الگ بھی گا سکتے ہیں اور کئی بچے مل کر ترانے کی شکل میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ قصّہ گوئی اور بیت بازی کے مقابلے بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ بچے چونکہ دوسروں کی نقل اُتارنے اور آواز نکالنے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لئے مکالمے۔ ڈرامے اور نظمیں بولنا سکھانے میں سب سے زیادہ کارآمد ہونگی۔ اسی کے ساتھ اگر یہ بھی کیا جائے کہ بچوں سے کبھی ان کی نجی زندگی ان کی دلچسپیوں اور مشغلوں کے متعلق بات چیت کی جائے یا ان سے اپنے اپنے گھروں کی روزانہ اہم خبریں سُنانے اور زبانی پیغام دوسروں تک پہونچانے کا موقع دیا جائے تو وہ بہت جلد بولنے میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس عمل میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ بچوں کی غلطیاں ان کے بولنے کے دوران فوراً درست نہ کی جائیں۔ یہ اصلاح ان کے لئے بڑا حوصلہ شکن ہوگی۔ ان کی غلطیاں انفرادی یا اجتماعی طور پر باتوں باتوں میں اس طرح درست کی جائیں کہ بچوں کو ان کا احساس کم سے کم ہونے پائے۔

۲۔ پڑھنا پڑھنا اور لکھنا زبان کی تعلیم کے سب سے اہم اجزاء ہیں۔ بغیر ان کے اردو تدریس کا کوئی مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک بولنے کا تعلق ہے ہر بچے میں اس کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت ماحول کے زیر اثر خود بخود عمل میں آجاتی ہے۔ چنانچہ بعض ایسے بچے مل جائیں گے جو پڑھنے لکھنے سے ناآشنا ہونے کے باوجود خاصی صاف ستھری اور رواں اردو بولتے ہیں لیکن پڑھنے اور لکھنے کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ یہ چیزیں دراصل اکتسابی ہیں۔ ان کے حصول کیلئے شعوری توجہ اور کوشش کی ضرورت ہے۔ جب تک ان کے سیکھنے سکھانے کا خاص اہتمام نہ کیا جائے کوئی بچہ صرف اپنے ماحول کے اثر سے پڑھنے یا لکھنے کے فن سے کماحقہٗ واقف نہیں ہو سکتا۔ انہیں دونوں چیزوں کی تدریس کے لئے دراصل رسمی تعلیمی ادارہ یعنی مدرسہ وجود میں لایا گیا ہے اور جب تک کوئی شخص بولنے کے ساتھ لکھنے اور پڑھنے میں مشق و مہارت نہ حاصل کر لے اسے تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔

زبان کی تدریس میں "پڑھنے" کا فن بعض وجوہ سے "لکھنے" سے بھی زیادہ اہم خیال کئے جانے کے لائق ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک کوئی بچہ کم و بیش پڑھنے سے آشنا نہ ہو اسے لکھنا سکھانا بہت مشکل ہے۔ پڑھنے کا عمل چونکہ لکھنا سکھانے میں براہِ راست مدد کرتا ہے۔ اس لئے ماہرینِ تعلیم نے

اردو زبان کی تدریس میں لکھنا سکھانے سے پہلے پڑھنا سکھانے کی سفارش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پڑھنا ہی آگے چل کر مطالعہ کا ذریعہ بنتا ہے یہ زبان کی تدریس کا سرچشمہ ہے بغیر اس کے علم میں وسعت و گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ بچوں میں اردو کے مطالعے کا مستقل شوق پیدا کرنا اور ماضی کے علمی و ادبی سرمایہ سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کو اُبھارنا زبان کی تدریس کا نہایت اہم مقصد ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ بچے پڑھنا جانتے ہوں اور اس معیار کا پڑھنا جانتے ہوں کہ اسلاف کے تحریری کارناموں سے پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہوں۔ چنانچہ جس بچے نے اپنے اندر پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلی ہے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے اوپر علم کے دروازے کھول لئے ہیں اور وہ ہر قسم کی تعلیم کی مشکل سے مشکل منزلیں بڑی آسانی سے طے کرے گا۔

بولنے اور پڑھنے میں چونکہ گہرا تعلق ہے۔ اس لئے بچوں کے پڑھنے میں بھی عموماً اسی قسم کی کمزوریاں نظر آئیں گی جن کا ذکر بولنے کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ رہا یہ سوال کہ بعض بچے پڑھنے میں کیوں کمزور ہوتے ہیں اس کے جواب میں ماہرینِ تعلیم نے ذیل کے چند اسباب بیان کئے ہیں۔

۱۔ یہ بچے اکثر ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ذہنی طور پر بہت پسماندہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو کسی قسم کی ذہنی تربیت نہیں دے سکتے۔

۲۔ بار بار مدرسہ تبدیل کرنے کی وجہ سے تدریس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور بچے تدریس سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا پاتے۔

۳۔ مدرسے سے اکثر غیر حاضر رہنے کی وجہ سے بعض بچے اردو کے نہایت ضروری اسباق و اقدامات سے محروم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کی تلافی نہیں ہو پاتی۔

۴۔ بعض بچے اعصابی کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور بروقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ کمزوریاں پڑھنے کے عمل میں مستقل حارج رہتی ہیں۔ مثلاً بعض بچے قوت مشاہدہ یا بصارت کی کمزوری کی وجہ سے حروف کے اجزاء کو الگ الگ پہچانتے ہیں اور متحد الصورت حروف کی آواز پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔

۵۔ طریقہ تدریس کی پے در پے تبدیلیوں یعنی بچوں کو چند دن عام ابتدائی مدرسہ میں چند دن

کسی خاص مدرسہ میں۔ چند دن کسی کنڈر گارٹن اور چند دن کسی مانٹسوری طرز کے مدرسے میں رکھنے سے یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص و مستقل لب و لہجے سے مانوس نہیں ہو پاتے۔

۶۔ کسی خاص طریقہ تدریس کی سخت پابندی بھی بعض بچوں کے لئے غیر دلچسپ ہوتی ہے مثلاً بعض بچے حروف تہجی کی مدد سے پڑھنے میں جلد کمال حاصل کر لیتے ہیں اور بعض جملہ واری طریقوں سے جلد پڑھنے میں مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔

۷۔ بعض بچے بہت کمسن ہوتے ہیں ان کو قبل از وقت یعنی کسی قسم کی دلچسپی پیدا ہونے سے پہلے پڑھنا سکھانا شروع کر دیا جاتا ہے۔

۸۔ پڑھنا ایک سنجیدہ عمل ہے اس کے لئے جس قسم کے ذہن و ادراک اور عضویاتی شرکت کی ضرورت درکار ہے بعض بچوں میں نہیں ہوتی۔ یعنی ان میں زبان ہلانے۔ لبوں کو ملانے۔ حلق سے آواز نکالنے۔ حروف کے اجزا اور ان کی سالم صورتوں کو پہچاننے کی صلاحیت دوسروں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

۹۔ بعض بچوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سابقہ معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

۱۰۔ کچھ بچے نہایت شرمیلے اور احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ کچھ عدم اعتماد اور خوف و ہراس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

۱۱۔ بعض معلمین کے پڑھنے میں ایسی کمزوریاں ہوتی ہیں کہ ان کی مثالی قرات بچوں کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی۔

۱۲۔ تدریس دلچسپ اور موثر نہ ہونے کی وجہ سے بعض بچے درس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔

۱۳۔ انہیں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی مشق پوری طرح نہیں کرائی جاتی۔

۱۴۔ پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں اس محنت و توجہ سے کام نہیں لیا جاتا جو ابتدائی مدرسوں کے لئے ضروری ہے۔

۱۵۔ پڑھنا سکھانے سے پہلے بچوں سے زبانی کام کی بھرپور مشق نہیں کرائی جاتی۔ اس لئے وہ حرف و صوت کا احساس یا مختلف آوازوں میں فرق قائم نہیں کر سکتے۔

ان سارے اسباب کو نظر میں رکھ کر ہر بچے کی انفرادی کمزوریوں کو دور کرنے کی تدبیریں نکالنا اور بچوں کو بہ حیثیت مجموعی موثر اور صحیح قرات کے ڈھب پر لگانا مدرسہ اور معلم دونوں کا مشترکہ فرض ہے۔ موثر اور صحیح پڑھنا سکھانے سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں صرف ان امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ بچے جو کچھ پڑھیں ش۔ق درست کر کے پڑھیں۔ موقع محل اور نفس مضمون کا لحاظ رکھ کر ہر عبارت کو مناسب اور موثر لب ولہجہ کے ساتھ پڑھیں وہ جو کچھ پڑھ رہے ہوں توجہ سے پڑھ رہے ہوں اور اس کا مفہوم خود بھی سمجھ رہے ہوں حسب ضرورت بلند آواز سے پڑھ سکتے ہوں اور خاموش مطالعے سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہوں ہر تحریر کو مناسب فاصلے پر رکھ کر پڑھ سکتے ہوں اور پڑھنے میں رموز اوقاف کا لحاظ رکھتے ہوں۔

جہاں تک ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں بچوں کے پڑھنے کے معیار و مقدار کا تعلق ہے اس کی تفصیل اُردو تدریس کے مقصد و معیار کے باب میں دی جا چکی ہے اور اس جگہ اس کا دُہرانا تحصیل حاصل ہے۔ اس پر البتہ غور کرنا ہے کہ اُردو میں پڑھنا سکھانے کے لئے کون سا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے۔ قبل اس کے کہ ہم کسی خاص اصول یا طریقہ تدریس کی تفصیل میں جائیں اس بات کا دُہرانا نہایت ضروری ہے کہ مدرسے کی جس خوشگوار فضا معلم کی جس شفقت و محبت۔ نصاب کی جس جامعیت و جاذبیت اور تربیت و اصول تعلیم کی جس پیروی کو بولنے کے سلسلے میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ پڑھنا سکھانے میں بھی ان کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔ یوں پڑھنا سکھانے میں ہمارے یہاں بالعموم دو طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک ترکیبی طریقہ اور دُوسرا تحلیلی طریقہ۔

(۱) ترکیبی طریقہ پڑھنا سکھانے کا قدیم مشرقی طریقہ ہے۔ اس میں بچّے کو پہلے حروف تہجی سکھائے جاتے ہیں۔ یعنی الف سے لیکر ے تک کے حروف کا بتدریج تصور دلایا جاتا ہے۔ جب سارے حروف بچوں کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں تو انہیں اعراب یعنی زیر زبر پیش کی طرف مائل کیا جاتا ہے پہلے تمام حروف پر زبر دے کر پھر زیر اور پیش دے کر بچوں سے پڑھوانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اعراب کی شناخت کے بعد دو حرفی سادے الفاظ مثلاً جب تب۔ کم وغیرہ کے قسم کے الفاظ سامنے لائے جاتے ہیں بعد ازاں سہ حرفی و چہار حرفی الفاظ بتدریج پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل ہجے کے ذریعے ہوتا ہے۔ بچے معلم کی مدد سے ہر لفظ کو ہجے کے ذریعے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ اتنی مشق بہم پہونچا لیتے ہیں کہ وہ

اس کی مدد سے نئے الفاظ وعبارت کسی کی مدد کے بغیر پڑھنے لگتے ہیں۔ چونکہ اس طریقہ میں اے ی تک سارے حروف تہجی ترتیب کے ساتھ ہجے لگوا کر پڑھائے جاتے ہیں اس لئے اس طریقہ کو الف بائی یا تہجی طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اُردو کی تدریس میں یہ طریقہ صدیوں سے رائج ہے اور آج بھی بعض معلمین اس طریقہ کار کو پسند کرتے ہیں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حروف کی سالم شکلیں اور ان کے اجزاء پوری طرح بچوں کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ حروف کے مختلف جوڑوں اور شوشوں کی شناخت بچے آسانی سے کر لیتے ہیں انہیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی شروع کرایا جا سکتا ہے اور معلم بغیر کسی خاص تیاری یا محنت کے درس دے سکتا ہے۔ ہجے کی مدد سے بچے کچھ دنوں بعد نئے نئے الفاظ پڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذخیرہ الفاظ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگتا ہے۔ بچے تلفظ یا املا کی غلطیاں بہت کم کرتے ہیں اور انہیں لکھنا سکھانے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوتی۔

لیکن اس طریقہ تدریس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے یہ طریقہ بچوں کی فطرت کے خلاف اور مصنوعی ہے بچے عام طور پر پہلے پوری چیز کی طرف لپکتے ہیں۔ وہ اس کے اجزاء پر نظر نہیں ڈالتے یہی سلسلہ الفاظ کے ساتھ ہے وہ اپنے ماحول کے زیر اثر پورے پورے فقرے یا الفاظ سنتے اور بولتے ہیں۔ الفاظ کے اجزاء یعنی حروف کی الگ الگ آوازوں سے نہ تو انہیں کوئی واسطہ پڑتا ہے اور نہ وہ کبھی بولتے ہیں۔ اس لئے یہ طریقہ غیر طبعی ہے اور بچے اس سے خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر سکتے اور جس چیز سے بچے دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے اس کے سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے میں یقیناً انہیں دشواری ہوگی اس طریقہ تدریس سے تعلیم کا ایک اور اہم اصول مجروح ہوتا ہے۔ درس ہمیشہ معلومات سابقہ کی مدد سے دینا چاہئے اور معلوم چیزوں کو نامعلوم چیزوں کے جاننے کا ذریعہ بنانا چاہئے ظاہر ہے کہ بچے الفاظ و فقرات سے مانوس ہوتے ہیں وہ حروف یا حروف کی جداگانہ آوازوں سے واقف نہیں ہوتے اس لئے سابقہ معلومات کی حیثیت سے جو چیز بچوں کے پاس رہ جاتی ہے وہ حروف نہیں الفاظ ہیں اس لئے حروف کی مدد سے انہیں الفاظ کی طرف رجوع کرنا عام اصول تعلیم کے منافی ہے۔ مقرون سے مجرد یا محسوس سے نامحسوس کی طرف چلنے کا اصول بھی اسی طریقے سے مجروح ہوتا ہے الفاظ و فقرات چونکہ بامعنی ہوتے ہیں اس لئے بچے ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ ان کے اثرات کو محسوس کرتے ہیں

اور عملی زندگی کا ایک جزو سمجھ کر ان سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس حروف تہجی الگ الگ ان کے لئے بے معنی غیر مانوس اور بے کیف ہوتے ہیں اس لئے وہ طبعاً اس طریقہ تدریس سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کرسکتے اور بچوں کا سبق سے دلچسپی کا اظہار نہ کرنا درس کی سب سے بڑی خامی ہے۔

اسی طریقہ میں ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ بچے حروف کی انفرادی آوازوں سے جلد آشنا نہیں ہوپاتے اردو کے اکثر حروف ایسے ہیں جن میں کئی کئی حروف کی آوازیں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً الف۔ د۔ ح۔ سین۔ میں ہر حرف اپنے اندر تین حروف کی آوازیں رکھتا ہے اور بچے کے لئے یہ بہت مشکل کام ہے کہ وہ ان حروف کی اصل آواز کی شناخت کرکے ذہن میں رکھ سکے اور باقی آوازوں کو نظر انداز کرجائے۔ ایک ہی وقت میں وہ کئی کئی آوازیں سننے سے گھبرا جاتے ہیں اور حرف کی اصل صورت یا آواز سے باخبر نہیں ہوپاتے۔ اسی لئے ماہرین تعلیم بچوں کو ایک وقت میں ایک بات سکھانے کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ تدریس میں یہ اصول باقی نہیں رہتا۔ بچوں کے کان میں کئی آوازیں ایک ساتھ پڑتی ہیں اور اس طرح گڈمڈ ہوجاتی ہیں کہ بعض بچے حروف کی اصل آواز نکالنے سے بہت دنوں تک قاصر رہتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس طریقہ تدریس میں جدت و دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اکثر حروف تہجی تصویروں کی مدد سے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ مثلاً الف سے آم۔ ب سے بلّی۔ ک سے کوا وغیرہ پہلے ہم آواز اور ہم شکل حروف کی گروہ بندی کرلی جاتی ہے بعد ازاں ہر گروہ کے حروف الگ الگ یاد کرائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود الف بائی طریقے کی جن کمزوریوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ دور نہیں ہوتیں ہاں اس کی مشکلات قدرے کم ہوجاتی ہیں لیکن کوئی تعلیمی اصول برقرار نہیں رہتا۔ بچوں میں شوق اور دلچسپی پیدا کرنے کا کوئی سامان اس طرز تدریس میں پیدا نہیں ہوتا۔ حروف تہجی سکھانے میں اتنا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے کہ بعض بچے گھبرا جاتے ہیں اور پڑھنے کو انتہائی دشوار سمجھ کر اردو سے بددل ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکیوں اور جن بچوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے انہیں اس طریقہ تدریس سے کچھ اور الجھن ہوتی ہے وہ اردو کو پیچیدہ اور مشکل زبان خیال کرکے اسے اپنانے کی ہمت نہیں کرتے۔

(۲) تحلیلی طریقہ تدریس میں بچوں کی دلچسپی کا لحاظ رکھ کر سب سے پہلے کوئی مختصر کہانی یا عبارت پڑھوائی جاتی ہے۔ کہانی ذہن نشین کرانے کے بعد ان کی توجہ کہانی کے اجزا یعنی جملوں اور فقروں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ پھر جملے کے اجزاء کئے جاتے ہیں اور ہر لفظ سے الگ الگ روشناس کرایا جاتا ہے۔ بعد ازاں ہر لفظ کو حرف میں تقسیم کرکے ہر حرف کو انفرادی صورت و آواز کا تصور دلایا جاتا ہے۔ گویا اس طریقہ تدریس میں ایک مرکب یا مکمل چیز کو بتدریج ٹکڑوں یا اجزاء میں حل کرتے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس کو ترکیبی طریقہ کے برعکس تحلیلی طریقہ کہتے ہیں۔ کہانی کے بجائے صرف جملوں یا لفظوں کی مدد سے بھی تعلیمی طریقہ تدریس کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے جملہ واری یا لفظ واری طریقے کا نام بھی دے سکتے ہیں مثلاً " دارا دوات لایا" یہ ایک جملہ ہے۔ پہلے اس جملے کو کسی چارٹ یا تختہ سیاہ یا مختلف قسم کی تختیوں اور تصویروں کی مدد سے بچوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔ پھر اس جملے کو " دارا" " دوات " اور " لایا " تین ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ پڑھوایا جائے۔ پھر ہر لفظ کے اجزاء کئے جائیں اور انفرادی حروف د۔ ا۔ ر۔ و۔ ت۔ ل۔ ی۔ وغیرہ کا تصور دلایا جائے اور ان کی انفرادی آوازوں کی الگ الگ مشق کرائی جائے۔ چونکہ اس طریقہ تدریس میں فقرے یا الفاظ دکھا کر بچوں سے براہ راست پڑھوا لئے جاتے ہیں اس لئے تدریس کی کتابوں میں اس طریقے کو " ین وگو" یا دیکھو اور بولو کا طریقہ بھی کہا گیا ہے۔

یہ طریقہ تدریس مغرب کے زیر اثر ہمارے یہاں رائج ہوا ہے اور یہ بھی ترکیبی طریقے کی طرح نقائص سے پاک نہیں ہے۔ اردو کا رسم الخط کچھ ایسا ہے کہ تحریر میں اکثر حروف کی شکلیں بدل جاتی " بات" " بس" اور " بچ " میں حرف " ب " نے تین جداگانہ صورتیں اختیار کرلی ہیں۔ یہی حال دوسرے حروف کا ہے۔ اس لئے اگر غیر معمولی توجہ اور محنت سے کام نہ لیا جائے تو تحلیلی طریقے سے حروف کی مختلف شکلوں کو ذہن نشین کرانے میں بڑی دشواری پیش آ سکتی ہے۔ جن زبانوں میں حروف اپنی شکل و صورت نہیں بدلتے یا کم بدلتے ہیں ان کے لئے یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ تحلیلی طریقے میں چونکہ کئی کئی حروف اک ساتھ بچوں کے سامنے آتے ہیں اور مختلف صورتوں میں آتے ہیں اس لئے بچوں کا ذہن الجھن میں پڑ جاتا ہے اور وہ انہیں ذہن میں محفوظ رکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ نئے الفاظ

کو ہجے کی مدد سے پڑھنے میں بھی بہت زیادہ مدد نہیں کرتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے اور درست ہجے لکھنے میں یہ طریقہ تدریس رکاوٹ ڈالتا ہے۔

لیکن ان خامیوں کے باوجود تحلیلی طریقے میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ طریقہ بچوں کی نفسیات ان کے رجحانات اور دلچسپیوں کے عین مطابق ہے اگر اس طریقہ تدریس میں خاطر خواہ محنت سے کام لیا جائے تو شروع ہی سے بچوں کے سامنے ایسا مواد لایا جا سکتا ہے جو ان کی عمر ماحول اور فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ جس سے وہ پوری دلچسپی کا اظہار کر سکتے ہوں۔ اور جن میں حصہ لے کر وہ الجھن میں پڑنے کے بجائے خوشی محسوس کر سکتے ہوں۔ بچے کہانیوں۔ جملوں اور بامعنی فقروں یا الفاظ سے پوری طرح مانوس ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ انہیں رات دن بولتے اور سنتے ہیں اس لئے اگر درس کا آغاز جملوں کہانیوں یا لفظوں کی مدد سے کیا جائے تو وہ اپنی عملی زندگی کا اہم جزو خیال کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ الفاظ چونکہ ان کے استعمال میں آتے رہتے ہیں اس لئے انہیں بامعنی آسان اور ایک مکمل چیز کے طور پر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں آسانی سے ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ معلوم سے نامعلوم۔ مشکل سے آسان اور کل سے جزو کی طرف بڑھنے کے اہم تعلیمی اصول اس طریقے میں برقرار رہتے ہیں اور درس کو دلچسپ آسان اور مفید بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ کھیل کھیل میں تعلیم کا عمل بھی جس آسانی سے اس طریقہ تدریس میں برتا جا سکتا ہے وہ کسی اور طریقے میں ممکن نہیں ہے۔ تحلیلی طریقہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچے تھوڑے وقت میں بہت سی چیزیں سیکھ لیتے ہیں۔ چند دن میں وہ اُردو روانی سے پڑھنے لگتے ہیں۔ بچّوں کو پہلے ہی سبق سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ انہوں نے پڑھنا سیکھ لیا ہے اس احساس سے ان میں خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے کو کامیاب دیکھ کر ایک طرح کی مسرت محسوس کرتے ہیں یہ چیز ان میں اُردو کے مطالعے کا شوق پیدا کرتی ہے اور وہ بڑی تیزی سے پڑھنے میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے ان میں پڑھنے کے ساتھ غور و فکر سے کام لینے اور مفہوم کو سمجھنے کی عادت بھی پیدا ہوتی ہے اور ذہنی نشو و نما تیزی سے ہوتی ہے۔ انہیں زبان کے کسی جزو کو مہمل و بے معنی خیال کرنے کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہ زبان کی معنویت و افادیت کے روز بروز قائل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے اور وہ بہت جلد رواں اُردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔

ترکیبی و تحلیلی طریقوں کے علاوہ بعض کتابوں میں صوتی اور مخلوط طریقے کا نام بھی ملے گا۔ صوتی

طریقے میں حروف کی اصلی آوازیں سکھانے پر زور دیا جاتا ہے ۔ یہ طریقہ زبان کی تدریس کے لئے سب سے زیادہ موزوں و مفید ہے اس لئے کہ حروف دراصل مختلف آوازوں کے نام ہیں اور ان حروف کا سکھانا گویا ان حروف کی آوازوں سے روشناس کرانا ہے ۔ لیکن یہ طریقہ تدریس صرف صوتی زبانوں یعنی ہندی اور گجراتی زبانوں کے لئے مناسب ہے ۔ ان زبانوں میں چونکہ حروف تہجی الگ الگ اپنی واضح آوازیں رکھتے ہیں اور یہ آوازیں ایک دوسرے سے بہت کم خلط ملط ہوتی ہیں اس لئے آواز یا صوت کی مدد سے بچوں کو حروف کا تصور دلانا بہت آسان ہو جاتا ہے ۔ اُردو چونکہ صوتی زبان نہیں ہے اور اس کے اکثر حروف اپنے اندر کئی کئی آوازیں رکھتے ہیں اس لئے صوتی طریقے سے حروف سے روشناس کرانا بہت مشکل ہے اور اسی لئے اُردو تدریس کے سلسلہ میں اس طریقے کی تفصیل میں جانا بے سود ہے ۔

بعض لوگ ترکیبی و تحلیلی دونوں طریقوں سے ایک ساتھ مدد لینے کی سفارش کرتے ہیں اور اس کا نام مخلوط طریقہ رکھتے ہیں ۔ یہ طریقہ ترکیبی طریقے کو تحلیلی طریقے کے قریب لے آتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ درس کو دلچسپ و مفید بنانے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے ۔ لیکن اگر ہمارے معلمین اُردو پڑھانے میں محنت و توجہ سے کام لیں تو پڑھنا سکھانے کے لئے تحلیلی طریقہ سب سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے کہانی یا پوری عبارت کے ذریعہ نہ سہی لفظ و جملہ سے اک ساتھ مدد لے کر پڑھنا سکھانے کے عمل کو آسان اور تیز تر بنایا جا سکتا ہے اور بچے روز اول ہی سے اُردو سے دلچسپی کا اظہار کر سکتے ہیں ۔ تعلیمی کمیشن نے ابتدائی مدرسوں کے لئے جو نصابی کمیٹی بنائی تھی اس نے بھی اپنی سفارشات میں اسی طریقہ تدریس کی حمایت کی ہے ۔

اس طریقے کی عملی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے بچوں کو حروف علت (VOWELS) یعنی (A) ای (E) او (O) یو (U) وغیرہ کی مختلف آوازوں اور حرکتوں کا احساس دلایا جائے ۔ مثلاً پہلے تصویروں کی مدد سے تالا ۔ مالا ۔ باجا ۔ کے قسم کے دو تین الفاظ ان کے سامنے لائے جائیں چونکہ بچے ان الفاظ سے مانوس ہونگے اس لئے تصویروں کی مدد سے ان الفاظ کو پڑھ لینے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوگی ۔ ان الفاظ کو بار بار پڑھوانے کے بعد لفظ کو آواز کی حرکتوں (SYLL) کے لحاظ سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا جائے اور تا ۔ لا ۔ ما ۔ جا ۔ کو الگ الگ پڑھوا کر حرف الف کی ایک حرکت آ ۔ کا احساس دلایا جائے ۔ گتّے کے ٹکڑوں پر لکھ کر یا تعلیمی کھیلوں کے ذریعے اس عمل

کو مزید دلچسپ و مفید بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد انہیں اجزاء کو ملا کر۔ بابا جا۔ مالالا۔
لالاجا۔ تالالا۔ ماماجا۔ جا ماماجا۔ جابابا جا۔ جالالاجا۔ کے قسم کے چھوٹے چھوٹے
بامعنی فقرے لکھ کر اُن سے پڑھوائے جائیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچے نئے الفاظ اور فقرات
بنانے کے عمل کو بھی سمجھ جائیں گے اور حرف الف کی ایک حرکت "آ" بھی انہیں اچھی طرح ذہن
نشین ہوجائے گی۔ اسی طرح الفاظ کا دوسرا گروہ مثلاً آلو۔ چاقو۔ لالو۔ وغیرہ کو تصویروں کی مدد
سے پڑھوایا جائے۔ پہلے کی طرح انہیں بھی آواز کی حرکتوں کے لحاظ سے اجزاء میں تقسیم کیا جائے۔
جیسے آ۔ لو۔ چا۔ قو۔ لا۔ لو وغیرہ۔ اور انہیں الگ الگ پڑھوانے کے بعد پڑھے ہوئے الفاظ
کے سہارے بامعنی جملے اس طور پر پیش کئے جائیں۔ مثلاً۔ آلو لا۔ باجالا۔ لاچاقو لا۔ لاآلو لا۔
لالو آلو لا۔ لالو باجالا۔ وغیرہ اس طرح وہ حرف علت کی دوسری حرکت یعنی۔ او (ٗ) سے واقف
ہوجائیں گے۔ پھر الفاظ کا ایک نیا گروہ لیا جائے۔ جیسے روٹی۔ موٹی۔ پانی۔ وغیرہ اصل چیزوں
یا تصویروں کی مدد سے ان الفاظ کا پڑھانا بہت آسان ہے۔ انہیں بھی آواز کے اعتبار سے دو دو
ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے جیسے "رو" "ٹی"۔ مو۔ ٹی۔ پا۔ نی وغیرہ اس کے بعد پڑھے ہوئے
الفاظ اور زیر تدریس الفاظ کی مدد سے بامعنی فقرے بنا کر پڑھوائے جائیں۔ جیسے روٹی لا۔
لالا روٹی لا۔ پانی لا۔ دیا نی لا۔ وغیرہ اس طور پر بچوں کو حرف علت کی دو حرکتیں یعنی او اور
ای آسانی سے ذہن نشین ہوجائیں گی۔ غرض اس طرح حروف علت کی ساری حرکتیں انہیں سکھائی
جائیں۔ بعد ازاں ہر حرف کی مختلف صورتوں کی طرف انہیں متوجہ کیا جائے۔ مثلاً ک کا تصور
دلانے کے لئے چاک۔ کالو۔ خاکی۔ وغیرہ کے الفاظ سامنے لائے جائیں ان میں حرف علت کی جو آوازیں اور
حرکتیں آتی ہیں بچے ان سے واقف ہوچکے ہیں اب انہیں حرف "ک" صورتوں کو ذہن نشین کرانا ہوگا۔
جنہیں وہ آسانی سے سیکھ لیں گے "ج" کی مختلف صورتوں کو سمجھانے کے لئے تاج۔ بابا۔ جاگ وغیرہ کے
الفاظ لئے جائیں اور مختلف قسم کے جملے بنا کر ج کی شکلوں کو ذہن نشین کرایا جائے مختصر یہ کہ ہر حرف کے لئے
یہی طریقہ اختیار کیا جائے اور بچوں کو فقروں کی مدد سے ان کی مختلف صورتوں کا تصور دلایا جائے اس
اس سے میں چند ایسے الفاظ جن سے انہیں رات دن واسطہ پڑتا ہے اور جنہیں وہ سنتے بولتے رہتے ہیں
براہِ راست پڑھائے جاسکتے ہیں جیسے یہ۔ ہے۔ وہ۔ وغیرہ ان الفاظ کی مدد سے پڑھے ہوئے

الفاظ سے فقرے بنانے میں سہولت پیدا ہو گی اور بچے بہت جلد پڑھنے میں روانی پیدا کر لیں گے۔ چونکہ اُردو کی ابتدائی کتابیں بھی اسی طریقہ تدریس کا لحاظ رکھ کر تیار کی گئی ہیں۔ اس لئے معلموں کی ذاتی توجہ اور محنت سے یہ طریقہ نہایت مفید ہو سکتا ہے۔

۳۔ **لکھنا** ذہن انسانی کے سارے علمی و ادبی کارنامے جو آج تک ہماری رہنمائی کر رہے ہیں تحریری صورت میں ہیں۔ اگر ہمارے اسلاف "لکھنے" کے فن سے واقف نہ ہوتے تو ہم ان کی ایجادات و تخلیقات اور خیالات و افکار سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے۔ یہ تحریر ہی کی برکت ہے کہ آج مختلف علوم و فنون کی بے شمار کتابیں کتب خانوں میں موجود ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہماری مدد کر رہی ہیں تعلیم کا اہم مقصد چونکہ بچوں کو اچھا شہری بنانا ہے اور اچھا شہری بنانے کا یہ مقصد ہے کہ آج کے پاکستانی بچے کل کے بلند پایہ مفکر۔ سیاست دان۔ شاعر۔ مصنف۔ مورخ۔ سائنس دان۔ ماہرِ تعلیم ڈاکٹر۔ قانون دان اور انجینئر بن سکیں اس لئے نہایت ضروری ہے کہ انہیں لکھنا سکھایا جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر اپنے اسلاف کی طرح اپنے علمی و ادبی کارناموں کو کتابی صورت میں محفوظ کر جائیں اور آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس اہم مقصد سے قطع نظر ہماری روزمرہ کی زندگی بھی تحریری کاموں سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ نجی معاملات۔ سیاسی امور۔ درس و تدریس۔ تجارت اور ملازمت ہر شعبے میں لکھنے سے واسطہ پڑتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جو شخص لکھنا نہیں جانتا وہ آج کی دنیا میں نہ خود کوئی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اپنی ذات سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ اسی لئے تو آج کل کے بعض ماہرین تعلیم پڑھنا اور لکھنا دونوں کو ایک ساتھ سکھانے کی سفارش کرتے ہیں پھر بھی اگر پڑھنا سکھانے کے چند دن بعد لکھنا سکھایا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ بلکہ اس سے لکھنا سکھانے میں قدرے آسانی ہو جاتی ہے۔ غرض " لکھنا " زبان کی تدریس کا نہایت اہم جزو ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ زبان کی تدریس کو عملی شکل دینے اور دلچسپ بنانے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس فن کی مدد سے سارے مضامین کا درس کھیل کھیل میں دیا جا سکتا ہے۔ لکھنے میں چونکہ خود اپنے ہاتھوں سے آزادانہ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے بچے اس سے دلچسپی بھی لیتے ہیں اور ایک خاص قسم کی خوشی بھی محسوس کرتے ہیں۔ تحریری کام بچوں کی ذہنی و نشوونما میں بھی بہت مدد کرتا ہے

بات یہ ہے کہ لکھنے میں جس غور وفکر سے کام لینا پڑتا ہے بولنے یا پڑھنے میں اس کی ضرورت نہیں رہتی ۔ پھر لکھنے میں چونکہ صرف بچوں کے ہاتھ کام نہیں کرتے بلکہ ان کے لب ۔ زبان ۔ تالو ۔ نظر ۔ ذہن اور دوسرے حواس و اعضا سبھی کسی نہ کسی طور پر شریک رہتے ہیں ۔ اس لئے سبق کو آسانی سے ذہن نشین کرنے اور اپنی شخصیت کو بھرپور ابھارنے کا جو موقع تحریری کاموں میں ملتا ہے وہ کسی اور طرح ممکن نہیں ہے ۔

"پڑھنا" کی طرح لکھنا سکھانے کے بھی مختلف طریقے مروج ہیں ۔ ان میں مانٹسوری طریقہ پستالوزی کا طریقہ ۔ ترکیبی یا الف بائی طریقہ ۔ تحلیلی یا بین وگو کا طریقہ اور مخلوط طریقہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مانٹسوری طریقے میں لکڑی یا موٹے گتے کے حروف بنائے جاتے ہیں ۔ پہلے بچوں سے ان پر انگلیاں پھروائی جاتی ہیں اور حروف کی شناخت کے بعد الفاظ و فقرے لکھوائے جاتے ہیں ۔ یہ طریقہ دراصل صوتی زبانوں یا ایسی زبانوں کے لئے مفید ہے جن میں حروف اپنی شکلیں بہت کم بدلتے ہیں ۔ اردو کے حروف چونکہ تحریر میں کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں اس لئے یہ طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس طریقہ کار میں خرچ بہت آتا ہے اور ہمارا ملک اس بار کو سردست نہیں اٹھا سکتا ۔

پستالوزی نے ابجد نویسی سکھانے کے سلسلے میں سب سے پہلے مختلف قسم کے خطوط کھنچوانے کی سفارش کی ہے ۔ پستالوزی کے خیال میں اگر بچوں کو سیدھے ، ترچھے ۔ نصف دائرہ نما اور دائرہ نما خطوط کھچوانے کی مشق کرائی جائے اور پھر ان خطوط کو ملا کر حرف بنوائے جائیں تو بچے آسانی سے لکھنا سیکھ لیں گے یہ طریقہ ابتدائی منزلوں میں یقیناً مفید ہو سکتا ہے لیکن شوشوں اور جوڑوں کی کثرت کی بناء پر یہ طریقہ بھی اردو کا ساتھ پوری طرح نہیں دے سکتا ۔ بعض مغربی زبانوں کے لئے یہ البتہ مناسب ہے لیکن اسے اردو میں رواج دیا جائے تو بہت زیادہ وقت صرف کرنے کے بعد کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا ۔

الف بائی یا ترکیبی طریقہ وہی پرانا طریقہ ہے جو برسوں سے ہمارے یہاں مروج ہے ۔ اسے ترکیبی یا الف بائی طریقہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں الف سے لیکر یے تک سارے حروف الگ الگ لکھوائے جاتے ہیں پھر دو حرفی سہ حرفی اور چہار حرفی الفاظ بتدریج لکھائے جاتے ہیں آخر میں فقرے اور عبارتیں لکھوائی

جاتی ہیں۔ اس طریقے سے ہجے اور املا کی درستگی میں خاصی آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور بچوں کی بنیاد بڑی مضبوط ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ طریقہ اصولِ تعلیم کے منافی ہے اور اس میں بچوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا اس لئے بچے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرتے اور بہت زیادہ وقت صرف کرنے کے بعد بچوں میں لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بین وگو یا تحلیلی طریقے میں پہلے عبارتیں یا جملے لکھوائے جاتے ہیں پھر جملوں کو اجزا میں تقسیم کرکے الفاظ لکھوائے جاتے ہیں۔ الفاظ کے بعد بچوں کو انفرادی حروف کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کا آغاز عبارت کے بجائے جملہ اور اور جملہ کے بجائے لفظ سے بھی کیا جاسکتا ہے ایسی صورت میں اسے جملہ واری یا لفظ واری تحلیلی طریقے کا نام دے سکتے ہیں۔

مخلوط طریقے میں الف بائی اور بین وگو طریقوں سے ایک ساتھ مدد لی جاتی ہے۔ یعنی کبھی الگ الگ حروف سکھائے جاتے ہیں کبھی جملے یا فقرے لکھوائے جاتے ہیں۔ کبھی پوری عبادت لکھوائی جاتی ہے کبھی حروف کے اجزا اور شوشوں کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے غرض جہاں جیسی ضرورت محسوس ہوئی وہاں کسی خاص طریقے سے کام لے لیا گیا۔ یہ طریقہ الف بائی طریقے کی بعض دشواریوں کو دور کرتا ہے اور درس کو کم وبیش بچوں کے لئے دلچسپ ومفید بنا دیتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم ان تمام طریقوں کا تقابلی جائزہ لے کر ہر ایک کے فوائد ونقائص پر روشنی ڈال چکے ہیں اس لئے ان کا دہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ صرف اس قدر کہنا ہے کہ اگر ہمارے معلمین توجہ اور محنت سے کام لیں تو تحلیلی طریقہ نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے اور بچے بہت جلد لکھنا سیکھ سکتے ہیں لیکن اس طریقے کے آغاز سے پہلے مناسب یہ ہوگا کہ بعض دلچسپ مشغل کے ذریعہ یا کھیل میں بچوں کو لکھائی کے عمل کے لئے پوری طرح آمادہ کیا جائے جن اعضار کی مدد سے بچے لکھنے کا آغاز کرتے ہیں پہلے انہیں حرکت میں لانے کی ترغیب دی جائے اگر اس ترغیب کے بغیر ان کے ہاتھ میں قلم پکڑا دیا گیا تو بچے "لکھنا" سیکھنے میں بڑی دشواری محسوس کریں گے اور ایک مدت کے بعد بھی وہ اس کے اہل نہ ہونگے کہ صفائی اور روانی کے ساتھ لکھ سکیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ کسی خاص طریقہ کار کو عمل میں لانے سے پہلے بچوں کے ذہن وجسم کو لکھنے کے فن سے مانوس کیا جائے۔ اس سلسلے میں ذیل کے چند مشغل تجویز کئے جاتے ہیں ان میں اچھے

معلمین حسب ضرورت اپنے تجربے اور ذہانت سے اضافہ بھی کر سکتے ہیں:۔

(۱) چکنی مٹی سے حرف کے ماڈل بنا کر دفتی کے ٹکڑوں پر چپکا کر دیواروں پر آویزاں کئے جائیں

(۲) دفتی پر جلی قلم سے یا رنگین چاک سے موٹے موٹے حروف لکھے جائیں اور انہیں کاٹ لیا جائے۔ کاٹے ہوئے حروف دفتی پر چپکا دیئے جائیں۔ یہ ابھرے ہوئے حروف ہوں گے بچے ان پر انگلیاں پھیریں۔

(۳) زمین پر چونے سے کوئی حرف بنا دیا جائے اور بچے صفائی سے اس حرف کے نشان پر نالی کھودیں اور اس نالی میں پانی بھریں۔

(۴) بچوں کے سامنے نمونے دے کر گیلی مٹی سے حروف بنوائے جائیں۔ دفتی کے حروف کٹوائے جائیں اور ان سے تاش بنوائے جائیں۔

(۵) ایک نقطہ۔ دو نقطہ۔ الف۔ کاف۔ وغیرہ آسان حروف واجزا، کاغذ پر موٹے قلم سے لکھ کر بچوں کو تقسیم کئے جائیں اور کہا جائے کہ قلنچی سے ان کو تراش کر کے الگ کریں۔

(۶) زمین پر قمچی کے ٹکڑوں اور انگلیوں سے لکھایا جائے۔

(۷) تختہ سیاہ پر چاک سے مختلف قسم کے خطوط کھچوانے کی مشق کرائی جائے۔

بعض حروف کی شناخت، چھوٹے بچوں سے باتوں باتوں میں ایک اور طریقے سے کرا سکتے ہیں، مثال کے طور پر ان آٹھ حروف کو لے لیجئے۔

ب، ت، ٹ، پ، د، ڈ، ڑ، ط

اب مندرجہ ذیل طریقے پر، ان کے بامعنی جوڑے بنا ڈالئے۔

(۱) ب، ٹ (بیٹے)

(۲) ت، ر (تیرے)

(۳) پ، ڑ (پیڑے)

(۴) ط، ت (طوطے)

(۵) ب، چ (بیچے)

(۶) د ، ڈ (دال ڈال)

(۷) ت ، ر ، ب ، ٹ (تیرے بیٹے)

(۸) ت ، ر ، پ ، ڑ (تیرے پیڑے)

(۹) ت ، ر ، ط ، ت (تیرے طوطے)

(۱۰) پ ، ڑ ، ب ، چ (پیڑے بیچے)

(۱۱) ط ، ت ، ب ، چ (طوطے بیچے)

(۱۲) ب ، ٹ ، د ، ڈ (بیٹے دال ڈال)

(۱۳) ب ، ٹ ، پ ، ڑ ، ڈ (بیٹے پیڑے ڈال)

چونکہ حروف کے ان جوڑوں کی آوازیں بامعنی الفاظ کا پہلو پیدا کرتی ہیں اور یہ الفاظ ایسی چیزوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں جو بچوں کے مشاہدے اور تجربے میں آتی رہتی ہیں، اس لئے بچے اُن سے حددرجہ دلچسپی کا اظہار کریں گے اور ان حروف کو بہت جلد ذہن نشین کر لیں گے۔

اس کے بعد ان کے ہاتھ میں قلم دیا جائے پہلے چاک سے تختہ سیاہ پر یا پنسل سے موٹے گتہ پر لکھوایا جائے پھر قلم سے تختی پر اور بعد ازاں جلی حروف میں کاغذ پر لکھنے کی ترغیب دی جائے اور لفظ و جملہ سے ایک ساتھ مدد رکے تحلیلی طریقے کو عمل میں لایا جائے۔ پڑھنا سکھانے کی طرح اس میں بھی ابتدائی دو تین الفاظ لئے جائیں اور ان سے آسان جملے ترتیب دیکر تختہ سیاہ پر لکھ دیئے جائیں۔ اب بچوں سے ان جملوں یا فقروں کو نقل کرنے کو کہا جائے۔ شروع میں بچوں کی دلچسپی کا لحاظ رکھ کر ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جائے جن میں حروف اپنی اصل صورت میں آتے ہوں یہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔ مثلاً پہلے دارا۔ دوات۔ دال۔ دوا۔ دوڑ۔ دوڑو۔ دوڑا۔ آ۔ اے۔ وہ۔ دے۔ دادا۔ دادی۔ روز۔ دن رات، دوڑی۔ آم۔ دس۔ دم۔ دو۔ رہ۔ اور۔ ڈال۔ رس دار۔ کے قسم کے الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ان سے بامعنی فقرے بنائے جائیں یہ الفاظ بلا کسی خاص توجہ یا غور و فکر کے لکھ دیئے گئے ہیں۔ پھر بھی ان میں بہت سے حروف تہجی اپنی اصلی صورت میں آگئے ہیں۔ اگر کوشش و تجسس سے کام لیا

جائے تو اس قسم کے دوسرے الفاظ کی مدد سے بقیہ حروف بھی استعمال میں آسکتے ہیں - ان الفاظ سے فقرے بنائے جائیں اور فقرے حروف علت یعنی (VOWELS) کی بعض آوازوں مثلاً" - آ - اے - او - ای - آ وغیرہ کا خاص لحاظ رکھ کر مختلف گروہوں میں تقسیم کر لئے جائیں - اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں کو ہجے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو جائے گی - فقروں کی گروہ بندی کچھ اس قسم کی ہونی چاہئے -

الف ۱ - دارا آ

۲ - آ دارا آ

۳ - دادا آ

۴ - آ دادا آ

ب ۱ - آم لا

۲ - دادا آم لا

۳ - دارا آم لا

۴ - لا آم لا

س ۱ - وہ دوڑا

۲ - دارا دوڑا

۳ - رام دوڑا

۴ - دادا دوڑا

ان فقروں کو معلم واضح طور پر تختہ سیاہ پر لکھے اور بچوں سے نقل کرائے ان کی مدد سے بچے بعض حروف کی اصل صورتوں کے ساتھ آ کی آواز سے بھی مانوس ہو جائیں گے - اب انہیں الفاظ کی مدد سے فقروں کا دوسرا گروہ تیار کیا جائے اور "اے" کی آواز سے مانوس کرایا جائے مثلاً

الف ۱ - آم دے

۲ - دادا آم دے

۴ - دارا دس آم دے

۵ - دو آم اور دس آم دے

۶ - رس دار آم دے

۷ - دادا وہ آم دے

ب ۱ - دادا آم لائے

۲ - لائے دادا آم لائے

۳ - دادا دس آم لائے

۴ - دادا رس دار آم لائے

دادا اور دارا رس دار آم لائے

س ۱ - وہ دوڑے

۲ - دادا دوڑے

۳ - دادا اور دارا دوڑے

۴ - دوڑے دارا دوڑے

۵ - رام اور دارا دوڑے

اس کے بعد ایسے فقرے بنا کر نقل کرائے جائیں جن کی مدد سے بچے اُو یا وُو (ہ) کی آواز سے روشناس ہو سکیں جیسے :-

الف ۱ - اب دوڑو

۲ - دوڑو رام دوڑو

۳ - رات دن دوڑو

۴ - دوڑو دارا دوڑو

۵ - دوڑو دادا دوڑو

۶ - دوڑو دادی دوڑو

ب ۱ - دادی دال دو

۲ ۔ دادی دال ڈال دو

۳ ۔ دادی رس دو

۴ ۔ دادی آم اور رس دو

۵ ۔ ڈال دو رس ڈال دو

۶ ۔ دادی رس ڈال دو

س ۱ ۔ آؤ دارا آؤ

۲ ۔ آؤ دادا آؤ

۳ ۔ آؤ دادی آؤ

۴ ۔ دارا اور دادا آؤ

۵ ۔ دادی دادا آؤ

۶ ۔ روز دادا آؤ

۷ ۔ دادا روز روز آؤ

د ۱ ۔ دارا دوات لاؤ

۲ ۔ لاؤ دوات لاؤ

۳ ۔ دس آم لاؤ

۴ ۔ رس دار آم لاؤ

۵ ۔ روز دس آم لاؤ

۶ ۔ دادا روز رس دار آم لاؤ

۷ ۔ لاؤ دادا رس دار آم لاؤ

مذکورہ بالا الفاظ کے الٹ پھیر سے اور بھی فقرے بنائے جا سکتے ہیں ۔ اور بچوں کو حروف سالم کا تصور دلانے کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں ۔ دو چار سبق کے بعد ان الفاظ میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ مثلاً "یہ" ۔ "ہے" ۔ اور "ہیں" وغیرہ کا اضافہ کر دیا جائے اور اس قسم کے جملے بنا کر لکھوائے جائیں ۔

۱ ۔ یہ دادا ہیں ۔

۲ ۔ یہ دادا اور دادی ہیں ۔

الف ۳ ۔ یہ رس دار آم ہیں ۔

۴ ۔ یہ رام اور دارا ہیں ۔

۵ ۔ یہ آم، رام اور دارا لائے ہیں

۶ ۔ یہ آم دادا اور دادی لائے ہیں

ب ۱ ۔ یہ آم ہے

۲ ۔ یہ رس دار آم ہے

۳ ۔ یہ دال ہے

۴ ۔ یہ آم لال ہے

۵ ۔ یہ دوات ہے

۶ ۔ دوات لال ہے

"ہے" اور "ہیں" کی مشق کے بعد "ہو" "ہوں" کی مشق بھی اس جگہ پر کرا دی جائے ۔ پھر ان الفاظ میں کثرت سے استعمال ہونے والے حروف جار مثلاً کو ۔ سے ۔ میں ۔ وغیرہ شامل کر دیئے جائیں ۔ اور فقروں کے ساتھ لکھوائے جائیں جیسے :۔

۱ ۔ بازار سے آم لاؤ

۲ ۔ آم میں رس ہے

۳ ۔ لاؤ بازار سے دوات لاؤ

۴ ۔ رام اور دارا بازار سے آم لائے ہیں

۵ ۔ دس آم دارا کو دو

۶ ۔ بازار سے رس لاؤ اور دادی کو دو

۷ ۔ دادا اور دادی رس دار آم لائے ہیں ۔

۸ - یہ آم ہیں اور وہ ڈوری ہے

۹ - ڈوری لال ہے آم زرد ہے

۱۰ - یہ آم بازار سے آئے ہیں -

۱۱ - دارا اور رام بازار سے رس دار آم لائے ہیں

بعدازاں ان الفاظ میں ایسے دو حرفی - سہ حرفی اور چہار حرفی الفاظ بھی بتدریج شامل کرتے جائیں جن میں دو یا تین حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں نئے اور پرانے الفاظ کی مدد سے پھر بامعنی فقرے اور عبارتیں مرتب کی جائیں اور بچوں سے لکھوائی جائیں۔ کچھ دنوں میں بچے حروف کی سالم صورتوں اور ان کے بعض شوشوں اور جوڑوں سے واقف ہو جائیں گے۔ ہر حرف کی ابتدائی وسطی اور اختتامی صورت کا تصور دلانے کے لیئے الفاظ کی گروہ بندی اس طرح کرنی چاہیئے کہ حرف کی تینوں صورتیں اکٹھے بچوں کے ذہن نشین ہو جائیں مثلاً گ کی مختلف صورتوں کے لیئے گاجر - آگ - گز - جگ وغیرہ کے الفاظ سے اس قسم کے جملے بنا کر لکھوائے جائیں ۔

۱ - گاجر لال ہے

۲ - گاجر بازار سے لاؤ

۳ - یہ آگ ہے

۴ - آگ سے ڈرو

۵ - گز سے ڈوری ناپو

۶ - جگ میں پانی ڈالو

۷ - گاجر چاقو سے کاٹو

۸ - جگ سے پانی لاؤ

۹ - آگ میں روٹی ہے

اگر اس طرح ہر حرف کے لیئے الفاظ اور فقرات کا گروہ تیار کر لیا جائے اور انہیں بتدریج بچوں سے لکھوایا جائے تو بچوں کا زیادہ وقت لکھنا سکھانے میں صرف نہ ہوگا - پہلے ہی دن سے بچے تحریری کام کو اپنی زندگی کا جزو خیال کریں گے اور بہت جلد صحت و روانی کے ساتھ اردو

لکھنے لگیں گے۔

املا سکھانے کے لئے خصوصاً حروف کو ایک دوسرے سے ملا کر لکھنے اور نہ لکھنے کے مسئلے کو دلچسپ طریقے سے سمجھانے کے لئے ابتداءً یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے سارے حروف تہجی کو دو خاندانوں میں اس طور پر تقسیم کر لیا جائے

ا بڑے خاندان کے حروف

ا

د ڈ ذ

ر ڑ ز

و

ب چھوٹے خاندان کے حروف

ب، پ، ت، ٹ، ث

ج چ ح خ

س ش

ص ض

ع غ

ف، ق، ک، گ

ل، م، ن، ہ، ی، ے

ا ۔ اس تقسیم کے بعد، طلبہ کو ہر خاندان کی خصوصیات بتائی جائیں، پہلا خاندان چونکہ اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اس لئے اس خاندان کے حروف کی دو خاص عادتیں ہیں۔

(۱) ایک تو وہ کسی طرح سمٹنے کو تیار نہیں ہوتے، وہ چاہتے ہیں کہ انہیں ہر جگہ ہاتھ پیر پھیلا کر بیٹھنے کا موقع دیا جائے یعنی پورے کا پورا لکھا جائے۔

(۲) دوسرے یہ ان کے آگے یا سامنے کوئی دوسرا حرف نہ آئے، ہاں انکے پیچھے آنا چاہے تو وہ اُن کا دامن پکڑ سکتا ہے یعنی مل کر بیٹھ سکتا ہے، اس خاندان کی پہلی عادت کو

سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل الفاظ کو لے لیجئے ۔

(۱) آم	(۲) کام
دوا	بدبو
ڈور	لڈو
ذریعہ	تذکرہ
رس	برسی
زمین	گز
ژالہ	مژدہ

پہلے گروہ کے الفاظ کے شروع میں چونکہ بڑے خاندان حروف آئے ہیں اس لئے اُن کے آگے یا سامنے جو بھی حرف آیا ہے اُن سے مل کر نہیں ذرا دُور بیٹھا ہے ، دوسرے گروہ کے الفاظ کی نوعیت ذرا مختلف ہے ، ان میں بھی بڑے خاندان کے حروف کے سامنے جو حروف آئے ہیں وہ الگ ہی بیٹھے ہیں ۔ لیکن جو حروف ، ان کے پیچھے ہیں وہ بڑے خاندان والوں کا دامن پکڑے ہوئے ہیں ۔

(ب) اب چھوٹے خاندان کو لے لیجئے اس خاندان کے حروف کی بھی دو خصوصیتیں ہیں ۔

(۱) پہلی یہ کہ وہ چھوٹے خاندان سے تعلق رکھنے کے سبب محدود اور چھوٹی جگہوں میں اپنا گذارا کر لیتے ہیں ۔ چنانچہ وہ اپنا پورا وجود ہر جگہ ظاہر نہیں کرتے ہاں اپنا چہرہ ضرور دکھاتے رہتے ہیں ۔ یعنی ان کا صرف ابتدائی حصّہ لکھا جاتا ہے ۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں اور وہ دوسرے حروف کو عام اجازت دیتے ہیں کہ وہ جہاں چاہیں آگے یا پیچھے ، اُن کا دامن پکڑ کر بیٹھ جائیں یہ ضرور چاہتے ہیں کہ جب وہ لفظ کے آخر میں آئیں تو اُنہیں پھیل کر پورے وجود کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی جائے ، مطلب یہ ہے کہ اُنہیں عام طور پر ملا کر لکھا جائے لیکن لفظ کے آخر میں پورا حرف ظاہر کیا جائے ۔

اس خاندان کی ان عادتوں کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے ۔

۱۔ عبیر ، چیل ، کتنی ، لٹیا ، مثمن ، نجمہ ، ججی ، محمد ، مخزن ، رسول ، نشہ ، تصویر ، مضبوط ، معبود ، مغرور ، تفصیل ، عقیل ، بکری ،

بگُل، علاج، جنوری، کہُر، نیلی۔

(۲) غضب، تپ، محبت، نٹ، تثلیث، بیج، پیچ، صُلح، بلغم

بیکس، تشویش، قمیص، غیض، شمع، تبلیغ، حلف، قلق،

بیٹھک، بیگ، ململ، شمیم، مشین، نگہ، تختی، بستے۔

پہلے گروہ کے الفاظ میں چھوٹے خاندان کے حروف لفظ کے درمیان میں آئے ہیں اس لئے سمٹ کر بیٹھے ہوئے ہیں یعنی صرف چہرے کو ظاہر کرتے ہیں لیکن دوسرے گروہ کے الفاظ میں چونکہ لفظ کے آخر میں آئے ہیں اس لئے اپنی خصوصیت کے مطابق پورے وجود کے ساتھ دوسروں سے ملے ہوئے بیٹھے ہیں۔

دو خاندانوں کے حروف کے ساتھ اگر دو چشمی "ھ" بھی داخل ہو جائے تو اوپر بتائی ہوئی خصوصیات جوں کی توں برقرار رہیں گی۔ اب رہ گئے دو حرف یعنی

ط، ظ

ان کے متعلق یہ بتا دیا جائے کہ یہ دونوں خاندانوں میں مشترک ہیں یعنی ان میں ایک خصوصیت تو بڑے خاندان کے حروف کی پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُنہیں کہیں بھی بٹھایا جائے پورے وجود کے ساتھ بٹھایا جائے دوسری خصوصیت، چھوٹے خاندان کے حروف سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ وہ مل جل کر بیٹھنا پسند کرتے ہیں یعنی اُنہیں دوسرے حروف سے ملا کر لکھا جا سکتا ہے، بطور مثال مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے۔

(۱) مطلوب ، مظہر

مطلق ، نظیر

(۲) بربط ، تلفظ

مضبوط ، غلیظ

پہلے گروہ میں یہ حروف، لفظ کے درمیان میں آئے ہیں دوسرے میں لفظ کے آخر میں دوسرے حروف سے ملا کر لکھے گئے ہیں لیکن دونوں جگہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں اب اگر اُس مختصر بحث سے گُر کے طور پر کوئی بات طلبہ کو بتانا چاہیں تو آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ

(۱) بڑے خاندان کے حروف ہمیشہ پورے کے پورے لکھے جاتے ہیں اور اپنے آگے کسی دوسرے حرف کو ملنے نہیں دیتے۔

(۲) چھوٹے خاندان کے حرفوں کے صرف چہرے یعنی سرے لکھے جاتے ہیں اور وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں لیکن لفظ کے آخر میں پورے کے پورے آتے ہیں۔

املا کے یہ اصول مولوی احمد علی مدھولی اور عبدالغفار خاں مدھولی کے بیان کردہ ہیں۔ اور تجربات نے بتایا ہے کہ بچوں کو لکھنا سکھانے کے سلسلے میں یہ بہت کارآمد ہیں۔

ابتدائی مدرسوں میں صحیح، رواں اور خوشخط لکھنے کی مشق کرانے کا سب سے بہتر ذریعہ نقل نویسی ہے۔ نقل نویسی میں چونکہ تحریر کا نمونہ سامنے رہتا ہے اس لئے اصل حروف۔ ان کی مختلف صورتوں جوڑوں۔ شوشوں۔ کششوں اور دائروں کے بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ نقل نویسی کی مشق سے بچے بہت جلد درست ہجے کے ساتھ لکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ نقل نویسی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچوں کو سبق آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کو بچوں کے ذہن نشین کرانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ اسے بچوں سے بار بار لکھوایا جائے۔ نقل نویسی کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں معلم تختہ سیاہ پر جلی حروف میں کوئی عبارت یا فقرے لکھ دے اور بچے ان کو نقل کریں، درسی کتاب سے کوئی عبارت منتخب کی جائے اور بچوں سے نقل کرائی جائے۔ خوشخطی کی کاپیاں استعمال کرائی جائیں۔ اور ان میں لکھی ہوئی عبارتوں کو نقل کرایا جائے۔ لیکن ایسی کاپیاں کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتیں جن میں اوپر دی ہوئی عبارت کو اسی کے نیچے نقل کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ بچے پہلی سطر لکھنے کے بعد نمونے کی عبارت کو نظر انداز کر کے اپنی عبارت کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلی سطر کو چھوڑ کر باقی سطروں میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور بچوں کو غلط لکھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ نمونے کی عبارت کو کسی دوسری کاپی پر الگ نقل کر دیا جائے، تاکہ بچوں کی محنت ضائع نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کاپی سلپ دیدہ زیب اور دلچسپ ہو۔ اس میں جو عبارتیں درج ہوں وہ بچوں کی فطرت اور بچوں کے ذوق وشوق کے مطابق ہوں۔ خشک مضامین یا وعظ وپند کے بجائے دلچسپ کہانیاں۔ لطیفے اور ہنسنے ہنسانے والے فقرے درج کئے جائیں تاکہ بچے لکھنے کا کام جی لگا کر کر سکیں۔ پہلی اور دوسری

جماعت کی کاپیوں میں حرف کے سوا اگر کچھ خطوط اور بیل بوٹے بھی لکھوائے جائیں تو نہایت مفید ثابت ہوں گے ۔

نقل نویسی کے کام کی جانچ بھی بہت ضروری ہے ۔ اگر تحریری کام کو بروقت نہ دیکھا گیا اور غلطیوں کی درستگی نہ کی گئی تو اس سے فائدہ کے بجائے بچوں کو نقصان پہونچے گا ۔ غلطیاں بچوں کے ذہن میں اس طرح جم جائیں گی کہ پھر مشکل سے نکل سکیں گی اس لئے چھوٹے بچوں کے ہر تحریری کام کو دیکھنا بہت ضروری ہے ۔ ہمارے مدرسوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ ابتدائی جماعت کا معلم پوری جماعت کا تحریری کام نہیں دیکھ سکتا ۔ اس لئے اسے بچوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر لینا چاہئے اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہر گروہ کی کاپیاں دیکھ کر بچوں کے سامنے غلطیاں درست کرنا چاہئے ۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کسی خوشخط اور صاف لکھنے والے بچے کو ہر گروہ کا مانیٹر مقرر کیا جائے اور معلم مانیٹر کی مدد سے ہر گروہ کے کام کی اصلاح کرے ۔ خوش نویسی کے مقابلے بھی بچوں میں صحیح ، رواں اور صاف لکھنے کا شوق پیدا کر سکتے ہیں ۔ یہ بھی مفید ہوگا کہ بچوں کو ان کی تحریر کی مطابقت سے کئی گروپ میں بانٹ لیا جائے اور کچھ دنوں کی مشق کے بعد ان کے امتحانات لئے جائیں جن بچوں نے لکھنے میں ترقی کی ہے انہیں اس سے بہتر گروپ میں بھیج دیا جائے ۔ جو بچے لکھنے کا خاص معیار حاصل کر لیں انہیں خوشخطی یا نقل نویسی سے مستثنیٰ کر کے چھوٹے موٹے انعامات دیئے جائیں ۔ اس طریقے سے بچوں میں مقابلے کا ایک خاص جذبہ رونما ہوگا اور کمزور بچے تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے ۔ کاپیوں کی اصلاح کے بعد معلم کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ بچے ہدایات پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں ۔ بعض بچے ہدایات کو نظر انداز کر کے ایک ہی قسم کی غلطیاں کرتے رہتے ہیں ۔ یہ چیز اکثر معلم کی لاپروائی کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ ہونا یہ چاہئے کہ بچوں کی جو غلطیاں ان کی کاپیوں پر درست کر کے لکھی جائیں اور جنہیں بچوں سے دوبارہ لکھنے کو کہا جائے انہیں ایک بار پھر دیکھا جائے اور اگر ضرورت ہو تو مزید ہدایت کی جائے ۔ غلطیوں کی تعداد بھی اگر آخر میں درج کر دی جایا کرے تو بچوں کی تدریجی ترقی کا اندازہ لگانے میں اور آسانی ہو جائے گی ۔ اصلاح کے وقت حروف کی ساخت اور ہجے کے علاوہ بچوں کی دوسری کمزوریوں پر بھی نظر رکھنی چاہئے ۔ جو بچے بہت سست لکھتے ہیں ان کی رفتار کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے اس سلسلے میں اگر ہر بچے کے متعلق ایک ریکارڈ اس

طرح کا رکھا جائے کہ وہ ایک منٹ میں کتنے الفاظ لکھتا ہے تو دوسرے بچوں سے اس کی رفتارِ تحریر کا مقابلہ کرنے اور اس کو معیار پر لانے میں مزید سہولت ہو جائے گی۔ غرض نقل نویسی کا کام ابتدائی مدرسے خاص طور پر درجہ اول ۔ دوم اور سوم میں نہایت اہم خیال کئے جانے کے لائق ہے۔ جب تک معلمین اس طرف خصوصی توجہ نہ دیں گے اردو تدریس کے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو ابتدائی مدرسوں سے وابستہ کئے گئے ہیں۔

نقل نویسی کی طرح املا بھی تحریری کاموں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے درست ہجّے لکھنے کی استعداد میں ترقی ہوتی ہے اور سُن کر لکھنے کی عادت پختہ ہوتی جاتی ہے۔ املا میں چونکہ بچے کو غور و فکر سے بھی کام لینا پڑتا ہے اس لئے اس کے ذریعے حواسِ خمسہ کی تربیت اور ذہنی نشو و نما میں بھی مدد ملتی ہے۔ قوتِ حافظہ اور سماعت کو بھی املا سے تقویت پہونچتی ہے املا کے ذریعے نثر و نظم کے بعض اسباق کی ذہن نشینی میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ اس لئے ابتدائی مدرسوں میں املا کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

یوں تو دوسری جماعت کو بھی چند الفاظ کا املا بولا جا سکتا ہے۔ لیکن تیسری جماعت سے اس کا آغاز کرنا زیادہ مفید ہے۔ املا لکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بچوں کی درسی کتاب سے کوئی عبارت منتخب کی جائے اور بچوں کو ٹھہر ٹھہر کر مناسب لب و لہجے میں پڑھ کر سنا دی جائے اس کے بعد املا لکھنے کو کہا جائے۔ ہر فقرے کو ٹھہر ٹھہر کر اتنے وقفے کے ساتھ بولا جائے کہ سارے بچے آسانی سے سُن سکیں۔ درمیان میں کسی بچے کو بار بار بولنے یا پوچھنے کی اجازت نہ دی جائے آخر میں وہ عبارت پھر ایک مرتبہ پڑھ کر سنائی جائے تاکہ بچے اپنی بعض غلطیوں کو خود درست کرلیں۔ املا بولنے میں رموزِ اوقاف کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن بولنے کا انداز ضرور ایسا ہونا چاہئے کہ اہم رموزِ اوقاف خود بخود بچوں کی سمجھ میں آجائیں۔ دوسری تیسری جماعت میں البتہ بعض نشانات مثلاً وقفہ (— ؟) اور سوالیہ وغیرہ کے نشانات بولنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ املا کے لئے جو عبارت منتخب کی جائے وہ زیادہ سے زیادہ اتنی ہو کہ کاپی کے ایک صفحہ پر آسانی سے آسکے دوسری اور تیسری جماعت میں صرف نصف یا پون صفحے کا املا کافی ہے بعض معلمین املا کے لئے مشکل عبارت

کی تلاش کرتے ہیں یا عبارت کے بعد چند مشکل الفاظ الگ سے بطور املا لکھواتے ہیں یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ ایسے الفاظ بچوں سے ہرگز نہ لکھوانا چاہئے جن کے ہجے میں غلطی کا امکان ہو۔ اس طرح انہیں صحیح کے بجائے غلط لکھنے کی مشق ہو جائے گی۔ اور جن غلطیوں کے وہ عادی ہو جائیں گے وہ کبھی نہ دور ہو سکیں گی۔ اگر مشکل الفاظ بولنا ضروری ہے تو پہلے وہ الفاظ تختہ سیاہ پر لکھ دیئے جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ انہیں غور سے دیکھ لیں اس کے بعد املا لکھایا جائے۔ مشکل عبارت کو بھی لکھنے سے پہلے ایک دفعہ پڑھوا دینا مفید ہے۔ اس لئے کہ املا کا مقصد صرف ہجے درست کرانا نہیں بلکہ تحریر کی ہر قسم کی کمزوریوں کو دور کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے ہجے کے ساتھ بچوں کی رفتار تحریر۔ روانی۔ صفائی۔ حروف کی بناوٹ۔ بچوں کی نشست۔ لکھنے کے سامان مثلاً قلم۔ روشنائی۔ تختی یا کاپی ساری چیزوں پر نظر رکھی جائے۔ تاکہ املا لکھانے کے مقاصد پوری طرح حاصل ہو سکیں۔

املا کے کام کی اصلاح کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ سب سے بہتر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ معلم ہر بچے کی کاپی خود دیکھے اور ہر بچے کو انفرادی طور پر غلطیاں درست کرنے کی ہدایت کرے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ کاپیاں آپس میں بدلوا دی جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ وہ غلطیاں نکالیں اور درست کرکے کاپیوں پر لکھ دیں۔ اس کام کو تیز بچے تو آسانی سے کریں گے لیکن کمزور بچے غلطیاں نکالنے سے قاصر رہیں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچے ساری غلطیوں کا احاطہ نہ کر سکیں یا اپنی عدم واقفیت کی بنا پر صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کر دیں اس طریقے میں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ بچے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں خواہ مخواہ دوسرے کی غلطیوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھ دیں۔ اس لئے اس پر پورا بھروسہ کرنا مفید نہیں ہے۔ بچوں کی دیکھی ہوئی کاپیوں پر معلم کو ایک نظر ضرور ڈالنا چاہئے۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا۔ بچے مطمئن نہ ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جماعت کے چند اچھے بچے املا دیکھنے کے لئے منتخب کر دیئے جائیں اور جماعت کی گروہ بندی کرکے ہر بچے کے سپرد ایک گروہ کر دیا جائے پھر گروہ کی کاپیاں معلم باری باری دیکھے اور ہر گروہ کو ضروری ہدایات کرے۔ اجتماعی اصلاح کے لئے مفید صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچوں کی عام غلطیاں درست کرکے تختہ سیاہ پر لکھ دی جائیں اور بچوں سے نقل کروایا جائے۔ یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔ لیکن بچوں کی انفرادی کمزوریوں پر نظر رکھنا

بہت ضروری ہے۔ اچھے لڑکوں کے مقابلے میں کمزور بچوں پر خاص توجہ دینی چاہئے تاکہ وہ جلد آگے بڑھ سکیں۔ اصلاح کی آخری صورت یہ ہے کہ بچے خود اپنی اپنی کاپیاں اصل عبارت کی مدد سے درست کریں اور اپنی غلطیوں کو صفحے کے آخر میں لکھ دیں۔ چونکہ اپنی غلطیاں آپ نکالنا بہت مشکل کام ہے اس لئے بچوں کو اس طریقے سے زیادہ فائدہ نہ پہونچے گا۔ معلم کو ان کاپیوں پر ایک نظر ضرور ڈالنا چاہئے یا اچھے بچوں کی مدد سے ان کاپیوں کو دوبارہ درست کرانا چاہئے۔ املا کے سلسلے میں بھی بچوں کی رفتار تحریر اور غلط ہجوں کا ایک ریکارڈ رکھنا بہتر ہے تاکہ بچوں کی تدریجی ترقی کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے اور حسب ضرورت ہر بچے کی طرف کم یا زیادہ توجہ دی جاسکے۔

جیسا کہ ابھی واضح کیا جاچکا ہے کہ نقل نویسی یا املا کا مقصد صرف ہجے درست کرانا نہیں ہے بلکہ ان ذرائع سے بچوں کے تحریر کی ساری کمزوریاں دُور کرنا ہے اس لئے ہجے کی درستگی اور اس کی مشق کے لئے معلم کو بعض دوسرے ذرائع سے بھی کام لینا چاہئے اس سلسلے میں کئی دلچسپ مشغلے یا کھیل بچوں کے لئے تجویز کئے جاسکتے ہیں۔ معلمین اپنے تجربہ اور ذہانت سے اس قسم کے اور مشغلوں کو بھی کام میں لاسکتے ہیں۔

۱۔ تختۂ سیاہ پر چند الفاظ نامکمل صورت میں لکھے جائیں۔ یعنی بعض حروف دانستہ چھوڑ دیئے جائیں اور زبانی کام کے ذریعے بچوں سے چھوٹے ہوئے حروف حاصل کئے جائیں۔

۲۔ الفاظ کے حروف الٹ پلٹ کر لکھ دیئے جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ انہیں درست کریں

۳۔ بچوں کو ایک لفظ دیا جائے اور اس کی مدد سے دوسرے الفاظ بنوائے جائیں۔ جیسے "والا" کی مدد سے دودھ والا۔ سبزی والا۔ وغیرہ۔

۴۔ جملوں میں بعض الفاظ کی جگہ خالی چھوڑ دی جائیں اور بچوں سے انہیں پُر کرنے کو کہا جائے۔

۵۔ ایک لفظ تجویز کرکے بچوں سے کہا جائے کسی ایک حرف کی تبدیلی سے دوسرے الفاظ بنائیں جیسے "مال" کے لفظ سے ٹال۔ جال۔ سال۔ گال۔ لال۔ وغیرہ "اب" سے جب، کب، سب وغیرہ۔

۶۔ کسی بامعنی لفظ کے حروف کی مدد سے کوئی دوسرا لفظ بنوایا جائے جیسے ناک سے کان۔

۷۔ الفاظ سازی کا مقابلہ کرایا جائے یعنی بچوں کو پہلے دو گروہوں میں تقسیم کرلیا جائے اسکے بعد کہا جائے کہ

پہلے گروہ کا بچہ کسی حرف کا نام لے دوسرا گروہ اس پر ایک حرف کا اضافہ کرے اور دوسرا آگے بڑھائے۔ اس طرح جو گروہ بامعنی لفظ بنانے میں کامیاب ہو جائے اسے نمبر دیئے جائیں۔ اس کھیل میں چھوٹے بڑے سارے بچے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اور یہ کھیل جماعت کو کئی گروہوں میں تقسیم کرکے کھلایا جاسکتا ہے۔

۸ - تختہ سیاہ پر مختلف حروف لکھ دیئے جائیں اور بچوں سے کہا جائے کہ انہیں جوڑ کر معنی دار لفظ بنائیں۔ مثلاً ہ - ر - س - د - م - لکھ دیا۔ اس کی مدد سے بچے "مدرسہ" کا لفظ بنائیں گے۔

۹ - ایک دلچسپ مقابلہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک گروہ کوئی لفظ بولے۔ بیت بازی کی طرز پر دوسرا گروہ اس لفظ کے آخری حرف سے شروع ہونے والا لفظ بنائے مثلاً پہلے گروہ نے کہا "کتاب" دوسرے نے کہا "بکری" اب تیسرے نے کہا "یکہ" اور چوتھا بولا "ہاتھ" جو گروہ لفظ بنانے سے قاصر رہے وہ ہار مان لے۔

غرض اس طرح کے بہت سے کھیل معلم تیار کرسکتا ہے اور بچوں کے ہجے درست کراسکتا ہے۔ ہجے کی درستگی کے سلسلے میں اگر کبھی کبھی ہم قافیہ الفاظ لکھوائے جائیں تو ہجے ذہن نشین کرنے میں مزید آسانی ہو جائے گی۔ مثلاً چھوٹے بچوں سے آؤ - جاؤ - لاؤ - پاؤ - ناؤ - وغیرہ کے الفاظ ایک ساتھ لکھوائے جائیں یا دیکھا - سیکھا - کیا - پیا وغیرہ کے الفاظ اس طرح اگر معلمین مختلف جماعتوں کے لئے مختلف الفاظ کی فہرست مرتب کرلیں اور انہیں اپنی اپنی جماعتوں میں مختلف مشغلوں کے ذریعے لکھواتے رہیں تو بچے ہجوں کی عام غلطیاں نہ کریں گے۔

انشا اور اُس کی تدریس

انشا یا مضمون کا یہ مطلب ہے کہ بچے اپنے ذاتی تجربات ۔ خیالات ۔ مشاہدات اور معلومات کا اظہار جملوں کی صورت میں کرسکیں ۔ یہ اظہار تقریری اور تحریری دونوں میں ہوسکتا ہے ۔ پہلی صورت میں اس کا نام تقریری یا زبانی انشا اور دوسری صورت میں تحریری انشا ہوگا ۔ انشا یا مضمون سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچوں کو غور و فکر سے کام لینے اور حالات و واقعات کو منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی مشق ہو جاتی ہے یہ مشق ان کی آئندہ زندگی کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہے اور انہیں کامیاب مقرر ۔ فلسفی سیاست داں اور مصنف بنانے میں مدد کرتی ہے ۔ انشا سے ایک طرف تحریر میں روانی اور پختگی آتی ہے دوسری طرف زبان و بیان کی بعض خوبیوں کا وقوف و احساس پیدا ہوتا ہے ۔ بچوں کے ذخیرہ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے اور انہیں زبان کے عملی پہلوؤں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے انسان کی فطرت کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی بات دوسروں تک الفاظ کے ذریعے پہنچا دیتا ہے تو اُسے ایک طرح کی روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے یہ خوشی اُسے زبان کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور توجہ کا مرکز بنا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ انشا یا مضمون کی تدریس کو زبان کی تدریس کا نہایت اہم جزو خیال کیا جاتا ہے ۔

تدریسی حیثیت سے زبانی اور تحریری دونوں قسم کی انشا بچوں کے لئے یکساں مفید ہے ۔ لیکن ابتدائی مدرسوں میں بعض وجوہ سے زبانی انشا تحریری انشا سے بھی سے زیادہ اہم خیال کئے جانے کے لائق ہے ۔ کوئی تحریری کام اس وقت تک مفید نہیں ہوسکتا جب تک لکھنے سے پہلے بچوں کو اس پر زبانی اظہار خیال کا موقع نہ دیا جائے اس لئے زبانی انشا کو تحریری انشا سے نہ صرف یہ کہ مقدم خیال کرنا چاہئے بلکہ تحریری انشا کو کامیاب بنانے کے لئے زبانی انشا کی زیادہ سے زیادہ مشق کرانی چاہئے ۔ زبانی کام کے مقصد و اہمیت اور طریقہ کار پر ہم " بولنا " کے تحت پچھلے صفحات میں بحث کرچکے ہیں اس لئے یہاں صرف تحریری انشا یا مضمون نویسی کا ذکر کیا جائے گا ۔ ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں تحریری انشاء کی چار خاص صورتیں ہوسکتی ہیں ۔

۱- مضمون نویسی

۲- خطوط نویسی

۳- حکایات یا قصّہ نویسی

۴- نثری اسباق یا نظموں کے خلاصے اور اشعار کی تشریح

مضمون نویسی کا آغاز تیسری جماعت سے کر کے - پانچویں جماعت تک اس قدر مشق کرا دینی چاہئے کہ بچے اپنی دلچسپی اور مشاہدات کے موضوعات پر اظہار خیال کر سکیں - موضوعات کا انتخاب جماعت اور بچوں کی عمر - ان کی معلومات اور دلچسپیوں کا لحاظ رکھ کر کرنا چاہئے تاکہ بچے پوری توجہ کے ساتھ اس میں حصہ لے سکیں - تیسری جماعت کے لئے چند موضوعات مثلاً ڈاک خانہ - چڑیا گھر - سمندر، ریلیں ہوائی جہاز - گرمی کا موسم - سردی کا موسم - برسات کا موسم، کتاب، معلم - مدرسے کا باغ - جماعت کا کمرہ - مدرسے کی عمارت - گائے - کتا - اونٹ گاڑی - گھوڑا - کبوتر - پانی - آگ - ماں باپ - ہمارا گھر، ہمارا محلہ - میری سہیلی - میری بہن - میرا بھائی - بندر - بازار - وغیرہ نہایت مفید ہونگے - ان میں سے اکثر موضوعات چہارم میں بھی کام دیں گے - لیکن تیسری جماعت کے مقابلے میں مضمون کی ضخامت اور اس کا معیار قدرے بلند ہو جائے گا -

چوتھی اور پانچویں جماعت کی تدریس میں موزوں اشیاء اور دیدہ و شنیدہ واقعات کے ساتھ ساتھ چند ایسے موضوعات کو بھی شامل کر لینا چاہئے جن میں عملی و اخلاقی پہلو نمایاں ہو - مثلاً سچائی کا پھل - وطن کی خدمت - علم کے فوائد - محنت کا انعام - صفائی - ہمدردی اور رحم وغیرہ - چوتھی اور پانچویں جماعت کے بچے چونکہ اپنی بات دوسروں کو سنانے اور دوسروں کی نقل اتارنے کے بڑے شائق ہوتے ہیں اس لئے بعض ایسے موضوعات کا انتخاب بھی کرنا چاہئے جن میں انہیں اپنے آپ کو واحد متکلم کی صورت میں اظہار خیال کا موقع ہاتھ آ سکے - مثلاً "اگر میں پرندہ ہوتا" "اگر میں ریل ہوتا" "اگر میں معلم ہوتا" "اگر میں گھوڑا ہوتا" "اگر میں سپیرا ہوتا" وغیرہ کے موضوعات ان کے لئے نہایت دلچسپ ہو سکتے ہیں - ان کے علاوہ چند اور موضوعات مثلاً میرا لباس، میری کتاب - میرا مدرسہ، میرا گھر، ہمارے ہیڈ ماسٹر، جلسۂ تقسیم انعامات - اسکول کی نمائش - میلاد شریف کا جلسہ - مدرسے کی عمارت - عید - محرم کا جلوس - کھیل کا میدان - فٹ بال میچ -

کبڈی میچ کرکٹ میچ ۔ باغ کی سیر ۔ صبح سویرے اُٹھنا ۔ چاندنی رات ۔ ماسٹ کا کتب خانہ ۔ وغیرہ مضمون نویسی کے لئے بڑے کار آمد موضوعات ہیں ۔

مضمون نویسی کا تدریسی طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے تمہیدی گفتگو کے ذریعے بچوں کی توجہ مختلف موضوعات اور انشا کی طرف مبذول کرائی جائے پھر انہیں کے مشورے سے موضوع کا انتخاب کیا جائے اور اسے تختۂ سیاہ پر لکھ دیا جائے ۔ اب باہم تبادلۂ خیال یا سوال و جواب کے ذریعہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی جائے اور جب زبانی انشا کے ذریعہ موضوع کے متعلق کار آمد مواد بچوں کے سامنے آجائے اس وقت انہیں مضمون لکھنے کو کہا جائے اس سلسلے میں اگر مضمون کا ایک خاکہ بھی بطور نمونہ مرتب کرکے تختۂ سیاہ پر لکھ دیا جائے تو اور مفید ہوگا ۔

خطوط نویسی بھی تحریری انشا کے لئے بہت مفید ہے بلکہ چھوٹے بچے مضمون نویسی سے بھی زیادہ خطوط نویسی سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں ۔ ایک انگریز مورخ نے انشا کے سلسلے میں خطوط نویسی کی اہمیت و افادیت پر یوں روشنی ڈالی ہے ۔ " بچوں کو خطوط نویسی سے خاص ذوق ہوتا ہے بلکہ ان کے خیال میں لکھنا سیکھنے کا مقصد ہی خط لکھنا ہے ۔ ابتدا میں سب سے پہلے جس چیز کا انہیں تجربہ ہوتا ہے وہ یہی خط ہے جو اس وجہ سے ان کے لئے بھی عجیب و غریب اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ان کے ایک عزیز نے دور کے مقام سے ایک خط کے ذریعے بہت سی باتیں کہہ دیں اور باوجود اس قدر فاصلے کے وہ خط یہاں پہونچ گیا ۔" خط سے بچوں کا یہ فطری لگاؤ اس بات کا مقتضی ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں خطوط نویسی کی طرف خاص توجہ دی جائے اور تیسری جماعت ہی سے اس کام کا آغاز کر دیا جائے ۔ بچوں کو دو قسم کے خطوط لکھائے جاسکتے ہیں ۔ ایک نجی خطوط دوسرے کاروباری خطوط ۔ نجی خطوط میں اپنی خیر و عافیت ۔ اپنے امتحان کا حال ۔ مدرسے کی کیفیت ۔ اپنے معلم کی خوبیاں ۔ اپنے گھر مدرسے کی عمارت اور مدرسے کے انعامی جلسوں کے دیدہ و شنیدہ حالات ۔ بچے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھ سکتے ہیں ۔ کاروباری خطوط میں شادی بیاہ کے دعوت نامے ۔ مبارکبادی کے پیغامات اور پیغامات کے جوابات ۔ چھٹی کی درخواستیں وغیرہ شامل ہیں ۔ کھیل کود کا سامان، کتابیں اور لکھنے پڑھنے کی دوسری چیزیں منگانے کے لئے مختلف دکانداروں کے نام بھی خطوط لکھوانا مفید ہوگا ۔

خطوط نویسی کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ خطوط لکھانے سے پہلے معلم تختۂ سیاہ پر ہر قسم کے خطوط

بچوں کی مدد سے تیار کرائے اور ان سے نقل کرائے ۔ بعدازاں تمہیدی تبادلہ خیالات کے بعد انہیں مختلف قسم کے خطوط لکھنے کو دیئے جائیں ۔ اگر اس سلسلے میں اصلی خطوط جمع کر کے دکھائے جائیں تو بچوں کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جائے گا ۔ بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ جس دن خط لکھوانا مقصود ہو اس دن کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک ایک خط واقعی ڈاک کے ذریعہ بچوں کے پاس آجائے یہ کام بڑی کلاس کے لڑکوں سے کرایا جا سکتا ہے ۔ بچے خطوط پاکر نہایت خوش ہونگے اور ذوق و شوق سے کام کریں گے ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ خط کے مواد سے زیادہ خط کے خاکے کی درستگی کا لحاظ رکھا جائے ہر خط پر خط بھیجنے والے کا نام اور پتہ القاب و آداب تاریخ اور مکتوب الیہ کا نام لکھایا جائے اور نہایت احتیاط سے دیکھا جائے کہ بچوں نے ساری چیزیں مناسب جگہوں پر لکھی ہیں یا نہیں ۔ جب تک ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے گا خط نویسی کا مقصد فوت ہو جائے گا ۔

انشا کی تیسری صورت یہ ہے کہ بچوں سے پڑھی ہوئی کہانیوں کو اپنی زبان میں لکھوایا جائے درسی کتاب سے معلوماتی سبق کے خلاصے تیار کرائے جائیں اور بعض چیزوں پر سوالات کر کے جوابات لکھوائے جائیں ۔ کہانی اور کسی سبق کا خلاصہ بھی تیسری جماعت سے شروع کیا جا سکتا ہے بلکہ سوال و جواب کے ذریعے تو تحریری کام کا سلسلہ پہلی جماعت سے ہی شروع کرایا جا سکتا ہے اور مختلف موضوعات کی مدد سے پانچویں جماعت تک جاری رکھا جا سکتا ہے ۔ پہلی اور دوسری جماعت میں یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ بچوں سے کوئی بات کہی جائے اور اس کے متعلق دو تین مختصر اور آسان سوالات کئے جائیں مثلاً پہلی جماعت کے بچوں کے لئے اس قسم کی باتیں تختہ سیاہ پر لکھی جائیں (۱) تمہیں ایک روپیہ ملا ۔ (۲) اس نے ایک شیر دیکھا ۔ (۳) آگ لگ گئی ۔ اب ہر فقرے کے نیچے لکھ دیا جائے ۔ "کب اور کہاں ۔ اور کس طرح ۔ بچے تینوں سوالوں کا جواب ترتیب سے دیں گے اور چند سطروں کا مضمون تیار ہو جائے گا ۔ اسی طرح دوسری جماعت کے لئے چند باتیں تختہ سیاہ پر لکھ دی جائیں مثلاً آگ سلگانا ۔ روٹی پکانا ۔ بیج بونا ۔ صندوق بنانا ۔ پھر بچوں سے سوال کیا جائے یہ کام کس طرح ہو سکتا ہے ۔ بچے ہر ایک کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے ۔ غرض کہ سوال و جواب کے ذریعے مضمون نویسی کی بناء پہلی جماعت سے ڈالی جا سکتی ہے اور نہایت مفید ہوگی ۔

مضمون نویسی کی اصلاح کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہر بچے کی کاپی پر الگ الگ اصلاح دی جائے

اصلاح کے وقت مضمون کے خاکے۔عنوان۔ذیلی عنوانات۔مواد کی صداقت یا خامی۔مواد کی ترتیب خیالات کی تنظیم۔پیراگراف کی موزونیت۔تمہید۔مضمون کی مقدار۔رموز اوقات۔خوشخطی۔صفائی۔ الفاظ کے ہجے۔سطروں کے درمیانی فاصلے۔صحت زبان وبیان اور حسن بیان پر خاص طور پر توجہ دی جائے اور بچوں کی تدریجی ترقی کا ایک ریکارڈ رکھا جائے تاکہ ہر بچے کو انفرادی طور پر سمجھنے میں مدد ملتی رہے ۔

وسطانی اور ثانوی جماعتوں میں مصنفین کی سوانح عمریاں، قدرے طویل اور غور طلب مضامین، اسباق کے خلاصے، طویل نظموں کی تلخیص، اشعار کی نثر اور نظم ونثر کے ٹکڑوں کی تشریح وغیرہ بھی مضمون نویسی یا انشا کے زمرے میں شامل ہوجائے گی ان جماعتوں میں تحریری کام کی اصلاح کا طریقہ کار وہی ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا ہے لیکن ان منزلوں میں زبان وبیان کی صحت کے ساتھ مضمون کے مواد اور اس کی منطقی ترتیب کو خاص اہمیت دی جائے گی۔نویں اور دسویں جماعت میں کسی موضوع پر اچھا برا اظہار خیال کر لینے ہی کو سب کچھ نہ سمجھا جائے گا بلکہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ بیانیہ قوت کے ساتھ طلبہ میں ایجاد واختراع اور تخلیق وتخیئل کی قوتیں کس درجہ ہیں اور وہ کس طرح اُبھر رہی ہیں، گویا ان درجوں میں واقعات یا معلومات کو غور وفکر اور ایک خاص انداز سے پیش کرنے کو کامیاب انشا خیال کیا جائے گا۔اشعار کی تشریح میں طلبہ سے توقع کی جائے گی وہ نفسِ مضمون کو بیان کرنے کے ساتھ اُن کے محاسن پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈالیں اور اشعار کے تاثر کو اپنی تحریر میں سمونے کی کوشش کریں، یہ بات طلبہ میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ مدرسہ میں اُن کے ادبی ذوق وشوق کی تربیت کا معقول انتظام ہو اور معلم پوری توجہ صرف کرتا ہو۔ادب خصوصاً شعر وشاعری کی تدریس ایک خوش ذوق اور خوش بیان معلم کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی، معلم جس قدر باذوق ہوگا اور اشعار کے مواد واسلوب بیان سے جس قدر لطف وتاثر قبول کرسکے گا اسی قدر وہ اُنہیں اپنے طلبہ تک پہونچا سکے گا۔یعنی نظم کی تدریس میں نصاب وطریقہ کار کو وہ اہمیت نہیں جو معلم کو ہے معلم ہی طلبہ کی نظر میں نصاب کو اہم اور طریقہ کار کو دلچسپ بناتا ہے۔تدریس میں جان معلم کی شخصیت سے ہی پیدا ہوتی ہے اور طلبہ میں استحسانی قوتوں کا فروغ اسی کی توجہ پر منحصر ہوتا ہے۔

انشاء کی قسموں میں، تصویری انشا کے سلسلے میں بھی کچھ جاننا ضروری ہے اس لئے کہ آٹھویں

جماعت تک کے طلبہ تصویروں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں اور اُن کی ذہنی نشو و نما اور تخیلی قوتوں کے فروغ میں، تصویروں سے خاصی مدد مل سکتی ہے تصویری انشا دو طرح کی ہو سکتی ہے۔

(۱) تقریری تصویری انشاء

(۲) تحریری تصویری انشار

تقریری تصویری انشار میں، کہانی یا سبق کا مواد تصویروں کے ذریعے اخذ کرایا جاتا ہے ۔معلم تصویر کو تختۂ سیاہ پر آویزاں کر کے سوالات کرتا ہے ۔ طلبہ باری باری سے جوابات دیتے ہیں، جوابات کی مدد سے تصویری کہانی، تقریری کہانی میں منتقل ہو جاتی ہے اور طلبہ پوری کہانی سُنا دیتے ہیں۔

تحریری تصویری انشار میں پہلے "تقریری انشاء کا عمل رونما ہوتا ہے، یعنی مسلسل تصویروں اور سوال و جواب کی مدد سے سبق کا پورا مواد طلبہ سے زبانی اخذ کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر تصویر کے مواد کا خلاصہ تختۂ سیاہ پر درج کیا جاتا ہے ۔مختلف تصویروں کے خلاصوں سے پوری کہانی کا مواد مرتب ہو جاتا ہے، طلبہ اس مواد کی تفصیل میں جاتے ہیں، معلم ان تفصیلات کو قلمبند کرنے کو کہتا ہے اور ہر طالب علم اپنے خاص انداز میں کہانی کو مکمل کر کے معلم کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

" تصویری انشا " چھوٹی جماعتوں کے لئے بہت ہی کارآمد اور دلچسپ ثابت ہوتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ جو تصویریں کسی خاص سبق یا کہانی کی تدریس کے لئے تیار کرائی جائیں وہ

(۱) خوب صورت، نمایاں اور دلکش ہوں۔

(۲) سبق یا کہانی کا ہر پہلو، ان تصویروں میں سما گیا ہو۔

(۳) مواد و موضوع کے علاوہ کہانی یا سبق کا پس منظر بھی تصویروں سے عیاں ہو۔

(۴) تصویروں کے ذریعے مواد یا موضوع کو اسی ترتیب سے پیش کیا گیا ہو جس ترتیب سے وہ سبق میں آیا ہے۔

(۵) تصویروں کے سلسلے میں جو سوالات مرتب کیے گئے ہوں کہ وہ طلبہ کے معیار کے مطابق اور زبان و بیان کے لحاظ سے آسان جامع اور فکر انگیز ہوں۔

ان پہلوؤں کو مدِنظر رکھے بغیر، تصویری انشاء کامیاب نہیں ہو سکتی، مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں پورے سبق کو تصویروں کے ذریعے پیش کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، دیکھا گیا ہے کہ چند

زیرِ تربیت اساتذہ ہی امتحان کے موقعہ پر تصویری انشا سے کام لیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ کسی سبق کے ہر پہلو کو تصویروں میں پیش کرنے کے لئے محنت، وقت اور پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ایک تصویری سبق میں اتنی رقم خرچ ہوتی ہے کہ پاکستان کا غریب معلم اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔

باہر کے ملکوں میں تصویری انشا سے بطورِ خاص مدد اس لئے لی جاتی ہے کہ وہاں تصویروں کے اخراجات کا بار معلم کو نہیں اُٹھانا پڑتا۔ ہر قسم کی تعلیمی تصویریں حکومت کے خرچے پر بنوائی جاتی ہیں۔ اور مدرسوں میں ایسے سائنسی آلات ہوتے ہیں کہ اُن کی مدد سے بہت کم خرچ پر ضروری تصویریں بنائی جاتی ہیں، ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس لئے "تصویری انشا" عملاً کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے مدرسوں میں جو ٹیچر آرٹ کی تعلیم دیتے ہیں وہ بطورِ خاص اس طرف توجہ کریں، اِدھر اُدھر کی چیزیں بنوانے کے بجائے نصاب کے بعض اسباق کو سامنے رکھ کر اُن کے مرقع تیار کرائیں۔ یہ مرقعے، تدریس کے لئے نہایت مفید ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کو بھی تصویروں سے دل چسپی پیدا ہو گی اور وہ آگے چل کر بعض اسباق کے تصویری خاکے خود تیار کر لیں گے۔

لیکن "تصویری انشاء" کی تدریس کا طریقہ کار، نظم و نثر کے عام اسباق سے قدرے مختلف ہو گا اس میں قرأت اور اخذ معانی کے اقدامات نظر انداز ہو جائیں گے ہاں مواد کی تفہیم اور تلفظ کی صحت کا بہت اچھا موقع مل جائے گا، تقریر و تحریر، دونوں کی اک ساتھ مشق ہو سکے گی اور آسانی سے پتہ چل سکے گا کہ ایک طالب علم کس قسم کی انشا میں خاص مہارت یا کمزوری رکھتا ہے۔

"تصویری انشا" کے بعض نمونے اشارات سبق کے طور پر درج کر دیئے گئے ہیں، ان سے پورا اندازہ ہو سکے گا کہ "تصویری انشا" سے زبان کی تدریس میں کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

قواعد اور اُس کے تدریسی مسائل

قواعد جمع ہے "قاعدہ" کی، اصطلاح میں قواعد سے مراد، زبان کا وہ علم ہے جس میں زبان کی ساخت، حروف کی تعداد، الفاظ کی قسمیں، تذکیر و تانیث کے اصول، واحد جمع کے قاعدے، الفاظ سازی کے قوانین، افعال، افعال کی قسمیں، مفرد و مرکب الفاظ، جملوں کی بناوٹ اور قسمیں، فاعل، مفعول اور حرف جار کے استعمال اور اس قسم کے دوسرے مسائل زیر بحث آتے ہیں، ظاہر ہے یہ ساری باتیں، علم زبان کے لئے خاصی اہم اور مفید ہیں۔ ان کا مطالعہ کئے بغیر کوئی شخص زبان کا عالم نہیں بن سکتا اس کے لئے قواعد کے نکات کا جاننا ضروری ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ قواعد ایک قسم کا معلّم زبان ہے جو ہمیں آئے دن زبان سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اگر آج مختلف زبانوں میں قواعد کی کتابیں موجود نہ ہوتیں تو مادری زبان کے سوا کسی دوسری زبان کا سیکھنا سکھانا ہمارے لئے بہت مشکل ہوتا۔ دراصل یہ قواعد ہی ہے جس کی بدولت ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کی زبان بہ آسانی سیکھ لیتے ہیں۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ علم زبان میں قواعد کا مقام نہایت اہم ہے لیکن ابتدائی مدرسوں کی اردو تعلیم کو زباندانی یا علمِ زبان کے نقطہ نظر سے دیکھنا درست نہیں ہے۔ پرائمری مدرسوں میں اردو تعلیم کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ طلبہ میں اُردو پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو۔ وہ زبان کو تقریر و تحریر میں زیادہ سے زیادہ برت سکیں اور اُسے اپنی عملی زندگی کا اہم جزو خیال کریں۔ ابتدائی مدرسوں کے طلبہ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ زباندانی کے اصول و قواعد کی باریکیوں کو سمجھ سکیں یہ چیزیں ان کی عملی زندگی سے کوئی ربط نہیں رکھتیں اس لئے نہ وہ قواعد کی اہمیت کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ انہیں محسوس کرانے کی ضرورت ہے ان کے سامنے اگر قواعد کی خشک و بے کیف اصطلاحات کا ذکر چھیڑا گیا تو انہیں دلچسپی کے بجائے ایک قسم کی الجھن ہوگی اور وہ زبان کی تدریس سے دور بھاگنے لگیں گے۔

زبان کی تدریس کا بہترین معلم خود طلبہ کا ماحول اور ان کی فطرت ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ

طلبہ قواعد کے نام سے ناآشنا ہوتے ہیں لیکن ان کی تحریر و تقریر قواعد کے اصول کے عین مطابق ہوتی ہے اگر کسی چھوٹے بچے سے یہ سوال کیا جائے کہ تذکیر و تانیث یا مذکر و مونث کسے کہتے ہیں۔ تو وہ الجھن میں پڑ جائے گا اور جواب دینے سے قاصر رہے گا لیکن بول چال یا تحریر میں وہ ان کے استعمال میں غلطی نہ کرے گا بچہ فطرتاً نقال ہوتا ہے وہ دوسروں کو جو کچھ کرتے اور جس طرح بولتے دیکھتا ہے وہی کرتا ہے اور اسی طرح بولتا ہے اس لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی بچہ اپنی ماں سے یہ کہے کہ اماں کہاں جاتے ہو یا ابا کہاں جاتی ہو۔ وہ ہمیشہ یہی کہے گا کہ اماں کہاں جا رہی ہو اسی طرح ابا کے لفظ کو وہ ہمیشہ مذکر استعمال کرے گا۔ یہی حال قواعد کے دوسرے اصولوں کا ہے۔ اصطلاحی طور پر طلبہ قواعد سے آشنا نہیں ہوتے لیکن عملی طور پر وہ قواعد کے اکثر اصولوں کی مہارت رکھتے ہیں۔ اور تقریر و تحریر میں قواعد کی غلطیاں نہیں کرتے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر طلبہ کو صحیح ماحول میسر آجائے اور انہیں ایک اچھے اردو معلم کی رہبری حاصل ہو جائے تو پھر انہیں خارجی طور پر قواعد کا درس دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن چونکہ ہمارے یہاں کا معاشرتی ماحول اس قسم کا نہیں کہ وہ اردو کے سلسلے میں طلبہ کی پوری رہنمائی کر سکے اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ چوتھی یا پانچویں جماعت کے طلبہ کو قواعد کے بعض ضروری اصول و اصطلاحات سے آشنا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی رہبری آپ کر سکیں اور زبان و بیان کی بعض غلطیوں کو خود درست کرنے کے اہل ہو سکیں۔

قواعد چونکہ ایک خشک مضمون ہے اس لئے اس کی تدریس میں ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جس سے طلبہ کی دلچسپی برقرار رہ سکے۔ قواعد سے طلبہ کی بیزاری کی ایک عام وجہ یہ ہے کہ بعض معلمین چند بے ربط اصطلاحات طلبہ کے سامنے لاتے ہیں اور ان کی تعریفیں یاد کرا دیتے ہیں۔ طلبہ امتحان یا معلم کے خوف سے یہ تعریفیں ازبر کر لیتے ہیں اور چند دن بعد بھلا دیتے ہیں۔ قواعد کی تدریس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ نظم و نثر کی تدریس کے درمیان طلبہ کو وقتاً فوقتاً بعض مثالوں کے ذریعے قواعد کی بعض اصطلاحات سے روشناس کرایا جائے اور جہاں تک ہو سکے۔ خود طلبہ سے ان کی تعریفیں متعین کرائی جائیں۔ اصطلاحات کو بندھے ٹکے الفاظ میں رٹا دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مثالوں کے ذریعے خود طلبہ کو اس بات کا موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنے الفاظ میں اصطلاحات کی خصوصیات و تعریف بیان کریں گویا قواعد کی تدریس میں استخراجی طریقہ سے نہیں بلکہ استقرائی

طریقے سے کام لیا جائے اور ترکیب کے بجائے تحلیل سے فائدہ اُٹھایا جائے یعنی حروف سے شروع کرنے کے بجائے قواعد کی تدریس میں بھی جملوں اور جملے کے اجزاء سے مدد لینا چاہیئے مثلاً فاعل، مفعول، فعل، اسم، صفت اور حرف جار وغیرہ کو بتدریج بتایا جائے۔ یہ سارا کام علیحدہ درس کی صورت میں نہ کیا جائے بلکہ اُردو کے عام درس میں جا بجا ان کی طرف اشارے کئے جائیں۔

زبان کے بعض پرانے معلمین قواعد کی تدریس پر حد درجہ زور دیتے ہیں اور اُسے زباندانی کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ تدریس قواعد کے سلسلے میں اُن کا دعویٰ ہے کہ۔

(۱) قواعد، طلبہ میں لکھنے کی عادت پیدا کرتی ہے اور وہ قواعد کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار، صفائی اور صحت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

(۲) مختلف جماعتوں کے نصاب میں قواعد کے بعض اجزاء شامل ہوتے ہیں اور جن طلبہ کو قواعد کے مباحث میں مہارت حاصل ہوتی ہے وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔

(۳) قواعد، بولنا سیکھنے سکھانے میں مدد کرتی ہے اور طلبہ رفتہ رفتہ صحت کے ساتھ اس طرح بولنا سیکھ جاتے ہیں کہ اُن کی تقریری یا تحریری انشا میں غلطی کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں

(۴) قواعد کی مدد سے طلبہ اپنی اور دوسروں کی غلطیوں کی اصلاح، استاد کے بغیر اپنے طور پر کر سکتے ہیں۔

(۵) قواعد، زبان کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے اور طلبہ دوسروں کی تقریر و تحریر کا مطلب آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

(۶) قواعد، طلبہ کی ذہنی قوتوں کی تربیت کرتی ہے اور غور و فکر کی عادت ڈالنے میں مدد کرتی ہے

(۷) زبان کی تدریس میں، قواعد طلبہ کے لئے ایک طرح کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہے۔

یہ دعوے جزوی طور پر درست کہے جا سکتے ہیں۔ کلی طور پر نہ یہ درست ہیں اور نہ تجربات سے ان دعووں کی تصدیق ہوتی ہے، دنیا کے سارے ماہرین زبان کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایک بچے کے لئے زبان کا بہترین معلم وہ ماحول و معاشرہ ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں بولی جانے والی زبانیں قدیم ترین زمانے سے موجود ہیں لیکن ان کی قواعد بہت بعد کو مرتب ہوئی ہیں یعنی قواعد یا اُس کے اصولوں نے کسی زبان کو جنم نہیں دیا۔ بلکہ ایک ہی بنائی

زبان سے قواعد کے اصول وارکان مرتب کیے گئے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قواعد، زباندانی کے سلسلے میں کچھ ایسی کارآمد نہیں تو اُسے مرتب کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ۔اس کے جواب میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "جامع القواعد" میں لکھا ہے کہ :۔

"قواعد نویسی کا مقصد یا تو کسی زبان میں بدلتے ہوئے محاورے کے پیش نظر زبان کی اصل صورت کو قائم رکھنے اور برقرار رکھنے کا تھا جیسا کہ سنسکرت کی ابتدائی قواعد نویسوں کے پیش نظر تھا یا کسی قدیم مصنف یا دور کی زبان کی تفہیم، تعلیم اور تدریس کے لئے اُس کے اصول وضوابط مقرر کئے گئے جیسا کہ یونانیوں نے ہومر کے مطالعہ کی غرض سے یونانی قواعد کی طرف توجہ کی یا پھر اُن لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لئے قواعد کی ضرورت پیش آئی جن کو ایک نئی زبان سیکھنی تھی ۔اس موقع پر کبھی تو اہلِ زبان نے خود اپنی زبان کی قواعد مرتب کی جیسا کہ بعض قواعد نویسوں کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے یا پھر اُس زبان کے نئے سیکھنے والوں نے خود اپنی ضرورت سے اُس کے قواعد کا تجزیہ کرکے انھیں قواعد کی مرتب صورت دی ۔اکثر اوقات نئے مذاہب کی تبلیغ واشاعت نے زبانوں کے مطالعے کو تقویت بخشی اور دنیا کے بعض عظیم مذاہب جب اپنے محدود علاقوں سے باہر پھیلے تو ایسے لوگوں کو ان مذاہب کی زبانوں سے واسطہ پڑا جو اُن کے لئے بالکل اجنبی تھیں، اس کے لئے بھی قواعد زبان مرتب کرنے اور ان کی باقاعدہ تعلیم کی ضرورت پیش آئی"

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ قواعد اور اُس کے تدریس کے یہ اعلیٰ مقاصد، ابتدائی یا ثانوی مدارس سے نہیں، تدریس زبان کے اعلیٰ مدارج سے تعلق رکھتے ہیں اگر ان اعلیٰ مقاصد کے حصول اور تدریسی سہولتوں کی خاطر ابتدائی اور ثانوی منزلوں میں قواعد کے بعض اجزاء کا تعارف ضروری خیال کیا جائے تو بھی ان جماعتوں میں قواعد کو ایک الگ مضمون کی صورت سے پڑھانا مفید نہ ہوگا، خاص طور پر قواعد کی

تدریس کا وہ پرانا ڈھرا جس میں پہلے اصطلاحات کی تعریفیں رٹائی جاتی ہیں اور بعد کو بطور مثال الفاظ سامنے لائے جاتے ہیں کسی طرح کارآمد نہیں ہو سکتا، قواعد اور اُس کے طریقۂ تدریس کو بدلنا ہوگا۔ قواعد کے نکات و اجزار کو الگ سبق کی صورت میں نہیں بلکہ دوسرے تحریری کام یعنی انشا ر کے ساتھ ساتھ اُن کا تعارف اور اُن کی مشق کرانی ہوگی۔

قواعد کی تدریس کے سلسلے میں یہ صرف میری رائے نہیں ہے بلکہ جنھوں نے اس موضوع پر غور کیا ہے سبھی اسی نتیجے پر پہونچے ہیں کہ قواعد کے ذریعہ زبان نہیں بلکہ زبان کے ذریعہ قواعد پڑھانا چاہیے۔ انگریزی میں تو خیر اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُردو میں بھی بعض بزرگ اہل قلم نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ چند دن ہوئے اس موضوع پر پروفیسر سید وقار عظیم ایم، اے بی ٹی کا ایک اہم مقالہ "ثانوی تعلیم" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ وقار عظیم صاحب اُردو زبان کے پارکھوں اور عالموں میں ہیں۔ ایک عظیم نقاد و ادیب ہی کی حیثیت سے ہی نہیں، اُردو زبان کے معلم کی حیثیت سے بھی اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے جامعہ ملیہ دہلی تا پنجاب یونیورسٹی۔ وہ ابتدائی و ثانوی درجوں سے لے کر ایم۔ اے اور پی، ایچ، ڈی تک کے طلبہ کی رہنمائی کر چکے ہیں اور تدریس اُردو کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، قواعد اور اُس کی تدریس کے سلسلے میں اُن کے خیالات چونکہ معلمینِ اُردو کے لئے خاصے اہم اور کارآمد ہیں اس لئے اُنہیں کے لفظوں میں درج کئے جاتے ہیں۔

" قواعد کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ قواعد ہمیں بولنا سکھاتی ہے لیکن اس دعوے میں بہت کم صحت ہے اس کا اندازہ اس بات پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے کہ بچہ بولنا کس طرح سیکھتا ہے اور وہ غیر محسوس طریقے سے کس طرح لفظوں سے فقرے، فقروں سے جملے اور جملوں سے مسلسل خیال بناتا رہتا ہے، پانچ برس کی عمر میں بچہ اپنے بڑوں سے باتیں سُن کر اتنی اچھی زبان بولنے لگتا ہے کہ کوئی غیر ملک کا رہنے والا برسوں کی شدید محنت کے بعد بھی نہیں بول سکتا، اس کی زبان میں روانی ہوتی ہے اور اُس کے خیال میں تسلسل، وہ کبھی کبھی تو ایسی باتیں کہہ دیتا ہے کہ خود بڑوں کو بھی ان پر حیرت ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے طرح طرح کے محاورے اور کہاوتیں جملوں میں استعمال کرتا ہے اور اسے ان سب چیزوں کا علم بھی نہیں ہوتا، کوئی اندرونی طاقت فطری طور پر اس کی مدد کرتی رہتی ہے وہ نئے فقرے بناتا ہے اس کی زبان سے نئے جملے نکلتے ہیں اور اس کے دل میں ذرا سی دیر کے لئے بھی قواعد یا

اس کے قاعدوں کا خیال تک نہیں آتا وہ جملے صرف اس لئے استعمال کرتا ہے کہ اسے ان کے صحیح ہونے کا یقین ہے۔ اگر کوئی اس سے اس کی وجہ پوچھے تو شاید وہ گونگا بن کر کھڑا ہو جائے اسے لفظوں کے معنی بغیر لغات دیکھے معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں صحیح موقعوں پر بالکل اُسی بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے جس طرح ہم سانس لیتے ہیں۔ بیلرڈ (BALLARD) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم اپنی گفتگو میں اگر کوئی قواعد استعمال کرتے ہیں تو یا تو وہ جو ہم نے کبھی سیکھی ہی نہیں اور یا وہ جسے ہم سیکھ کر بھول چکے ہیں۔ کسی سیکھے ہوئے قاعدے کا خیال آتے ہی مفہوم ہمارے ذہن سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کے قاعدے کو استعمال کرنے میں بے حد دیر لگتی ہے اس لئے کہ جب تک بولنے والا قاعدے کو یاد کرتا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے۔ یہی حال بچوں کا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں انہیں کسی کوشش سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خیال کے ساتھ جملے خود بخود ذہن میں آتے ہیں اور زبان انہیں ادا کر دیتی ہے، ایک چیز کو دوسری شکل اختیار کرنے میں اتنی دیر نہیں لگتی کہ اسے کوئی محسوس کر سکے۔

بولنے کی عادت اور اچھا بولنے کی مشق رفتہ رفتہ اور فطری طور پر حاصل کی ہوئی عادتیں ہیں۔ بناوٹی چیزوں کا دباؤ نہ انہیں دبا سکتا ہے اور نہ اُنہیں اُبھرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس لئے زبان سکھانے کے لئے قواعد ایک بے اثر اور بے معنی چیز ہے، جسے فطرت اپنی رو میں بہائے جاتی ہے۔ اگر کوئی قواعد کی مدد سے بچوں کو زبان سکھانا چاہے تو اس کی مثال اس آدمی کی سی ہوگی جو ڈول بھر بھر کے کسی بہتے ہوئے چشمے کو خالی کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔

یہ دعویٰ کہ قواعد کی مدد سے زبان کی صحت ہو سکتی ہے اور بھی بے بنیاد ہے۔ اس کا اندازہ بھی بچے کی مثال لے کر زیادہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ بچہ پہلے غلط زبان سیکھتا ہے اس کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب ٹھیک نہیں ہوتی۔ اسے چیزوں کی تذکیر و تانیث کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے فقروں اور غیر مکمل جملوں میں اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے۔ کوئی اسے نہیں بتاتا کہ وہ کیا غلطی کر رہا ہے وہ بغیر کسی کی مدد کے، رفتہ رفتہ خود اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتا رہتا ہے اور آخر میں خود بخود صاف ستھری زبان بولنے لگتا ہے۔ اس لئے زبان کی غلطیوں کو قواعد کی مدد سے دور کرنے کی کوشش گویا فطرت کے راستے میں روڑا اٹکانا ہے۔ جس طرح غلطی کسی نے اس کے دماغ میں بٹھائی نہیں تھی۔

اسی طرح ان کے نکالنے کے لئے بھی کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ غلطی چونکہ ارادی طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی اصلاح کے لئے بھی کسی ارادی تدبیر یا علاج کی ضرورت نہیں اس میں عقل کو نہیں بلکہ صرف فطرت کو دخل ہے جس طرح فطرت نے وہ غلطی اس کی زبان پر جاری کی، اسی طرح فطرت خود بخود اسے دور بھی کر دے گی وہ اپنے بڑوں سے صحیح باتیں سنتے سنتے خود انہیں صحیح بولنے کا عادی ہو جائے گا۔"

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ قواعد ہمیں زبان کے صرف تھوڑے سے سطحی اصول سکھا سکتی ہے ہر زبان میں صدہا محاورے اور کہاوتیں ایسی ہیں جو قواعد کی احسان مند نہیں۔ ان کی تعلیم ماں کی گود، بہن بھائیوں کی صحبت، اور آگے چل کر دوستوں، جاننے والوں اور ملنے جلنے والوں کی سنگت میں ہوتی ہے اور ان کی اچھائی برائی کا احساس صرف اہل زبان کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قواعد زبان کے کچھ ابتدائی اصول سکھا سکتی ہے تو یہ بات تو یقینی ہے کہ زبان کا ایک بہت بڑا اور خاصا قیمتی حصّہ اس کی دسترس سے باہر ہے اس لئے قواعد سے نہ اس کے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے اور نہ اس کی غلطیوں کی اصلاح میں۔ اگر حقیقت میں یہی چیز زبان کے سیکھنے اور اس کی غلطیوں کے دور کرنے کا ذریعہ ہوتی تو پھر اہل زبان اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ ہر شخص تھوڑے سے قاعدے سیکھنے اور ان کی مشق کرنے کے بعد آسانی سے دوسری زبانوں پر بھی وہی قدرت حاصل کر لیتا جو اُسے مادری زبان پر حاصل ہے۔

زبان کا سیکھنا اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا زبان کی تعلیم کی پہلی منزل ہے، اس کا سیکھنا، صحیح لکھنا اور اچھا لکھنا ایسی منزلیں ہیں جن پر آدمی بہت بعد میں پہنچتا ہے۔ قواعد کی رسائی، سچ پوچھئے تو پہلی منزل تک بھی اچھی طرح نہیں ہوتی آگے کی منزلیں تو قطعاً اس کی دسترس سے باہر ہیں ایک چیز اور بھی دیکھنے کی ہے اپنی مادری زبان میں بھی ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتا اور موثر طریقے سے اپنے خیالات کو تحریر میں لانے والوں کے نام تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں پھر بھلا کیسے کہا جا سکتا ہے کہ محض قواعد سیکھ کر انسان صحیح زبان لکھ سکتا ہے۔ تعلیم میں اس طرح کے تجربات سے جو نتائج برآمد ہوئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جن مدرسوں میں قواعد کی تعلیم نہیں دی جاتی وہاں کے بچے لکھنے میں ان مدرسوں کے بچوں سے زیادہ مشاق ہیں، جہاں قواعد کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے خود ہم اپنے مدرسوں میں دیکھتے ہیں کہ جو لوگ رٹ کر قواعد کے سوالوں میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ نمبر حاصل کر لیتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ لکھنے میں بھی

اچھے ہوں۔ بلکہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ قواعد کے جن اصولوں پر انہیں بظاہر عبور حاصل ہے لکھنے میں وہ ان کی ذرا بھی پابندی نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے اکثر طلبہ ایسے ملیں گے جو تحریریں اپنے خیالات روانی اور صفائی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں، لیکن انہیں قواعد یا تو بالکل نہیں آتی اور اگر آتی ہے تو بہت کم۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا واقعی قواعد کی مدد سے دوسروں کے خیالات کے سمجھنے میں کوئی مدد ملتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زبان کا ایک بہت ہی محدود حصہ ایسا ہے جس پر قواعد قادر ہے اور لکھنے والے اپنی تحریروں میں قواعد سے کہیں زیادہ زبان کے اس حصے سے کام لیتے ہیں، جو صدیوں کے مسلسل عمل اور نسلوں کی کوششوں کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جو شخص صرف اتنی زبان سے جانتا ہے جتنی قواعد کی مدد سے سیکھی جاتی ہے وہ دوسروں کی تحریروں کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

اب سے کچھ برس پہلے تک ماہرین نفسیات کے ایک گروہ کا یہ خیال تھا کہ دماغ کی مختلف قوتوں کی تربیت مختلف مضامین سے ہو سکتی ہے بعض مضمون فکر اور غور کی قوت کو ترقی دیتے ہیں۔ کچھ مضمون دلیل و برہان کی قوت کو بڑھاتے ہیں کچھ مضامین سے حافظے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ قوتیں اتنی ترقی کر لیتی ہیں کہ ان سے ہر موقع پر کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر پرانے زمانے میں قواعد کو طلبہ کے نصاب میں صرف اسی لئے داخل کیا جاتا تھا کہ اس سے ہمارے دماغ میں چیزوں کے درمیان تسلسل اور ترتیب پیدا کرنے کی قوت بڑھتی ہے۔ جب تک لوگ نفسیات کے اس نظریئے کو مانتے تھے، ان کا خیال تھا کہ واقعی مختلف مضامین سے ہماری مختلف ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن نفسیات میں جو جدید انکشافات ہوئے ہیں انہوں نے اس نظریئے کو بالکل رد کر دیا ہے اور اس لئے قواعد کو جن نفسیاتی فوائد کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس سے وابستہ نہیں رہے اور یوں گویا افادی نقطہ نظر سے بھی قواعد کی تعلیم ہمارے لئے زیادہ کارآمد نہیں رہی۔

اب صرف ایک ہی بات بچی، جس کی بنا پر ہم قواعد کو طلبہ کے نصاب میں اہمیت دے سکتے ہیں اور وہ یہ کہ خواہ اس میں اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم یہ فائدہ ضرور ہے کہ طلبہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں تجربہ کہتا ہے کہ نہیں، اور علم اور نفسیات اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ طلبہ صرف اسی چیز میں دلچسپی لیتے ہیں، جس کی بنیاد ان کے تجربے پر ہو جس چیز کا تعلق ان کی زندگی سے ہو اور جس چیز کو وہ اچھی طرح

سمجھ سکتے ہوں۔ قواعد میں ان تینوں باتوں میں سے کیا کیا باتیں موجود ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے بیلرڈ (BALLARD) کی رائے پر غور کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"قواعد کی تعلیم میں بچے کے لئے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ مانوس چیزوں کو غیر مانوس طریقوں سے سمجھانا چاہتی ہے۔ بچہ (قواعد کے مقابلے میں) زبان سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ مانوس چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خیالات کے ادا کرنے میں مدد دیتی ہے۔"

بچے کا فطری جھکاؤ اور رجحان چیزوں (OBJECTS) کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے لئے لفظوں کے متعلق کچھ سوچنا بے حد دشوار ہے اور اس سے زیادہ دشوار ہے خیالات کے متعلق سوچنا اور سب سے زیادہ دشوار اس ربط کا تصور ہے جو چیزوں، لفظوں اور خیالات کے درمیان ہوتا ہے لفظوں سے غیر مانوس ہو کر بھی اسے ان کے اندر چھپے ہوئے معنی کو تلاش کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے اور اس کے لئے یہ بات قطعی غیر ممکن ہے اس لئے کہ چیزوں اور ان کے ناموں کی حیثیت میں جو نفسیاتی اور علمی فرق ہے، اس کا سمجھنا یا اس کا تصور کرنا بچے کے لئے بے حساب دشوار ہے۔ کتاب اور لفظ "کتاب" میں جو باریک علمی فرق ہے، بچہ اس سے قطعی واقف نہیں ہوتا۔ وہ تو اس ٹھوس مادی چیز کو جانتا ہے جسے ہم کتاب کہتے ہیں قواعد اسے کتاب نہیں لفظ "کتاب" کے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہے۔ یہ چیز اس کی فطرت پر ایک بوجھ ہوتی ہے اور وہ معصوم حیرت اور کبھی کبھی گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ قواعد ایک دوسری حیثیت سے بھی بچوں کے لئے غیر فطری ہے۔ قواعد بچے کو زبان سکھانا چاہتی ہے اور بچے کے دماغ کے لئے زبان کا سمجھنا، قواعد کے سمجھنے سے زیادہ آسان ہے اس لئے وہ بجائے مشکل چیز کو آسان بنانے کے آسان چیز کو مشکل بنا دیتی ہے۔

قواعد کے خلاف اب تک ہم نے جو کچھ کہا اس سے قدرتی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قواعد کا پڑھانا بالکل بے کار چیز ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں یہ اور بات ہے کہ قواعد میں اتنے فائدے نہ ہوں جتنے اس سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں بہت سے فائدے بھی ہیں۔

(۱) قواعد ہمیں بولنا یا صحیح بولنا نہیں سکھاتی لیکن قواعد کے علم کے بعد ہم کہی ہوئی بات کی صحت یا غلطی کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے ہمیں لکھنا نہیں آسکتا۔ لیکن لکھتے وقت اگر شبہ ہو

تو اسے یقین سے بدلنے کے لئے ہمیں اپنی قواعد دانی سے مدد ملتی ہے کسی غیر ملکی شخص کو زبان کے ابتدائی اصول سمجھانے کے لئے بھی ہمیں قواعد کا دست نگر ہونا پڑتا ہے اس لئے اس کا سیکھنا ناگزیر ہے مگر قدیم تعلیم اور جدید تعلیم کے نقطۂ نظر میں فرق ہونا چاہیئے قواعد سکھی جائے لیکن اس لئے نہیں کہ اس کی مدد سے ہمیں زبان آجائے گی یا اس سے ہم لکھنا سیکھ جائیں گے یا وہ ہمیں دوسروں کی تحریروں کو سمجھنے میں مدد دیگی ہمیں قواعد اس وقت سیکھنی چاہیئے جب ہم میں مسلسل سوچنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ ہم اپنے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہو جائیں اور اس وقت بھی قواعد کی اصطلاحیں سیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف دو باتوں کا احساس ضروری ہے :-

(۱) ایک تو یہ کہ قواعد اور جملوں کی ساخت میں کیا تعلق ہے ۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان جملوں میں مختلف لفظوں کا کام کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ قواعد میں بچوں کو صرف ایسے اصول سکھانے کی ضرورت ہے جو عام طور پر سب زبانوں میں یکساں ہیں اور جن کے جانے بغیر لفظوں کی قدر و قیمت کا اندازہ مشکل ہے ۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ لفظوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا کرنے اور ان کی لسانی قدروں سے واقف ہونے میں قواعد کی بعض چیزوں سے جتنی مدد ملتی ہے کسی اور چیز سے نہیں ملتی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قواعد کو ایک الگ مضمون سمجھ کر پڑھایا جائے ۔ طالب علموں پر اس کی پابندی بھی نہ ہو کہ وہ مختلف اصطلاحوں کی تعریفیں ازبر کریں ۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انہیں قواعد کی صرف ان چیزوں سے روشناس کرایا جائے جن سے واقعی کلام کے سمجھنے اور واضح کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ مدد انشا سے لی جا سکتی ہے ۔ قواعد کی ساری تعلیم میرے نزدیک انشا کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے اور اس میں بھی صرف تھوڑی بہت گنی چنی باتوں کے علاوہ استاد کو قواعد کی تفصیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ۔ بالکل ابتدائی درجوں میں ۔ یعنی تیسرے اور چوتھے درجے میں، حتی الامکان ہر طرح کی گرامر سے بچنا چاہیئے ۔

پانچویں، چھٹے درجے میں بھی فعل، اسم اور صفت کی جملے میں کیا حیثیت ہے اور صفت اور اسم میں کتنا گہرا تعلق ہے، استاد اگر صرف ان چیزوں کو پیش نظر رکھے تو فعل، اسم اور صفت کی تعلیم طلبہ کے لئے بے حد مفید ہو سکتی ہے ۔ استاد کے سلیقے پر منحصر ہے کہ وہ انہیں ابتدائی چیزوں کی مدد سے جملے میں لفظوں کی صحیح ترتیب اور ان کی معنوی حیثیت طلبہ پر واضح کر دے ۔ طلبہ کو فعل، اسم اور صفت کی

تعلیم اس طرح دینی چاہیئے کہ وہ ان کی تعریفیں رٹنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ جملے میں ان کا جو کچھ کام ہے اس سے واقف ہوں۔ یہ کام کئی طرح کی مشقوں کے ذریعے کرایا جاسکتا ہے۔

(۱) جملوں میں فعلوں، اسموں اور صفات کی خالی جگہیں چھوڑ کر طلبہ سے انہیں بھروا جا سکتا ہے۔

(۲) جملوں میں مذکر فعل دے کر انہیں مونث میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے۔

(۳) جملے میں فعل کو واحد سے جمع اور جمع سے واحد بنا کر، جملے کے باقی حصوں کو ان کے مطابق بنانے کی مشقیں کرائی جاسکتی ہیں۔

(۴) اس مقصد کے لئے آسان شعروں کی نثر کرانے کی مشقیں سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔

(۵) طلبہ میں اسم، فعل اور صفت کے صحیح سیاق وسباق کا احساس ان مشقوں سے زیادہ اور کسی طرح کی مشقوں سے نہیں ہوتا۔ پانچویں، چھٹے درجے کے بعد بھی یہ مشقیں جاری رکھی جاسکتی ہیں خاص کر شعروں کی نثر سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے اور انہی مشقوں کے ساتھ ایک چیز کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اسم فعل اور صفت کے بعد جملے میں حرف جار کی جو اہمیت ہے طلبہ میں رفتہ رفتہ اس کا احساس پیدا کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۶) چھٹے اور ساتویں درجے میں اسم، فعل، صفت اور "حرف جار" کی

(۷) مشقوں کو جاری رکھنے کے علاوہ اگر کسی اور چیز کی مشق ضروری ہے تو صرف اسم فاعل اور اسم مفعول کی۔ میں نے اپنے تجربے سے یہ محسوس کیا ہے کہ قواعد کی کوئی چیز طلبہ میں لفظوں کی قدر وقیمت کا احساس اور لسانی ذوق پیدا کرنے میں اتنی مدد نہیں دیتی جتنی اسم فاعل اور اسم مفعول کی مشقیں۔ اگر استاد ذرا سی سوجھ بوجھ سے کام لے تو چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجے ہی سے طلبہ میں لفظی تحقیق کا شوق پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جتنی مشقیں درجوں میں کرائی ہیں ان سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ طلبہ اگر استاد کی ذرا سی مدد کے بعد اپنے ذہن سے کچھ لفظوں کے معنی معلوم کر سکیں تو انہیں ایسی ہی مسرت ہوتی ہے جیسے کوئی بہت بڑی دولت پاکر۔ مثلاً "کتاب پڑھاتے وقت یا کسی اور سلسلے میں "قاتل" کا لفظ آیا استاد اگر طلبہ کو بتائے کہ یہ لفظ قتل سے بنا ہے اور قواعد میں اسے اسم فاعل کہتے ہیں اور اسی طرح

مقتول کو اسم مفعول کہتے ہیں تو چاہے لڑکے اس بات میں زیادہ لطف نہ لیں، لیکن جب اس طرح کے بہت سے لفظ جن سے وہ واقف ہیں ان کے سامنے دہرائے جائیں گے اور خود ان سے ان کے معنی اخذ کرائے جائیں گے تو انہیں یقیناً بے حد خوشی ہوگی۔ اسی مشق کو لیجئے، آپ نے تختۂ سیاہ پر تین لفظ قتل، قاتل اور مقتول اس طرح لکھ دیئے۔

فعل	اسم فاعل	اسم مفعول
قتل	قاتل	مقتول

اور پھر طلبہ کی مدد سے رفتہ رفتہ اس طرح کے اور لفظ اسی طرح لکھے مثلاً :-

علم	عالم	معلوم
حکم	حاکم	محکوم
فتح	فاتح	مفتوح
طلب	طالب	مطلوب
عقل	عاقل	معقول
عرف	عارف	معروف
حمد	حامد	محمود
قبض	قابض	مقبوض

اسی طرح کے سینکڑوں لفظ ہو سکتے ہیں جن سے طلبہ واقف ہیں۔ لیکن چونکہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ لفظ کیسے بنا اور کس لفظ سے بنا اس لئے وہ ان کے صحیح معنی نہیں سمجھتے اس مشق سے انکے ذہن میں ان سب لفظوں کے معنی واضح ہو جائیں گے جو اس شکل کے ہیں اور آئندہ وہ ایسے سب لفظوں کے معنی خود ہی نکال سکیں گے۔

نویں، دسویں درجے تک اسم فاعل اور اسم مفعول کی مشقوں کو اور بھی مشکل بنایا جا سکتا ہے۔ اور بجائے سیدھے سادے مفرد لفظوں کے، مرکب اسموں کی مدد سے ان مشقوں میں اور زیادہ تنوع اور وزن پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً طلبہ نے ایک لفظ سائنس داں پڑھا۔ استاد اس لفظ کے ٹکڑے کر کے اس کے معنی ان پر واضح کرے اور پھر ان کی مدد سے اس طرح " داں" پر ختم ہونے والے جتنے لفظ مل سکیں، ان میں اور اس لفظ میں معنوی یکسانیت دکھا کر طلبہ سے خود لفظوں کے معنے

نکلوائے ۔ انگریزی داں، ہیئت داں اور سخن داں وغیرہ لفظ، ذرا سے سوچنے کے بعد طلبہ کے ذہن میں خود آسکتے ہیں ۔ اسی طرح کارکن، نظر فریب، ہوش ربا، خندہ زن وغیرہ لفظوں کے ٹکڑے کرکے اور ان کے معنی سمجھا کر ایسے ہی بہت سے لفظ، طلبہ کے لفظی ذخیرے میں داخل کئے جاسکتے ہیں ۔ اسم فاعل اور اسم مفعول کی مشقوں میں کبھی فرسودگی نہیں پیدا ہوتی اور اچھے استاد کو کبھی یہ شکایت پیدا ہونے کی گنجائش نہیں کہ اس طرح کی اچھی مشقوں کے لئے لفظوں کا خزانہ ختم ہو گیا ۔

اسم فاعل اور اسم مفعول کی مشقوں کے ساتھ یا اس قسم کی تھوڑی سی مشقیں ختم کر لینے کے بعد طلبہ کو اضافت کے مفہوم سے آشنا کرنا چاہئے اردو اور فارسی کی اضافتوں کا فرق سمجھا کر مختلف مثالوں سے یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اضافتوں کی وجہ سے کس طرح لفظوں کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور کس طرح الف، واؤ، اور "ی" پر ختم ہونے والے لفظوں میں جب اضافت لگائی جاتی ہے تو اس کے بعد "ے" کا لگانا ضروری ہوتا ہے ۔ لیکن ادبی حیثیت سے اضافتوں پر بہت زور دینا چاہئے ۔ اضافت توصیفی اور اضافت تشبیہی ۔ اچھے ادیبوں کی نثر میں اور اکثر شعروں میں ان دو طرح کی اضافتوں سے جو ادبی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی طرف مسلسل اشاروں سے طلبہ پر یہ بات واضح کر دینی چاہئے کہ ادب میں ان دو اضافتوں کی بے حد اہمیت ہے اور کلام میں ایجاز، معنی کی وسعت اور تصور آفرینی پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے ۔ خیمۂ فلک دریائے نور، بزم ہستی، گوئے سبقت، صبح درخشاں، آفتاب عالم تاب جیسی ترکیبیں کتاب پڑھتے وقت کثرت سے عبارتوں اور شعروں میں ملیں گی ۔ استاد آسانی سے طلبہ کے سبق میں آنے والی ایسی ترکیبوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

ان چیزوں کے علاوہ قواعد میں بہت کم چیزیں ہیں جو زبان ادب کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت رکھتی ہوں ۔ اس لئے استاد کو ان چیزوں کے علاوہ قواعد کی اور باتوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔

الفاظ کے معنی کیسے بتائیں؟

زبان کی تدریس کا اہم اور بنیادی مقصد، تحریر و تقریر کے ذریعے 'اظہار خیال پر قدرت حاصل کرنا ہے یہ اظہار جس قدر مربوط، واضح، بھرپور اور خوب صورت ہوگا اسی قدر کسی بچے کو زبان کا اچھا طالب علم سمجھا جائیگا اظہار خیال پر قدرت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بچے کے ذہن میں اُس کی معلومات و خیالات کی وسعت کے مطابق الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو۔ یہاں ذخیرۂ الفاظ کی موجودگی سے یہ مراد نہیں کہ طالب علم نے کسی لغت یا کسی نصابی کتاب کے آخر میں دی ہوئی فرہنگ سے الفاظ کے معنی رٹ لئے ہوں بلکہ یہ مفہوم ہے کہ اُس کے حافظے میں الفاظ کا جو ذخیرہ موجود ہو، وہ روزمرہ کی تحریر و تقریر میں اسے صحیح طور پر استعمال کرنے پر دسترس بھی رکھتا ہو۔ لیکن عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے الفاظ و معنی کا وافر ذخیرہ رکھنے کے باوجود، اظہار خیال پر خاطر خواہ قدرت نہیں رکھتے نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کی اعلیٰ منزلوں میں پہنچ کر اور بعض صورتوں میں تعلیم سے فارغ ہو کر بھی وہ اپنے مافی الضمیر کو صفائی اور اثر خیزی کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کمزوری کے اور بھی اسباب ہوں گے لیکن ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں اخذِ معنی کے سلسلے میں پوری توجہ صرف نہیں کی جاتی، اُردو کے اکثر معلمین بچوں کو سرسری طور پر الفاظ کے مترادف معنی بتا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اخذ معنی کی طرف سے یہ بے اعتنائی یا یہ طریقۂ کار صرف یہی نہیں کہ زبان کی تدریس کے لئے غیر مفید و غیر دلچسپ ہے بلکہ آگے چل کر طلبہ و طالبات کے لئے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی طالب علم کو

۱۔ چشم

۲۔ گوش

۳۔ گُل

۴۔ شکم

۵۔ دندان

کے صرف مرادف الفاظ علی الترتیب آنکھ[1]، کان[2]، پھول[3]، پیٹ[4] اور دانت۔ بتا دیئے جائیں

تو یہ بات لغت و فرہنگ کے لحاظ سے درست ہوگی لیکن جب تک مختلف عبارتوں یا جملوں کے ذریعے ان کے استعمالات کا فرق ذہن نشین نہ کرایا جائے، اوپر بتائے ہوئے معنی، روزمرہ کی تحریر و تقریر میں مضحکہ خیز اور بے معنی ثابت ہوں گے۔ طلبہ و طالبات کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ جیسے ہی نئے الفاظ سیکھتے ہیں انہیں اپنی گفتگو یا تحریر میں استعمال کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی طالب علم اوپر دیئے ہوئے مرادف الفاظ کی مدد سے چشم[۱]، گوش[۲]، گل[۳]، شکم[۴] اور دنداں[۵] کو استعمال کرے گا تو امکان یہ ہے کہ وہ اس قسم کے جملے بنائے گا۔

۱۔ میری چشم[۱] میں کل رات سے درد ہے۔

۲۔ مولوی صاحب نے بے سبب کل میرے گوش[۲] کھینچ دیئے۔

۳۔ بچوں نے سارے گل[۳] مسل کر پھینک دیئے۔

۴۔ کھانا کھاتے ہی اس کے شکم[۴] میں درد شروع ہوگیا۔

۵۔ میرے دندان[۵] میں ٹھنڈا پانی لگتا ہے۔

یہ پانچوں جملے قواعد کی رو سے بالکل درست ہیں، فاعل، مفعول، فعل اور ان کے متعلقات سب اپنی اپنی جگہ آئے ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جملے نحوی اعتبار سے غلط ہیں۔ اس کے باوجود یہ جملے جس قدر مضحکہ خیز اور بے معنی ہیں، اس کی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے بعض معلمین زبان کا خاص ذوق یا تدریس کا طویل تجربہ رکھنے کی وجہ سے اس قسم کے جملوں کو درست تو کر دیتے ہیں لیکن طالب علم کو عموماً یہ نکتہ نہیں بتایا جاتا کہ اُن کے استعمال میں کیا خرابی یا غلطی ہے۔ نتیجتہً، طلبہ عمر بھر الفاظ کے استعمال میں اسی قسم کی مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں، حالانکہ اگر مرادف الفاظ کے ساتھ ساتھ تدریس کے دوران میں اس قسم کی مثالوں سے

۱۔ نورِ چشم ، چشم و چراغ

۲۔ گوشِ دل ، ہوش و گوش

۳۔ رنگِ گل ، گل و بلبل

۴۔ دردِ شکم ، پشت و شکم

۵۔ دندان شکن ، لب و دنداں

یہ بھی واضح کردیا جاتا کہ اُردو میں یہ الفاظ یا فارسی عربی کے بعض دوسرے الفاظ، تنہا نہیں بلکہ کسی دوسرے عربی فارسی لفظ سے مرکب کرکے استعمال کئے جاتے ہیں تو طلبہ ہمیشہ کے لئے اُن کے مضحکہ خیز استعمالات سے بچ جاتے اور آئندہ کے لئے اُن کی زباندانی کی بنیاد بھی پختہ ہو جاتی۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح کرنی تھی کہ محض مترادف بتا دینے سے الفاظ کی تفہیم کا مسئلہ حل نہیں ہوتا الفاظ کے معانی اور ان کے لطیف و نازک فرق کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے اکثر صورتوں میں مثالی جملوں یا عبارتوں سے مدد لینا ضروری ہے۔

مترادف الفاظ کے سلسلے میں دوسری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جن لفظوں کو ہم ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہیں وہ عام طور پر کلیتہً مرادف نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے معنی ایک جیسے نہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب انہیں جملوں میں استعمال کرکے دیکھا جاتا ہے تو ان کے معنی کا لطیف و نازک فرق نمایاں ہونے لگتا ہے گویا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا　(غالب)

صاحب کیفیہ نے الفاظ کی اس پُرفریبی کو بڑی خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے۔ ذیل کے یہ چند الفاظ دیکھئے —

(۱) اُنس　(۲) الفت　(۳) محبت　(۴) عشق

بظاہر ہم معنی ہیں لیکن ذیل کے جملوں سے اندازہ ہوگا کہ ان کے استعمال کے مقامات الگ الگ ہیں، اس لئے اگر انہیں آپس میں بدلا گیا تو صرف یہی نہیں کہ بعض جملے بے معنی ہو جائیں گے بلکہ وہ مضحکہ خیزی کا سبب بھی بنیں گے۔

۱۔ نئے استاد کو اپنے شاگردوں سے جلدی اُنس ہو گیا۔

۲۔ بھائیوں میں ابھی تک تو وہی الفت ہے۔

۳۔ ماں کی محبت کا جواب نہیں۔

۴۔ اسے اپنی بیوی سے عشق ہے۔

اوپر کی مثالیں عربی و فارسی الفاظ کی ہیں اس لئے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ یہ صورتِ حال صرف انہیں تک محدود ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ذیل کے چند الفاظ دیکھئے۔ یہ ٹھیٹ اُردو کے ہیں اور

علاقائی زبانوں سے اُردو میں آئے ہیں۔

(۱) دُبدا (۲) جھجک (۳) سانسا (۴) کھٹکا (۵) دھڑکا (۶) سہم (۷) ڈر

اب ان کے استعمال کی صورتوں پر غور فرمائیے، مرادف ہونے کے باوصف ذیل کے جملوں میں انہیں ایک دوسرے سے بدلا نہیں جا سکتا۔

(۱) آپ پوچھتے ہیں کہ میں لاہور کیوں نہیں جاتا۔ میں اس دُبدا میں ہوں کہ ادھر سے میں چل پڑا اُدھر سے وہ روانہ ہو گئے تو۔

(۲) پہلی دفعہ عام جلسے میں بولنے کا موقع ہوا تھا اس وجہ سے شروع شروع میں جھجک رہی

(۳) حصے تو خرید سکتا ہوں مگر مجھے سانسا اس بات کا ہے کہ یہی دو ہزار میری کل پونجی ہے، کل کو حصوں کی قیمت گر گئی اور روپے کی دوّنی رہ گئی تو میں کیا کروں گا۔

(۴) نو خرید مکان کی مرمت اس لئے نہیں کرایا کہ مجھے شفعہ کا کھٹکا لگا ہوا ہے، میعاد گذر جائے تو مکان میں اپنے ڈھب کا ردّ و بدل کروں۔

(۵) مشاعرہ تو میں اپنے ہاں کر لوں لیکن دھڑکا حضرت بلغول الشعراء کا ہے، انہیں خبر ہوئے بن رہے گی کہ نہیں اور وہ مع اپنے جزدان کے آموجود ہوں گے تو میں انہیں نکلوا سکوں گا نہیں

(۶) لڑکے نے امرود کی ٹہنی جھکائی ہی تھی کہ سامنے سے ماسٹر صاحب آگئے بے چارہ سہم کر گھگھیانے لگا۔

(۷) تمہیں کس کا ڈر پڑا ہے انتخاب کے لئے کھڑے ہو، میں اور میرا جتھا تمہارے ساتھ ہے۔

اوپر دی ہوئی مثالوں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اخذ معانی کے سلسلے میں بچوں کو صرف مرادف یا مترادف الفاظ بتا دینے سے کام نہیں چلتا۔ ہر لفظ کسی دوسرے کا مرادف یا مترادف ہونے کے باوصف، اپنی الگ معنوی حیثیت اور تاثیر رکھتا ہے۔ اس کی اس حیثیت اور تاثیر کو طلبہ پر اُجاگر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اخذ معنی کے سلسلے میں مشاہدہ، مثال، مرادف، مترادف اور جملہ سازی میں سے جس قسم کے وسیلے سے مفید تر نتیجہ نکل سکتا ہو اس سے مدد لی جائے یہی نہیں اس قسم کے وسیلوں پر برابر غور کیا جائے اور الفاظ کی تفہیم میں اُنہیں برتا جائے جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا زبان کی تدریس

کا حق ادا نہیں ہوگا۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے طلبہ کو زبان کی تدریس کے دوران میں جس قسم کے الفاظ کے معنی بتانے کی اکثر ضرورت ہوتی ہے، وہ عموماً مندرجہ ذیل گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) مفرد الفاظ مثلاً ابر، بخت، کثرت، قوم اور قائد وغیرہ

(۲) مرکب الفاظ مثلاً اقبال مند، کند ذہن، بے باک، گل فروش اور صفدر وغیرہ

(۳) محاورات مثلاً آنکھ ملانا، آنکھ چرانا، آنکھ دکھانا، آنکھیں چار کرنا اور آنکھیں لڑنا وغیرہ

(۴) روزمرہ مثلاً آئے دن، روز روز، بلا ناغہ، زحق، در بے وقوف وغیرہ

(۵) ضرب الامثال مثلاً ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، اور دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا وغیرہ

(۶) تلمیحات مثلاً ید بیضا، چراغ طور، نار نمرود وغیرہ

پہلی قسم کے الفاظ مفرد ہیں اور طلبہ کو زیادہ تر انہیں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن کہ ایک طریقے سے نہیں بلکہ مختلف طریقوں سے بتائے جائیں اسی وقت طلبہ کے لئے مفید مطلب ہوں گے جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ان الفاظ کے معنی بتانے کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بعض الفاظ مثلاً شکل، بخت اور نور وغیرہ کے معنی اُن کے مرادف الفاظ یعنی صورت، قسمت اور روشنی کے ذریعے بتائے جا سکتے ہیں لیکن مناسب اور مفید یہ ہوگا کہ جملوں کے ذریعے بھی ان کی وضاحت کر دی جائے۔

۲۔ بعض الفاظ مثلاً قوم، مذہب اور اُمّت وغیرہ کے معنی، نہ تو مرادف الفاظ کی مدد سے سمجھائے جا سکتے ہیں، نہ ان کی تفہیم میں، مشاہدہ، مثال، ماڈل اور تصویریں زیادہ کام دے سکتی ہیں ان کے اخذ معانی کا مناسب طریقہ، جملہ سازی ہے، پہلے مثالی جملے پیش کئے جائیں، بعد ازاں طلبہ سے جملے بنوائے جائیں۔ کبھی کبھی نامکمل جملے دیکر، خالی جگہوں کو ان الفاظ کی مدد سے پُر کرایا جائے اور اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرکے اُن کے معنی کا انہیں احساس دلایا جائے یقین ہے کہ کچھ دنوں بعد وہ ان الفاظ کی تہ تک خود بخود پہونچ جائیں گے۔

۳۔ بعض مفرد الفاظ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر اُن میں زیر، زبر، پیش کی معمولی تبدیلی کردی جائے تو اُن کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں مثلاً "ملک" کے لفظ کو لے لیجئے اُردو میں اس کی حسب ذیل چار صورتیں مستعمل ہیں۔

۱۔ مَلِک بمعنی حاکم، جمع مُلوک۔

۲۔ مِلک بمعنی جائداد جمع املاک

۳۔ مَلَک بمعنی فرشتہ جمع ملائک

۴۔ مُلک بمعنی مملکت جمع ممالک

اس قسم کے الفاظ میں سے جب کسی لفظ کے معنی بتانے مقصود ہوں تو بہتر یہ ہوگا کہ اس کے معنی میں اعراب کی تبدیلیوں میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے اسے بھی واضح کر دیا جائے تاکہ طلبہ انکے استعمال اور مفہوم میں دھوکا نہ کھائیں۔

۴۔ بعض مفرد الفاظ ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً شاہین، خوبانی، گیدڑ، گلاب اور کرم کلا اُن میں پہلے لفظ کا تعلق پرندوں سے دوسرے کا "پھلوں" سے تیسرے کا "جانوروں" سے، چوتھے کا "پھولوں" سے اور پانچویں کا "ترکاری" سے ہے، چنانچہ ان الفاظ کے معنی بتانے مقصود ہوں تو ہمارے یہاں اس طور پر بتائے جاتے ہیں۔

۱۔ شاہین ایک قسم کا پرندہ ہے۔

۲۔ خوبانی ایک قسم کا پھل ہے۔

۳۔ گیدڑ ایک طرح کا جانور ہے۔

۴۔ گلاب ایک طرح کا پھول ہے۔

۵۔ کرم کلا ایک قسم کی ترکاری ہے۔

یہ طریقۂ کار نامناسب اور غیر مفید ہے، ان الفاظ کے معنی جملوں میں استعمال کے ذریعے بتائے ہی نہیں جا سکتے۔ جب تک کوئی شخص کسی خاص لفظ کی مدد سے اس چیز کی شناخت نہ کر سکے، جس کے لئے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ استعمال کرنے والا، اس لفظ کے معنی نہیں سمجھتا اوپر کے جملوں کی یہی کیفیت ہے ان کی مدد سے معنی کا صحیح تصور دلانا ممکن ہی نہیں ہے اس قسم کے الفاظ کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اصل چیزیں طلبہ کے مشاہدے میں لائی جائیں اگر یہ ممکن نہ ہو

تو ان چیزوں کے ماڈل یا تصاویر بنا کر دکھائی جائیں ۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم ہر لفظ کے معنی کے سلسلے میں اس چیز کی ظاہری و معنوی خصوصیات اتنی وضاحت سے بتائی جائیں کہ بچے کا ذہن کسی نہ کسی حد تک لفظ کے اصل معنی تک پہونچ جائے اور وہ اسے ذہن میں محفوظ رکھ سکے

۵ ۔ بعض مفرد الفاظ خصوصاً مصدر اور حاصل مصدر کے معنی ، نہ تو مرادف الفاظ کے ذریعے واضح کئے جا سکتے ہیں نہ ان کی وضاحت میں ماڈل یا تصویریں کچھ زیادہ معاون ہو سکتی ہیں ، ان کی تفہیم میں مشاہدہ تجربہ ، اور عمل سے کام لینا ضروری ہے ، مثلاً ٹہلنا اور دوڑنا یا مسکراہٹ اور قہقہہ کے معانی ، جملوں یا تصویروں کی بجائے ، حرکات و سکنات کے ذریعے زیادہ آسانی سے ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں ۔

۶ ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ انہیں مفرد استعمال کرنے سے جو معنی پیدا ہوتے ہیں وہ مرکب کی صورت میں بدل جاتے ہیں ۔ مثلاً غریب کے لفظ پر غور کیجئے یہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے اور مفرد استعمال کی صورت میں اپنے اصل معنی کو کھو بیٹھا ہے ۔ چنانچہ اس کو تنہا استعمال کریں گے تو اس کے معنی اجنبی کی بجائے " نادار " (POOR) کے ہوں گے لیکن جب اسے کہیں دوسرے لفظ کے ساتھ " غریب الدیار " یا " غریب الوطن " کی صورت میں استعمال کریں گے تو اس کے اصلی معنی ہی لئے جائیں گے اردو کے معلم کو حسب ضرورت اس قسم کے معنوی فرق کو جملوں کے ذریعے طلبہ پر واضح کر دینا چاہئے ۔

۷ ۔ بعض مفرد الفاظ جن کا تعلق عموماً اسم کیفیات سے ہوتا ہے بظاہر ایک دوسرے کے مرادف یا مترادف نظر آتے ہیں لیکن ہر جگہ ان کا استعمال مناسب نہ ہوگا ۔ مثلاً ذیل کے الفاظ پر نظر ڈالئے ۔

(۱) آب (۲) دمک (۳) ڈلک (۴) چمک ،

ہم معنی ہونے کے باوجود مخصوص الفاظ کے ساتھ جملوں میں استعمال کئے جائیں گے ۔ " آب " کو پانی یا تلوار کے ساتھ ، " دمک " کو کندن اور پیشانی کے ساتھ " ڈلک " کو ہیرے کے ساتھ اور " چمک " کو چاند یا ستاروں کے ساتھ استعمال کرنا ہی درست اور فصیح ہوگا ۔ اس کے برعکس عمل کیا جائے گا تو بلحاظ قواعد ، عبارت درست ہوگی ، لیکن روزمرہ اور فصاحت کے لحاظ سے بعض جگہ ان الفاظ کا استعمال غلط اور بعض جگہ بھونڈا ہو جائے گا ۔

یہی حال ہے بھبک ، لپٹ ، اور مہک کا ہے بھبک کا استعمال بو کے ساتھ لپٹ کا عطر کے ساتھ اور مہک کا پھولوں کے ساتھ مناسب اور فصیح ہو جائے گا ۔

۸ ۔ بعض مفرد الفاظ، ایک ہی جنس یا ایک ہی قسم کی بہت سی چیزوں کے ناموں پر حاوی ہوتے ہیں ۔ مثلاً پھل، ترکاری اور اوزار وغیرہ ۔ اس قسم کے الفاظ کی تفہیم کے لئے مناسب یہ ہوگا کہ اس جنس کی مختلف چیزیں جمع کر کے اک ساتھ دکھائی جائیں یا اُن کے ماڈل اور تصویریں دکھائی جائیں مثلاً " پھل " کے معنی سمجھانے کے لئے سیب، انار، انگور اور سنترہ وغیرہ دکھا کر بتایا جائے کہ یہ سب پھل کہلاتے ہیں ۔

۹ ۔ بعض مفرد الفاظ کے مرادف بتانے کے بجائے اگر اسی معنی کے دوسرے الفاظ کا استعمال کیا جائے اور جملہ سازی کے ذریعے اُن کی مشق کرا دی جائے تو الفاظ کے معنی آسانی سے واضح ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً ظلم، لطف اور عافیت وغیرہ کے معنی ذہن نشین کرانے کے لئے اس قسم کے جملے زیادہ کارآمد ہو سکتے ہیں ۔

(۱) رعایا پر ظلم و ستم کرنے والا حاکم ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے میں امتحان میں کامیاب ہو گیا ۔

(۳) والد صاحب کی خیر و عافیت دو ہفتے سے نہیں معلوم ہوئی ۔

۱۰ ۔ بعض مفرد الفاظ کے معنی بظاہر ایک ہی ہوتے ہیں لیکن مختلف چیزوں کے ساتھ جب اُن کا استعمال کیا جاتا ہے تو اُن کے معنی بعض موقعوں پر تضاد کی حد تک بدل جاتے ہیں، مثال کے طور پر ان جملوں میں

ﺍ ۔ یہ آدمی بہت چالاک ہے ۔

ب ۔ گھوڑا ایک چالاک جانور ہے ۔

لفظ چالاک کو لے لیجئے ۔ اس کا استعمال کسی آدمی کے ساتھ کیا جائے گا تو برائی کے معنی میں سمجھا جائے گا اور اگر گھوڑے کے لئے استعمال ہو تو خوبی کے معنی میں تصور کیا جائے گا ۔ بہتر یہ ہوگا کہ الفاظ کے استعمال کی ان مختلف النوع صورتوں کو طلبہ پر واضح کر دیا جائے ورنہ معنی جاننے کے باوجود وہ ان کے استعمال میں غلطی کریں گے ۔

۱۱ ۔ بعض مفرد الفاظ کا تعلق کسی قسم کی آواز سے ہوتا ہے مثلاً

ﺍ ۔ دھاڑنا، چنگھاڑنا، ہنہنانا، بھونکنا اور بلبلانا وغیرہ

ب ۔ گرج، ٹاپ، تھاپ، ٹن ٹن اور کھڑکھڑ وغیرہ

س - کائیں کائیں ، کڑکڑ ، بھن بھن ، چوں چوں اور چٹ چٹ وغیرہ

مشق کی الف کی آوازوں کا تعلق جانوروں سے ہے ، ب کا تعلق اشیاء سے ہے ، اور س کا تعلق پرندوں سے ہے — ظاہر ہے کہ ان آوازوں کی تفہیم مرادف الفاظ کے ذریعے نہیں کرائی جاسکتی ۔ اس لئے ہر جانور ، ہر شے اور ہر پرندے کے تعلق سے الگ الگ اس قسم کے جملے بنا کر دکھانے اور بنوانے ضروری ہونگے ۔

(الف) ۱ - شیر دھاڑتا ہے ۔
۲ - ہاتھی چنگھاڑتا ہے ۔
۳ - گھوڑا ہنہناتا ہے

(ب) ۱ - بادل کی گرج سے بعض بچے ڈر جاتے ہیں ۔
۲ - گھوڑے کی ٹاپ سن کر سپاہی چوکنے ہو گئے ۔
۳ - طبلے کی تھاپ سنتے ہی سونے والے جاگ اُٹھے ۔

(س) ۱ - کوّوں کی کائیں کائیں بعض وقت بڑی ناگوار گذرتی ہے ۔
۲ - مرغیاں ہر وقت کڑکڑ کرتی رہتی ہیں ۔
۳ - مکھیوں کی بھن بھن سے بڑی الجھن محسوس ہوتی ہے ۔

لیکن اس قسم کے جملوں پر کلیتہً بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے ، یہ الفاظ ایسے ہیں کہ اپنی تفہیم کے لئے مشاہدے اور تجربے کا عمل چاہتے ہیں ۔ چنانچہ ان میں سے جو آوازیں طلبہ کے مشاہدے یا تجربے میں آچکی ہیں ، اُن کے مفہوم تک وہ پہونچ جائیں گے ۔ لیکن جن آوازوں سے انہیں کبھی واسطہ نہیں رہا محض جملہ سازی کے ذریعے اُن کی رسائی اصل معنیٰ تک نہیں ہوسکتی ۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ مختلف قسم کے جانوروں ، پرندوں اور اشیاء کی آوازوں کا صحیح تصور لانے کے لئے طلبہ کو اُن کی آوازیں سنوانے کے مواقع فراہم کئے جائیں ۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ۔ بندر اور سانپ کا تماشا دکھانے والوں کی طرح بعض لوگ مختلف قسم کے جانوروں اور پرندوں کی آوازیں نکالنے میں بھی خاص مہارت رکھتے ہیں اور آوازوں کا تماشا دکھا کر روزی کماتے ہیں ۔ اگر اس قسم کے تماشا دکھانے والوں کو کبھی کبھی مدرسے میں بلایا جائے تو طلبہ کے لئے دلچسپ تعلیمی مشغلہ مہیا ہو جائے گا اور طلبہ

اس قسم کی آوازوں سے بہت جلد آشنا ہو جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طلبہ کو کبھی کبھی اس قسم کے چڑیا گھروں کی سیر کرائی جائے جس میں مختلف قسم کے پرندوں اور جانوروں کی آوازیں سننے کا انہیں موقع مل سکے۔

۱۲۔ کچھ مفرد الفاظ، جو اسم جمع کے طور پر بولے جاتے ہیں بظاہر ہم معنی ہوتے ہیں اور اردو کے معلمین اُن کے مرادف بتا کر آگے بڑھ جاتے ہیں، یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اسم جمع کے بہت سے الفاظ بظاہر ہم معنی یا مرادف ہونے کے باوجود اپنے استعمال میں مخصوص ہیں اور اُنہیں کسی اور جگہ استعمال کرنا غلطی ہوگی۔ مثلاً یہ الفاظ۔

(۱) جماعت (۲) حلقہ (۳) بھیڑ (۴) دستہ (۵) دَل (۶) ٹولی

ان کے معنی سمجھانے کے لئے حسب ذیل انداز کے جملے بنا کر دکھانے اور طلبہ سے بنوانے ضروری ہیں۔

۱۔ طلبہ کی ایک جماعت لاہور سے کراچی آئی ہوئی ہے۔

۲۔ شاہ صاحب کے مریدوں کا حلقہ بہت بڑا ہے۔

۳۔ میلے میں اتنی بھیڑ تھی کہ نکلنا مشکل تھا۔

۴۔ پاکستانی سواروں کا دستہ آگے بڑھا تو دشمن کے سپاہی بھاگ نکلے۔

۵۔ ٹڈی دل سے اس سال فصلوں کو بہت نقصان پہونچا ہے۔

۶۔ بدمعاشوں کی ٹولی نے سارے محلے کو پریشان کر رکھا ہے۔

۱۳۔ بعض الفاظ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُن کی تفہیم کے وقت اسی قبیل کے دوسرے الفاظ بھی بتا دیئے جائیں تو درس سے طلبہ کی دلچسپی بھی بڑھ جائے گی اور اُن کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مثلاً جس وقت طلبہ کو یہ بات بتائی جائے کہ بکری کے بچے کو "میمنا" کہتے ہیں۔ اسی وقت بعض دوسرے جانوروں اور پرندوں کے بچوں کے ناموں کی نشاندہی بھی ضمناً شامل کرلی جائے اور مثالاً واضح کر دیا جائے کہ کتے کے بچے کو پلاّ، مرغی کے بچے کو چوزہ اور ہرن کے بچے کو چکارا کہتے ہیں۔

۱۴۔ بعض مفرد الفاظ کئی کئی معنی رکھتے ہیں اور مختلف موقعوں پر مختلف معنوں میں

استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً چاک اور حق وغیرہ ۔ اس قسم کے الفاظ کے معنی کی تفہیم کیلئے ضروری ہے کہ ان کے جتنے معنی ممکن ہو سکتے ہیں جملوں کے ذریعے حسب ذیل طریقے سے سب واضح کر دیئے جائیں ۔

الف ۔

(۱) کمہار اپنے چاک پر برتن بنا رہا ہے ۔
(۲) کانٹے سے الجھ کر اس کا دامن چاک چاک ہو گیا ۔
(۳) تختہ سیاہ پر سفید چاک سے لکھنا بہتر ہے ۔

ب ۔

(۱) حق بات کہنے میں کبھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے ۔
(۲) باپ کی جائداد میں سارے بیٹے بیٹیوں کا حق ہوتا ہے ۔
(۳) دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔

اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے الفاظ جب دوسرے معنوں میں کسی اور جگہ آئیں گے تو معلم کو دوبارہ اُن کے تفہیم کی زحمت نہ اُٹھانی پڑے گی ۔ دوسرے یہ کہ اس طریقہ کار سے طلبا اپنے اندر ایک قسم کا تجسس ، حیرت اور خوشی کی لہر محسوس کریں گے اور یہی لہر ایک دن ان میں زبان اور زبان کے مسائل سے گہری دلچسپی پیدا کر دے گی ۔

۱۵ ۔ بعض مفرد الفاظ کے معنی ذہن نشین کرانے میں مرادف سے زیادہ اُن کے متضاد الفاظ معاون ہو سکتے ہیں مثلاً عالم کے معنی جاہل کی مدد سے اور تیرگی کے معنی ، روشنی کی مدد سے واضح کئے جا سکتے ہیں ۔

۱۶ ۔ بعض مفرد الفاظ مثلاً دست ، دندان ، اور گوش وغیرہ کی تفہیم میں صرف مرادف الفاظ بتا دینے سے کام نہیں چلے گا ، جیسا کہ ابتدائی سطور میں واضح کیا گیا ہے کہ اُن کے استعمال کی مناسب مشق نہ کرائی گئی تو ، طلبہ اپنی تحریر یا تقریر میں ان الفاظ کا صحیح مصرف نہ کر سکیں گے ان کے مرادف علی الترتیب ، ہاتھ ، دانت اور کان ضرور بتائے جائیں ۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور بتایا جائے کہ یہ الفاظ اور اس طرح کے بعض دوسرے الفاظ تنہا نہیں بلکہ عموماً عربی فارسی کے کسی دوسرے لفظ سے مرکب کر کے استعمال کئے جاتے ہیں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے ۔

ا - آج کل میں بے دست و پا ہوں۔

ب - حامد نے محمود کو دنداں شکن جواب دیا۔

س - بڑوں کی بات گوشِ دل سے سُنو اور عمل کرو۔

اس قسم کے الفاظ کا تعلق اگر ثانوی مدرسوں کے بڑی جماعتوں کے نصاب سے ہو تو مناسب یہ ہوگا کہ جملہ سازی کے ساتھ ساتھ انہیں کی کتابوں سے یا کہیں اور سے ان الفاظ کے سلسلے میں ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے مثالی جملے، مصرعے یا اشعار بھی پیش کر دیئے جائیں تاکہ ان میں زبان و ادب کے مطالعے کا شوق تیز تر ہو جائے۔ مثلاً نویں دسویں جماعت کے طلبا کو اوپر دیئے ہوئے الفاظ کے متعلق یہ مصرعے سُنائے جا سکتے ہیں۔

ا - گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ (غالبؔ)

ب - کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا (غالبؔ)

س - میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے (غالبؔ)

۱۷ - اب تک جن الفاظ کے معنی سمجھانے کے طریقوں پر غور کیا گیا ہے ہر وہ اسم یا فعل سے تعلق رکھتے ہیں، اگر "حرف" اور اس کی اقسام کے تحت آنے والے الفاظ مثلاً پر - کو - سے - میں - لیکن - اِلّا - مگر - بلکہ - جُز - وغیرہ کے معنی سمجھانا مقصود ہو تو جملہ سازی کے سوا اور کوئی طریقہ کارمفید ثابت نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مفید ہوگا کہ متعدد نامکمل جملے لکھ دیئے جائیں اور طلبہ سے کہا جائے کہ وہ حروف کی مدد سے انہیں مکمل کریں اس قسم کی مشق سے وہ بہت جلد حروف کے استعمال پر قابو پا جائیں گے اس لئے کہ ہمارے یہاں روزمرہ کی تقریر و تحریر میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں اُن کی تعداد، اسم اور فعل یا صفت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

مفرد الفاظ کے معنی کی تفہیم کے سلسلے میں جو مفید صورتیں سمجھ میں آئی ہیں وہ اوپر درج کر دی گئی ہیں۔ اردو کے معلمین حسبِ ضرورت اُن سے مدد لے سکتے ہیں، لیکن تفہیم معنی کی یہ صورتیں، مسئلے کے حل میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ذہین، محنتی، لائق اور زبان سے گہری دلچسپی رکھنے والے استاد اس سلسلے میں نئی راہیں نکال سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے معلمین اپنی ذاتی اُپج معلومات اور تجربات و مشاہدات کی مدد سے اخذ معانی کے وسائل میں اضافہ کریں گے۔

مرکبات

مرکبات جمع ہے مرکب کی اور مرکب کے معنی ہیں ترکیب دیا ہوا۔ اس جگہ مرکب سے مراد ایسا لفظ ہے جس میں دو لفظ اس طرح مل گئے ہوں، یا ملا دیئے گئے ہوں کہ ان سے ایک ہی معنی لئے جاتے ہوں۔ اُردو میں استعمال ہونے والے مرکب الفاظ عموماً دو طرح کے ہیں۔

(الف) ایسے مرکب الفاظ جو دو مختلف مفرد لفظوں سے مل کر بنتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ ہم ان کے اجزاء کو انفرادی حیثیت سے بھی باآسانی شناخت کر سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ان مرکبات میں دو لفظ معنوی طور پر ایک ہو کر بھی ظاہر صورت میں الگ الگ رہتے ہیں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ دونوں الفاظ الگ الگ بامعنی ہوتے ہیں اور اُردو میں مفرد بھی استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان الفاظ کے درمیان قواعد یا گرامر کا کوئی واضح رشتہ نہیں ہوتا۔ بلکہ زبان کا صحیح ذوق، موقع محل کے لحاظ سے، ان میں ایک مخصوص رشتہ تلاش کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مرکبات کبھی اسم فاعل، کبھی اسم مفعول اور کبھی اسم صفت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اس قسم کے مرکبات میں جو دو لفظ شامل ہوتے ہیں، وہ ٹھیٹھ اُردو یا ہندی کے بھی ہو سکتے ہیں، عربی کے بھی ہو سکتے ہیں، فارسی اور ترکی کے بھی ہو سکتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے مخلوط بھی۔ اُردو میں ہر قسم کے دو لفظوں سے بنے ہوئے مرکبات مستعمل ہیں۔ ذیل کے الفاظ دیکھئے:

۱۔ اندھیر کھاتا۔ رام لیلا۔ جنم پترا۔ چڑی مار۔ نیبو نچوڑ۔ مکھی چوس۔ دیا سلائی۔ بھاگ دوڑ بھلے مانس۔ ان داتا۔ کرن پھول، راجپوت۔ راج ہٹ۔ سرچڑھا۔ منہ لگا۔ بن باسی۔ بن مانس۔ جوڑ توڑ۔ بھلا چنگا۔ چاند گرہن۔ چاند رات۔ گٹھ ہتھیا۔ نین سکھ۔ بیل گاڑی ہٹ دھرم۔ ٹھگ بدیا۔ آکاش بیل، وغیرہ صرف دو ہندی لفظوں کے ملاپ سے بنے ہیں۔

۲۔ برق رفتار۔ شہر بدر۔ تنگ دست۔ آہو چشم۔ بیدار مغز۔ مینا بازار۔ موم روغن۔ گل روغن سرخاب۔ تند خو، آب و ہوا۔ زبان دراز۔ گل دم۔ شہر پناہ۔ شادی مرگ۔ وغیرہ صرف دو، دو فارسی الفاظ سے مرکب ہیں۔

۳۔ عمر قید۔ بقرعید۔ جمعہ مسجد۔ عالی شان۔ عالی ظرف، صاحب ذوق، صاحب جمال، خیر مقدم۔ صاحب سلامت۔ عالی نسب۔ غریب صورت، کاہل وجود، وعدہ خلاف۔ قبول صورت

حاصل مصدر، صدر مقام، طفل تسلی۔ وغیرہ میں دونوں لفظ عربی زبان کے ہیں۔

۴۔ نیک چلن، گلاب جامن۔ گھڑسوار۔ تارگھر۔ جگت استاد۔ سبزی منڈی۔ چور دروازہ کوڑ مغز۔ تاڑی خانہ۔ منہ زور۔ موم پھلی۔ وغیرہ میں ایک لفظ ہندی کا ہے اور ایک فارسی کا۔

۵۔ امام باڑہ۔ بارہ وفات، بال صفا۔ عجائب گھر۔ جیب گھڑی۔ کفن چور۔ چور محل۔ عمر پٹہ عید ملن۔ موتی محل۔ موتی مسجد، وغیرہ۔ عربی اور ہندی الفاظ کے ملاپ سے وجود میں آئے ہیں۔

۶۔ فاقہ مست۔ گل عذار۔ کور باطن۔ تنک مزاج۔ تنگ نظر۔ پاک طینت۔ عالی خاندان۔ فراخ حوصلہ۔ سبز قدم۔ نازک خیال۔ نمک حرام۔ نمک حلال۔ زن مرید۔ نازک طبع درد شریک، فضول خرچ، شرما حضوری، غرض آشنا، دستخط، صاحب دل، حرام مغز۔ وغیرہ میں ایک لفظ عربی کا ہے دوسرا فارسی کا۔

۷۔ ریل گاڑی۔ جیل خانہ۔ اردو بازار۔ اردو محل۔ قورمہ پلاؤ۔ باورچی خانہ۔ قرق امین۔ مرغ پلاؤ۔ وغیرہ ایسے مرکبات ہیں۔ جن میں فارسی، عربی اور ہندی کے ساتھ ترکی اور انگریزی کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

مرکب کی جو تعریف و تشریح کی گئی ہے، یہ مثالیں عین اس کے مطابق ہیں۔ ان میں آپ کو عربی، فارسی اور ہندی ہر قسم کے الفاظ کے مخلوط و غیر مخلوط ایسے جوڑے مل جائیں گے جن میں دو مفرد لفظوں نے باہم مل کر جداگانہ لفظ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ہر لفظ مفرد بھی اردو میں مستعمل ہے۔ ان لفظوں کے درمیان کوئی اصولی رشتہ بھی نہیں، پھر بھی ہمارا ذوق، تجربہ، قیاس اور ماحول ہمیں ان کے درمیان ایک خاص قسم کے رشتے اور رشتے کے ساتھ خاص معنی کا احساس دلاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے معلمین، تدریس کے وقت ان کی بناوٹ کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول کرائیں اور الفاظ سازی کے اس دلچسپ طریقہ کار کا احساس دلائیں جس کے ذریعے طلبہ آگے چل کر اپنی ضرورت کے مطابق نئے الفاظ ڈھال سکیں یا جب اس انداز کے دوسرے الفاظ ان کے سامنے آئیں تو وہ ان کے معانی متعین کر سکیں۔ اوپر جو مرکب الفاظ دیئے گئے ہیں، وہ مفرد لفظوں کے معانی کے لحاظ سے مشکل نہیں ہیں۔ بیشتر طلبہ ان الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔ اس لئے معانی سے کہیں زیادہ

الفاظ کی بناوٹ اور الفاظ کا درمیانی رشتہ ان کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ ان کی بناوٹ اور رشتے کو سمجھ گئے تو ان کے استعمال میں غلطی نہ کریں گے۔

اس قسم کے مرکبات کے تحت بہت سے ایسے مرکبات بھی آتے ہیں جن میں دو کلمے یا دو لفظ پورے پورے نہیں آتے بلکہ ان میں سے کسی ایک لفظ میں کچھ کمی بیشی کر دی جاتی ہے مثلاً اس جملے کو دیکھئے۔

لڑکوں نے کتے کو مار مار کر ادھ مرا کر دیا

"ادھ مرا" بناوٹ کے لحاظ سے اسی طرح کا مرکب ہے، جس کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس میں دونوں جز دیا لفظ پورے پورے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک جزو "آدھا" کو "ادھ" کر لیا گیا ہے اخذ معنی کے وقت اگر طلبہ کی توجہ اس تبدیلی کی طرف مبذول کرائی جائے اور نامکمل جزو کو مکمل کرکے ان کے سامنے دونوں لفظ رکھ دیئے جائیں، تو انہیں ان کے معنی اور ان کی شناخت دونوں کو ذہن نشین کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔ اردو میں اس طرح کے مرکبات ایک دو نہیں، بہت سے ہیں۔ چند الفاظ دیکھئے۔

۱۔ ادھ موا (آدھا + موا)، ادھ کچرا (آدھا + کچرا)، امرس (آم + رس)

۲۔ بگ ٹٹ (باگ + ٹوٹ)، بھلے مانس (بھلا + مانس)

۳۔ ترنگا (تین + رنگ)، تکونا (تین + کون)، پچرنگ (پانچ + رنگ)، پچکون (پانچ + کون)

۴۔ پن چکی (پانی + چکی)، پن گھٹ (پانی + گھاٹ) پھلجھڑی (پھول + جھڑی)

۵۔ چڑی مار (چڑیا + مار)، مکھی مار (مکھی + مار)، تیس مار (تیس + مار)

۶۔ کنٹوپ (کان + ٹوپ)، کن کٹا (کان + کٹا)

۷۔ گھڑ دوڑ (گھوڑا + دوڑ)، گھڑ سوار (گھوڑا + سوار)، گھڑ منہ (گھوڑا + منہ)

۸۔ نکٹا (ناک + کٹا)، نک چڑھا (ناک + چڑھا)

۹۔ ہتھکڑی (ہاتھ + کڑی) ہتھ چھٹ (ہاتھ + چھٹ)

ان الفاظ کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ لفظ کے نامکمل جزو کو مکمل کرکے تختہ سیاہ پر اس طرح پیش کیا جائے، جیسے اوپر قوسین کے اندر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ معنی کی تہ تک پہونچنے میں

طلبہ کو آسانی ہو جائے گی بلکہ بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں الفاظ سازی اور الفاظ کی تحقیق کا شوق پیدا ہوگا ساتھ ہی وہ اس نکتے تک بھی پہونچ جائیں گے کہ کسی مرکب لفظ میں کوئی خاص معنی کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں ۔

جس قسم کے مرکبات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ، ان میں ایک خاص طرح کے مرکبات اور بھی شامل ہیں ۔ ان میں دو لفظوں میں سے چونکہ صرف ایک لفظ معنی دیتا ہے ، اور دوسرا بظاہر بے معنی ہوتا ہے ، اس لئے وہ پہلے لفظ کا تابع کہلاتا ہے ۔ مثلاً

۱ ۔ پانی وانی ، روٹی ووٹی ، کھانا وانا

۲ ۔ بات چیت ، دوڑ دھوپ ، سودا سلف[1] ، دانہ دنکا

۳ ۔ ٹھیک ٹھاک ، ٹال مٹول ، ڈیل ڈول ۔ لوگ باگ

۴ ۔ آس پاس ، ادلا بدلا ، آمنے سامنے

پہلے تین گروہوں کے مرکبات کا دوسرا لفظ بے معنی یا پہلے لفظ کا تابع ہے ۔ چوتھے گروہ کے مرکبات کا پہلا جزو بے معنی یا دوسرے لفظ کا تابع ہے ۔ اس طرح ان میں صرف ایک لفظ مستقل اور بامعنی ہے اور دوسرا جزو بے معنی ۔ لیکن یہ بے معنی جزو ، معنی دار لفظ سے مل کر ایک نئے معنی کو جنم دیتا ہے ۔ جو بامعنی لفظ کے اصل معنی پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ تدریس کے دوران جہاں کہیں اس قسم کے مرکبات آئیں ان کی تفہیم کے وقت بہتر یہ ہوگا کہ اس قبیل کے چند اور مرکبات طلبہ کے سامنے پیش کر دیئے جائیں اور انہیں اس نکتے کی طرف توجہ دلائی جائے کہ روزمرہ کی گفتگو میں ایک معنی دار لفظ کو کس طرح الٹ پلٹ کر بے معنی بنا لیا جاتا ہے اور پھر وہ ایک معنی دار لفظ کے ساتھ منسلک ہو کر کس طرح ایک نیا معنی دار لفظ بن جاتا ہے دو چار لفظوں کی وضاحت کے بعد طلبہ اس قسم کے مرکبات کی تخلیق اور ان کے معانی کا ادراک خود ہی بڑی آسانی سے کریں گے ، اور مہمل الفاظ کے معانی تلاش کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں گے ۔

(ب) دوسری قسم کے مرکبات وہ ہیں جن میں کسی بامعنی لفظ سے پہلے یا بعد میں کوئی دوسرا لفظ ، یا لفظ کا جزو ، کوئی علامت ، یا کوئی حرف زائد کر دیا جاتا ہے ۔ یہ زائد لفظ یا جزو کبھی کبھی معنی دار ہوتا ہے لیکن اکثر صورتوں میں بے معنی ۔ یعنی اُردو میں تنہا یہ لفظ یا جزو نہ استعمال ہوتا ہے نہ تنہا کوئی معنی دیتا ہے ۔ بامعنی الفاظ سے پہلے آنے والے الفاظ یا اجزا قواعد میں

"سابقے" اور الفاظ کے بعد آنے والے اجزاء "لاحقے" کہلاتے ہیں۔ ذیل کے چند الفاظ دیکھئے۔

(۱) پُر ۔ پُرمغز، پرجوش، پُردرد، پُرلطف، پُراثر۔

(۲) خوش ۔ خوش رنگ، خوش مزاج، خوش دل، خوش حال، خوش ذائقہ

(۳) صاحب ۔ صاحبِ اختیار، صاحبِ جمال، صاحب عقل، صاحب شعور صاحبِ دل، صاحب خانہ

(۴) خلاف ۔ خلاف عقل، خلاف مزاج، خلاف شرع، خلاف مرضی، خلاف امید، خلاف توقع

(۵) کم ۔ کم زور، کم عقل، کم نظر، کم اصل،

(۶) خوب ۔ خوب صورت، خوب رو، خوب شکل

(۷) اہل ۔ اہل دل، اہل فن، اہل کمال، اہل نظر، اہل علم

(۸) پاک ۔ پاک طینت، پاک سیرت، پاک دامن

(۹) میر ۔ میر منشی، میر کارواں، میر مطبخ، میر آتش۔

(۱۰) نیک ۔ نیک طبیعت، نیک مزاج، نیک دل

(۱۱) مہا ۔ مہادیو، مہاجن، مہابھارت، مہابلی

(۱۲) تنگ ۔ تنگ نظر، تنگ دل

ان میں اصل لفظ سے پہلے جو سابقے استعمال کئے گئے ہیں ان میں سے تقریباً سبھی بامعنی مفرد الفاظ ہیں اور اُردو میں تنہا بھی مستعمل ہیں۔ صرف یہ کہ دوسرے بامعنی الفاظ سے مل کر انہوں نے ایک نئے معنی کو جنم دیا ہے۔ ان کی تفہیم کے وقت اگر مرکب کے دونوں اجزاء کو الگ الگ کر کے طلبہ کو دکھایا جائے اور ہر جزو کے معنی واضح کر دیئے جائیں تو اکثر طلبہ مرکبات کے اصل معنی تک خود بخود پہونچ جائیں گے اب مندرجہ ذیل مرکبات پر نظر ڈالئے۔

(۱) الف ۔ (کلمہ نفی) ۔ اچل (ا + چل، چلنا سے) ۔ اٹل (ا + ٹل، ٹلنا سے) ۔ امر (ا + مر، مرنا سے) ۔

(۲) ان - (کلمہ نفی) - ان بن (ان + بن، بننا سے) - انجان (ان + جان، جاننا سے) - ان پڑھ (ان + پڑھ، پڑھنا سے) - ان تھک (ان + تھک، تھکنا سے) - ان مول (ان + مول، بمعنی قیمت) -

(۳) بے - (کلمہ نفی) - بے پروا، بے عقل، بے بس، بے بھاؤ، وغیرہ

(۴) لا - (کلمہ نفی) - لامذہب، لاابالی، لاوارث، لاچار، لاعلم، لاحاصل وغیرہ

(۵) نا - (کلمہ نفی) - ناحق، ناوقت، نااہل، نالائق، ناراضی، ناامید، نافرمان، وغیرہ

(٦) غیر - (کلمہ نفی) - غیر حاضر، غیر ممکن، غیر آباد، غیر موزوں، وغیرہ

ان مرکبات کے ابتدائی جز یعنی سابقے اُردو میں مفرد الفاظ کی حیثیت سے استعمال نہیں کیے جاتے لیکن دوسرے لفظ سے مل کر یہ اصل لفظ کو معنی کے اعتبار سے بالکل الٹ دیتے ہیں۔ ایسے مرکبات کے معنی بتاتے وقت، اگر بطور لاحقہ استعمال ہونے والے اجزا کو الگ کرکے دکھا دیا جائے، نیز یہ بھی واضح کردیا جائے کہ یہ الفاظ جن الفاظ سے پہلے آتے ہیں، ان کے معانی کی نفی کردیتے ہیں تو طلبہ اس قسم کے مرکبات کی روح تک بآسانی پہونچ جائیں گے اور ضرورت پڑنے پر نئے الفاظ بھی تراش لیں گے۔ لیکن ان کے محل استعمال کو سمجھانے کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ان الفاظ کو جملوں اور عبارتوں میں استعمال کرنے کی مشق کرائی جائے، ورنہ معانی جاننے کے باوجود غلطی کا امکان باقی رہے گا۔

سابقوں سے بننے والے مرکبات کی چند مثالیں اور دیکھئے -

۱- با - باوصف، باوجود، باخبر، بااثر، وغیرہ -

۲- باز - بازپرس، بازگشت، بازخواہ، باز دعویٰ وغیرہ -

۳- پس - پس انداز، پس ماندہ، پس خوردہ، پس پا، وغیرہ -

۴- پیش - پیش بندی، پیش قدمی، پیش خیمہ، پیش کار، وغیرہ -

۵- زود - زود ہضم، زود نویس، زود آشنا، زود اثر، وغیرہ -

۶- ذی - ذی قدر، ذی جاہ، ذی شان، ذی شعور، ذی فہم، وغیرہ -

۷۔ خود ۔ خودنما، خودپسند، خودرائے، خودپرست، وغیرہ ۔

۸۔ در ۔ درپردہ، درمیان، درپیش، دراندازہ، درخواست، وغیرہ ۔

۹۔ شہ ۔ شہ زور، شہ ناز، شہ سوار، شہتوت، شہ رگ، وغیرہ ۔

۱۰۔ سر ۔ سرگرم، سربلند، سرخوش، سرحد، سرسبز، وغیرہ ۔

۱۱۔ زیر ۔ زیردست، زیربار، زیرلب، زیرنگین، وغیرہ ۔

۱۲۔ نیم ۔ نیم باز، نیم حکیم، نیم ملا، نیم جان، نیم راضی، نیم بسمل، وغیرہ ۔

۱۳۔ نو ۔ نوآباد، نوجوان، نوآموز، نووارد، نونہال، وغیرہ ۔

۱۴۔ ہم ۔ ہم آغوش، ہم رنگ، ہم نام، ہم جماعت، ہم پلہ، وغیرہ ۔

۱۵۔ یک ۔ یک رنگ، یک لخت، یکتا، یک شنبہ، یک جہتی، وغیرہ ۔

اس قسم کے مرکبات کی تدریس کے وقت مناسب ہوگا کہ جملہ سازی کے ساتھ ساتھ الفاظ سازی سے بھی مدد لی جائے، اس لئے کہ اس قسم کے بیشتر مرکبات کے معنی جملے کے ذریعے واضح نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ "ہم نام" کے معانی سمجھاتے وقت صرف اس انداز کا جملہ

"حامد میرا ہم نام ہے"

پیش کر دینے سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اگر جملوں ہی کے ذریعے اس قسم کے معنی واضح کرنے ہوں تو پھر حسب ذیل انداز کے جملے بنائے جائیں ۔

۱ ۔ میرا نام بھی محمود علی ہے ۔

۲ ۔ آپ کا نام بھی محمود علی ہے ۔

۳ ۔ یعنی میں اور آپ ہم نام ہیں ۔

لیکن سب سے اچھا طریقہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے مرکبات کی تفہیم کے وقت سابقوں کی مدد سے اپنی نوعیت کے متعدد الفاظ بنا کر دکھائے جائیں اور طلبہ سے بنوائے جائیں، نیز مرکب کے دونوں اجزا کو الگ الگ تختہ سیاہ پر واضح کیا جائے اور ان کے ربط سے پیدا ہونے والے معانی کا احساس دلایا جائے۔ اس میں استاد کو زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑے گی بلکہ طلبہ چند مثالوں کے بعد خود بہت سے مرکبات بنالیں گے اور اس طرح سے دوسرے مرکبات کا مفہوم خود ہی اخذ کرلیں گے ۔

اوپر جس قسم کے مرکب الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں وہ سابقوں کی مدد سے یعنی اصل لفظ سے پہلے کسی لفظ یا علامت کا اضافہ کرکے بنائے گئے ہیں۔ لیکن بے شمار مرکبات ایسے بھی ہیں جو لاحقوں کی مدد سے یعنی اصل لفظ کے بعد کوئی لفظ یا علامت کے اضافے سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ بھی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے دو خاص گروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ جو اصل لفظ کے بعد کسی خاص علامت یا ایسے لفظ کے اضافے سے بنتے ہیں جو تنہا اپنے کوئی معانی نہیں دیتا لیکن معنی دار لفظ کے بعد اپنی معنویت کو ثابت کردیتا ہے۔ مثلاً ذیل کے الفاظ دیکھیے۔

۱ - پن - لڑکپن (لڑکا + پن)، احمق پن، بچپن، دیوانہ پن، پاگل پن، وغیرہ۔
۲ - آر - لوہار (لوہا + آر)، سُنار، چمار، خریدار، گنوار، وغیرہ۔
۳ - آنہ - انگشتانہ (انگشت + آنہ)، ہرجانہ، دستانہ، مردانہ، زنانہ، مخنتانہ، وغیرہ۔
۴ - بان - فیل بان (فیل + بان)، میزبان، نگہبان، گاڑی بان۔ گلہ بان، وغیرہ۔
۵ - پا - دیرپا (دیر + پا)، سیخ پا، چراغ پا، گریزپا، وغیرہ۔
۶ - پتی - لکھپتی (لاکھ + پتی) ہزارپتی، کروڑپتی، سیناپتی۔ وغیرہ۔
۷ - تر - کم تر (کم + تر) بہتر، خوشتر وغیرہ۔
۸ - چہ - صندوقچہ (صندوق + چہ)، باغیچہ، نہالچہ، دیگچہ، بیلچہ، وغیرہ
۹ - چی - صندوقچی (صندوق + چی)، غلیلچی، خزانچی، باورچی، طبلچی، نشانچی، بندوقچی، وغیرہ۔
۱۰ - خانہ - آئینہ خانہ (آئینہ + خانہ)، کارخانہ، پاگل خانہ، قیدخانہ، وغیرہ۔
۱۱ - دان - پاندان (پان + دان)، خاندان، گلدان، روشن دان، آتش دان، سرمہ دانی، چائے دانی، مچھردانی، وغیرہ،
۱۲ - زار - سبزہ زار (سبزہ + زار) گلزار، کارزار، مرغزار، خارزار، وغیرہ
۱۳ - ستان - گلستان (گل + ستان)، بوستان، چمنستان، پاکستان، ترکستان، وغیرہ۔
۱۴ - سر - خودسر (خود + سر)، ہم سر، سبک سر، شوریدہ سر، وغیرہ۔

۱۵ ۔ فام ۔ گلفام (گل + فام)، لالہ فام، سیاہ فام، سرخ فام، مشک فام، وغیرہ

۱۶ ۔ کار ۔ خطاکار (خطا + کار)، شاہکار، مختار کار، پیش کار، فن کار، وغیرہ ۔

۱۷ ۔ کدہ ۔ بتکدہ (بت + کدہ)، آتش کدہ، غم کدہ، میکدہ، صنم کدہ، وغیرہ ۔

۱۸ ۔ گار ۔ خدمتگار (خدمت + گار)، ستم گار، گنہ گار، سازگار، پروردگار، وغیرہ ۔

۱۹ ۔ گر ۔ کارگر (کار + گر) سوداگر، جادوگر، رفوگر، بازی گر، وغیرہ ۔

۲۰ ۔ گوں ۔ نیل گوں (نیل + گوں)، گوناگوں، میگوں، گل گوں، شب گوں، وغیرہ ۔

۲۱ ۔ گیں/ین ۔ شرمگین (شرم + گین)، غمگین، سنگین، رنگین، اندوہگین، وغیرہ ۔

۲۲ ۔ مند ۔ احسان مند (احسان + مند)، عقل مند، دردمند، غرض مند، رضامند، وغیرہ

۲۳ ۔ ناک ۔ دردناک (درد + ناک)، غمناک، دہشت ناک، المناک، عبرتناک، وغیرہ

۲۴ ۔ وار/ور ۔ بہرہ ور (بہرہ + ور)، طاقت ور، دانش ور، سخن ور، دیدہ ور، وغیرہ

قصوروار (قصور + وار)، خطاوار، سوگوار، سزاوار، وغیرہ ۔

یہ مرکبات جن لاحقوں کی مدد سے بنائے گئے ہیں وہ تنہا اپنے کوئی معنی نہیں رکھتے ۔ لیکن مرکبات میں آکر ان کے معنی کا اثر صاف نمایاں ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ ان کے مرکبات کی تشریح کے وقت طلبہ پر یہ بات واضح کی جائے کہ جن الفاظ کے بعد کدہ، ستان، گاہ، زار، دان، خانہ وغیرہ آتے ہیں وہ اسے اسم ظرف یعنی جگہ کے معنوں میں بدل دیتے ہیں چنانچہ بت کدہ کے معنی ہونگے بت کی جگہ، میخانہ کے معنی ہوں گے شراب کی جگہ، گلزار کے معنی ہوں گے پھولوں کی جگہ، پاندان کے معنی ہوں گے پان رکھنے کا برتن، اسی طرح جن الفاظ کے بعد گار، وار، مند، کار، ناک وغیرہ کا اضافہ کیا جائے گا وہ اسم فاعل میں بدل جائیں گے ۔ چنانچہ خدمتگار کے معنی ہوں گے خدمت کرنے والا ۔ قصوروار کے معنی ہوں گے قصور کرنے والا، خردمند کے معنی ہونگے عقل والا، خطاکار کے معنی ہوں گے خطا کرنے والا ۔ المناک کے معنی الم والا یعنی الم دینے والا ——

فام اور گوں کے لاحقوں کے متعلق یہ واضح کردینا چاہئے کہ یہ جن الفاظ کے ساتھ آتے ہیں ان میں اسی رنگ کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں " چنانچہ نیلگوں کے معنی ہونگے نیل کے رنگ کا اور گل فام کے معنی ہوں گے پھول کے رنگ کا ، اسی طرح چہ اور چی کے سلسلے میں یہ بتانا چاہئے کہ یہ اسم تصغیر اور اسم فاعل بنانے کے کام آتے ہیں - یعنی جس لفظ کے ساتھ ان کا استعمال کیا جاتا ہے اس میں " چھوٹے پن " یا کام کرنے کی اہلیت کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں - چنانچہ صندوقچہ کے معنی ہوں گے چھوٹا صندوق ، توپچی کے معنی ہوں گے توپ چلانے والا - غرضکہ اس طرح کے مرکبات کے معنی ذہن نشین کرانے کے لئے مفید طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے دونوں اجزاء الگ الگ کرکے دکھائے جائیں - پھر ان کو ملاکر ان کے معنی واضح کئے جائیں بعد ازاں اسی قبیل کے دوسرے الفاظ بنواکر جملوں میں استعمال کرنے کی مشق کرائی جائے -

لاحقوں کی مدد سے بننے والے مرکبات کی ایک صورت اور ہے - اکثر الفاظ کے آخر میں کسی فارسی مصدر کے امر کا اضافہ کرنے سے مرکب بن جاتا ہے - اور یہ مرکب کبھی کبھار اسم مفعول اور اکثر اسم فاعل کا کام کرتا ہے یعنی جس مصدر کے امر سے یہ بنتا ہے اسی مصدر کے معنی کا حامل بن کر فاعلی صورت اختیار کرلیتا ہے - مثلاً گلفروش کو لے لیجئے ، جو دراصل گل + فروش ہے - فروش لاحقہ ہے جس کا " گل " پر اضافہ کرکے مرکب لفظ بنایا گیا ہے " فروش " فارسی مصدر فروختن یعنی بیچنا سے مشتق ہے - فروختن کا مضارع ہوا فروشد ، مضارع کی " د " حذف کرنے سے امر برآمد ہوتا ہے ، اس لئے فروش ، فروختن کا امر ہوا - گل سے مرکب ہوکر اس نے فاعلی صورت اختیار کرلی - چنانچہ گلفروش کے معنی ہوئے پھول بیچنے والا اور میوہ فروش کے معنی ہوئے میوہ بیچنے والا - اردو میں استعمال ہونے والے مرکبات میں ایسے مرکبات کی تعداد سب سے زیادہ ہے - بے شمار الفاظ پہلے سے موجود ہیں اور آئے دن بنتے رہتے ہیں - اس جگہ مختلف مصدروں کے امر سے بننے والے مرکبات کی کچھ مثالیں دی جارہی ہیں - ہر مرکب کے ساتھ اس کے لاحقے کے مصدر کے معنی کی نشاندہی بھی قوسین کے اندر کردی گئی ہے ، تاکہ ایسے معلمین جو فارسی سے ناواقف ہیں وہ بھی ان سے فائدہ اٹھاسکیں اور بعد ازاں طلبہ کی رہنمائی کرسکیں -

١- آرا (آراستن بمعنی سجانا) جہاں آرا ، جلوہ آرا ، بزم آرا ، صف آرا ، وغیرہ

٢- آزما (آزمودن بمعنی آزمانا) صبر آزما ، صدمہ آزما ، زور آزما ، اور زور آزمائی وغیرہ -

۳ - آشوب (آشوبیدن اور آشفتن بمعنی پریشان کرنا) شہر آشوب ، چشم آشوب ، وغیرہ -

۴ - آفریں - (آفریدن بمعنی پیدا کرنا) جان آفریں ، غم آفریں ، نشاط آفریں ، نکتہ آفریں ، وغیرہ -

۵ - افروز یا فروز (افروختن یا فروختن بمعنی روشن کرنا) رونق افروز ، جلوہ افروز ، خیال افروز ، دل افروز ، وغیرہ -

۶ - افزا یا فزا (افزودن یا فزودن بمعنی بڑھانا ، زیادہ کرنا) روح افزا ، نشاط افزا ، راحت افزا ، غم افزا ، وغیرہ -

۷ - افشاں یا فشاں (افشاندن یا فشاندن بمعنی پھیلانا ، بکھیرنا) نور افشاں ، گوہر افشاں ، گل فشاں ، وغیرہ -

۸ - افگن یا فگن (افگندن یا فگندن بمعنی پھینکنا ، ڈالنا) نور فگن ، سایہ فگن ، شیر افگن ، وغیرہ -

۹ - آلود (آلودن بمعنی لت پت ہو جانا) خون آلود ، گرد آلود ، غبار آلود ، غم آلود ، وغیرہ -

۱۰ - آموز (آموختن بمعنی سکھانا ، سیکھنا) نو آموز ، عبرت آموز ، سبق آموز ، مصلحت آموز ، وغیرہ -

۱۱ - آمیز (آمیختن بمعنی ملانا) کم آمیز ، شرارت آمیز ، مصلحت آمیزی ، رنگ آمیزی ، وغیرہ

۱۲ - انداز (انداختن بمعنی ڈالنا ، پھینکنا) خلل اندازی ، قرعہ اندازی ، رخنہ اندازی ، تیر انداز ، وغیرہ -

۱۳ - اندوز (اندوختن بمعنی جمع کرنا) لطف اندوز ، شرف اندوز ، وغیرہ -

۱۴ - اندیش (اندیشیدن بمعنی فکر کرنا) دور اندیش ، مصلحت اندیش ، عاقبت اندیش ، وغیرہ -

۱۵ - انگیز (انگیختن بمعنی اُبھارنا) غم انگیز۔ عمل انگیز۔ لشکر انگیز، وحشت انگیز، وغیرہ۔

۱۶ - آور (آوردن بمعنی لانا) دست آور، دلاور، نشاط آور، نامور، زور آور، وغیرہ۔

۱۷ - باز (باختن یا بازیدن بمعنی کھیلنا) کبوتر باز، پتنگ باز، جلد باز، چال بازی، وغیرہ

۱۸ - باش (باشیدن بمعنی رہنا) خوش باش، شاد باش، یار باش، وغیرہ

۱۹ - بخش (بخشیدن بمعنی بخشنا) مولا بخش، صحت بخش، مسرت بخش، فرحت بخش، وغیرہ۔

۲۰ - بر (بردن بمعنی لے جانا) راہ بر، نامہ بر، پیامبر، پیغامبر، دلبر، وغیرہ

۲۱ - بند (بستن بمعنی باندھنا) ہتھیار بند، نظر بند، گلوبند، کمربند، وغیرہ۔

۲۲ - بوس (بوسیدن بمعنی چومنا) فلک بوس، قدم بوسی، دست بوسی، پابوس، وغیرہ۔

۲۳ - بیز (بیختن بمعنی چھاننا) عطر بیز، گہر بیز، نور بیز، وغیرہ۔

۲۴ - بین (دیدن بمعنی دیکھنا) مصلحت بین، دور بین، تماش بین، باریک بین، ظاہر بین، وغیرہ۔

۲۵ - پذیر (پذیرفتن بمعنی قبول کرنا) دل پذیر، ترقی پذیر، اثر پذیر، وغیرہ

۲۶ - پاش (پاشیدن بمعنی چھڑکنا) گلاب پاش، عطر پاش، نمک پاش، آبپاشی، وغیرہ۔

۲۷ - پرداز (پرداختن بمعنی مشغول ہونا - سنوارنا) افترا پرداز، انشا پرداز، کار پردازی، وغیرہ۔

۲۸ - پرست (پرستیدن بمعنی پوجنا) صورت پرست، بت پرست، قدامت پرست، خود پرست، وغیرہ۔

۲۹ ۔ پرور (پروردن بمعنی پالنا) بندہ پرور، غریب پرور، کنبہ پرور، روح پرور، وغیرہ ۔

۳۰ ۔ پسند (پسندیدن بمعنی پسند کرنا) خودپسند، ترقی پسند، قدامت پسند، دل پسند، وغیرہ ۔

۳۱ ۔ پوش (پوشیدن بمعنی چھپانا) عیب پوش، خطاپوش، کمبل پوش، میزپوش، وغیرہ ۔

۳۲ ۔ تراش (تراشیدن بمعنی تراشنا) قلم تراش، جیب تراش، سنگ تراش، وغیرہ ۔

۳۳ ۔ جو (جستن بمعنی تلاش کرنا) جنگجو، چارہ جوئی، دل جوئی، عیب جو، صلح جو، وغیرہ ۔

۳۴ ۔ چیں (چیدن بمعنی توڑ لینا) گل چیں، نکتہ چیں، خوشہ چیں، وغیرہ ۔

۳۵ ۔ خراش (خراشیدن بمعنی چھیلنا) دل خراش، جگرخراش، سمع خراشی، وغیرہ ۔

۳۶ ۔ خرام (خرامیدن بمعنی نازوادا سے چلنا) خوش خرام، نازک خرام، سبک خرام، آہستہ خرام، وغیرہ ۔

۳۷ ۔ خوار یا خور (خوردن بمعنی کھانا) رشوت خور، غم خوار، سودخور، خوں خوار، شراب خور، وغیرہ ۔

۳۸ ۔ خواہ (خواستن بمعنی چاہنا) دل خواہ، تنخواہ، قرض خواہ، خیرخواہ، دادخواہ، وغیرہ ۔

۳۹ ۔ خواں (خواندن بمعنی پڑھنا) قرآن خوانی، مولودخواں، مرثیہ خواں، قصہ خوانی، وغیرہ ۔

۴۰ ۔ دار (داشتن بمعنی رکھنا) دمدار، طرح دار، تحصیل دار، رشتہ دار، سرمایہ دار، پھول دار، مال دار، وغیرہ ۔

۴۱ ۔ دان (دانستن بمعنی جاننا۔ مضارع دارد م) حساب دان، سائنس دان، ریاضی دان، وغیرہ ۔

۴۲ ۔ دوز (دوختن بمعنی سلنا، چھیدنا، مضارع دوزد) آبدوز، جگر دوز، زمیں دوز، وغیرہ

۴۳ ۔ ران (راندن بمعنی چلانا، ہانکنا، مضارع راند) حکم ران، جہاںران، کام ران، وغیرہ ۔

۴۴ ۔ رس (رسیدن بمعنی پہنچنا، مضارع رسد) نکتہ رس، دادرس، فریادرس وغیرہ

۴۵ ۔ رو (رفتن بمعنی چلنا، مضارع رود) کم رو، تیزرو، میانہ رو، سبک رو، خودرو، وغیرہ ۔

۴۶ ۔ رساں (رسانیدن بمعنی پہونچانا، مضارع رساند) چیٹھی رساں، خبر رساں، فیض رساں، ضرر رساں، وغیرہ ۔

۴۷ ۔ ریز (ریختن بمعنی بکھیرنا، گرانا، مضارع ریزد) گل ریز، گہر ریز، خوں ریز، اشک ریز، وغیرہ ۔

۴۸ ۔ زن (زدن بمعنی مارنا، مضارع زند) تیغ زن، رہزن، طعنہ زن، شمشیر زن، وغیرہ ۔

۴۹ ۔ ساز (ساختن بمعنی بنانا، مضارع سازد) دندان ساز، جعل ساز، گھڑی ساز، دم ساز، وغیرہ ۔

۵۰ ۔ سرا (سرائیدن بمعنی گانا، گنگنانا، مضارع سراید) نغمہ سرا، مدح سرا، ہرزہ سرائی، وغیرہ ۔

۵۱ ۔ سنج (سنجیدن بمعنی تولنا، مضارع سنجد) نغمہ سنج شکوہ سنج، بذلہ سنج، سخن سنج، وغیرہ ۔

۵۲ ۔ سوز (سوختن بمعنی جلانا، جلنا، مضارع سوزد) دل سوز، جاں سوز،

۵۳ ۔ شکن (شکستن بمعنی توڑنا، ٹوٹنا، مضارع شکند) دل شکن، بت شکن، عہد شکن، قانون شکن، وغیرہ ۔

۵۴ ۔ شناس (شناختن بمعنی پہچاننا، مضارع شناسد) سخن شناس، مزاج شناس،

حسن شناس ، وغیرہ

۵۵ - شمار (شمردن بمعنی گننا ، مضارع شمارد) مردم شماری ، اختر شماری ، رائے شماری ، وغیرہ -

۵۶ - طراز (طرازیدن بمعنی نقش کرنا ، مضارع طرازد) مضمون طراز ، سخن طراز ، عشوہ طراز ، وغیرہ -

۵۷ - طلب (طلبیدن بمعنی طلب کرنا ، مضارع طلبد) آرام طلب ، غور طلب ، تحقیق طلب ، وغیرہ -

۵۸ - فرسا (فرسودن بمعنی گھسنا ، مضارع فرساید) روح فرسا ، خامہ فرسائی ، وغیرہ

۵۹ - فروش (فروختن بمعنی بیچنا ، مضارع فروشد) گل فروش ، سبزی فروش ، عطر فروش ، وغیرہ -

۶۰ - کَش (کشیدن بمعنی کھینچنا ، مضارع کشد) فاقہ کش ، دلکش ، محنت کش ۔ وغیرہ

۶۱ - کُش (کشتن بمعنی مارنا ، مضارع کشد) خودکشی ، مردم کش ، محسن کش وغیرہ

۶۲ - کُشا (کشادن بمعنی کھولنا ، مضارع کشاید) دلکشا ، مشکل کشا ، غنچہ کشا ، روزہ کشائی ، وغیرہ -

۶۳ - کَن (کندن بمعنی کھودنا مضارع کند) گورکن ، جاں کنی ، کان کنی ، وغیرہ -

۶۴ - کُن (کردن بمعنی کرنا ، مضارع کند) خوش کن ، کارکن ، وغیرہ -

۶۵ - کوش (کوشیدن بمعنی کوشش کرنا ، مضارع کوشد) سخت کوش ، جفاکوش ، وفاکوش ، وغیرہ -

۶۶ - گداز (گداختن بمعنی پگھلانا ، مضارع گدازد) دلگداز ، جاں گداز ، وغیرہ -

۶۷ - گرد (گشتن بمعنی گھومنا ، پھرنا ، مضارع گردد) جہاں گرد ، آوارہ گرد ، کوچہ گرد ، وغیرہ -

۶۸ - گو (گفتن بمعنی کہنا ، مضارع گوید) نعت گو ، حق گو ، خوش گو ، قصہ گو ، پُرگو ، وغیرہ -

۶۹ ـ گیر (گرفتن بمعنی پکڑنا، مضارع گیرد) کف گیر، گداگیر، دلگیر، دست گیر، ماہی گیر، وغیرہ۔

۷۰ ـ مال (مالیدن بمعنی ملنا، مضارع مالد) گوش مالی، شیرمال، رومال، پامال، وغیرہ۔

۷۱ ـ نشین (نشستن بمعنی بیٹھنا، مضارع نشیند) دل نشین، تہ نشین، بالانشین، وغیرہ۔

۷۲ ـ نگار (نگاشتن بمعنی لکھنا، مضارع نگارد) نامہ نگار، مضمون نگار، واقعہ نگار، وغیرہ۔

۷۳ ـ نویس (نوشتن بمعنی لکھنا، مضارع نویسد) مضمون نویس، ناول نویس، وغیرہ

۷۴ ـ نما (نمودن بمعنی دکھانا، ظاہر کرنا، مضارع نماید) حق نما، جلوہ نما، جہاں نما، رونمائی، وغیرہ۔

۷۵ ـ نواز (نواختن بمعنی نوازنا، مضارع نوازد) غریب نواز، بندہ نواز، مہماں نواز، وغیرہ۔

۷۶ ـ نوش (نوشیدن بمعنی پینا، مضارع نوشد) مے نوش، بلانوش، دریا نوش، وغیرہ

۷۷ ـ نورد (نوردیدن بمعنی طے کرنا، مضارع نوردد) صحرانورد، راہ نورد، دشت نوردی، وغیرہ۔

اس طرح کے "لاحقے" بے شمار ہیں۔ اوپر فارسی کے صرف چند مصدروں سے نکلنے والے لاحقوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اگر اُردو کے معلمین کی نظر فارسی کے سارے مصدروں اور ان کے "امر" پر ہو تو وہ اس قسم کے مرکبات کی تشریح بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل کے معلمین عموماً فارسی سے ناواقف ہیں۔ پرانے اساتذہ چونکہ کسی نہ کسی حد تک فارسی اور عربی بھی ضرور جانتے تھے اس لئے وہ ان مرکبات کی تشریح بڑی خوش اسلوبی سے کر دیا کرتے تھے۔ ہمارے عہد کے معلمین کو چاہیے کہ اگر وہ فارسی نہیں جانتے تو کم از کم اردو فارسی کے لغات اور قواعد کی کتابوں سے مدد لینے کی عادت ڈالیں، محنت اور توجہ سے ہر چیز آسان ہو جاتی ہے۔ جب تک

وہ خود زبان کے سلسلے میں اپنی معلومات نہ بڑھائیں گے اور زبان دانی کے عام اصولوں پر نظر نہ رکھیں گے تدریس زبان سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ اگر معلم اپنے مضمون پر حاوی ہو، اس کے رموز و نکات کو سمجھتا ہو اور لغاتِ الفاظ کا وافر ذخیرہ اپنے پاس رکھتا ہو، تو پھر اُسے اپنی بات دُوسروں کے ذہن میں اُتارنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ صاحب علم، صاحب ذوق اور محنتی معلم تفہیم کے لئے نئی نئی مثالیں اور نئے نئے طریقے خود ایجاد کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معلم زبان کے مسائل سے معمولی واقفیت رکھتا ہو اور تدریس میں محنت اور دل چسپی سے بھی کام نہ لیتا ہو، تو تدریس زبان کے سارے اصول اور سارے قاعدے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ کاش ہمارے معلمین اس طرف توجہ کریں۔

زباندانی اور تدریسِ اُردو کے بعض دوسرے اہم پہلو

تدریس اُردو کے مختلف پہلوؤں پر گذشتہ ابواب میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ اس جگہ صرف چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہے جو زیرِ بحث آنے سے رہ گئی ہیں یا جنہیں مزید وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کچھ باتوں کا تعلق زباندانی سے ہے اور اس خیال سے بیان کی جا رہی ہیں کہ زبان کے معلم کے لئے اُن کا جاننا اور ذہن میں رکھنا ازبس ضروری ہے، کچھ باتیں تدریس کے طریقہ کار سے متعلق ہیں اور زیرِ تربیت اساتذہ اُن سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

"نے" کا استعمال

اُردو قواعد میں "نے" کو علامت فاعل کہا جاتا ہے صرف اس لئے کہ اس کا استعمال فاعل کے فوراً بعد ہوتا ہے جیسے ان جملوں میں

(۱) اُس نے کہا ہے

(۲) میں نے اطلاع دے دی تھی۔

لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ "نے" کا استعمال اُردو میں صرف مندرجہ ذیل چار قسم کے جملوں میں ہوتا ہے۔

(۱) اُس نے خط لکھا۔ (ماضی مطلق)

(۲) اُس نے خط لکھا ہے۔ (ماضی قریب)

(۳) اُس نے خط لکھا ہوگا۔ (ماضی شکی)

(۴) اُس نے خط لکھا تھا۔ (ماضی بعید)

یعنی صرف ماضی مطلق۔ ماضی قریب۔ ماضی شکی۔ اور ماضی بعید کے جملوں میں فاعل کے

بعد "نے" آتا ہے، کسی اور زمانہ (TENSE) کے جملوں میں اس کا استعمال غلط ہوگا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ "نے" کا استعمال صرف فعل متعدی کے ساتھ ہوتا ہے، فعل لازم یا فعل ناقص کے جملوں میں "نے" کبھی نہیں آتا خواہ وہ کسی قسم کے زمانہ (TENSE) سے تعلق رکھتے ہوں۔

فعل لازم اور فعل متعدی کی شناخت فعل لازم کی تعریف یہ ہے کہ وہ مفعول کا محتاج نہیں ہوتا، مثلاً

(۱) وہ آتا ہے۔

(۲) میں جاتا ہوں۔

میں "آتا ہے" "جاتا ہوں" فعل لازم ہیں۔

فعل متعدی، اس فعل کو کہتے ہیں جو اپنا مفعول بھی ضرور لاتا ہے مثلاً

(۱) وہ خط لکھتا ہے

(۲) میں کتاب پڑھتا ہوں

میں "لکھتا ہے" "پڑھتا ہوں" فعل متعدی ہیں اور "خط" و "کتاب" علی الترتیب ان کے مفعول ہیں۔

تدریسی تجربے نے بتایا کہ طلبہ، جملوں میں فعل لازم، فعل متعدی اور مفعول کی شناخت بڑی مشکل سے کر پاتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ بعض جملوں میں مفعول محذوف ہوتا ہے اور بعض جملوں میں فعل سے اتنی دور رکھا ہوتا ہے کہ اُسے پہچاننا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے طلبہ کو چٹکلے کے طور پر صرف اتنی بات بتا دینی چاہیئے کہ جس فعل کے متعلق لازم یا متعدی کی شناخت کرنی ہو پہلے اُسے فعل ماضی مطلق میں ڈھال لیں۔ اگر جملے میں فاعل کے بعد "نے" آئے تو سمجھنا چاہئے کہ فعل متعدی ہے ورنہ فعل لازم۔ مثلاً: ان جملوں کو دیکھئے۔

(۱) حامد سڑک پر دوڑتا ہے

(۲) میں کتاب پڑھتا ہوں

ان میں "دوڑتا ہے" اور "پڑھتا ہوں" فعل ہیں کس قسم کے فعل ہیں؟ بالفرض ایک بچہ اس کے جواب میں دقت محسوس کر رہا ہے، آپ اس سے کہئے کہ دونوں کو ماضی مطلق میں اس طور پر بدل ڈالے۔

(۱) حامد سڑک پر دوڑا

(۲) میں نے کتاب پڑھی

پہلے جملے میں "نے" نہیں آیا اس لئے "دوڑنا" اور اس سے بنے ہوئے سارے فعل لازم ہوں گے اس کے برعکس چونکہ دوسرے میں "نے" کا استعمال ہوا ہے اس لئے "پڑھنا" اور اُس سے بنے ہوئے سارے فعل متعدی ہونگے، اسی قیاس پر سارے مصادر اور افعال کی شناخت کرائی جاسکتی ہے۔

بعض لفظوں کی تذکیر و تانیث

تذکیر و تانیث کے سلسلے میں طلبہ کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ بعض الفاظ مذکر و مونث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں یعنی اُنہیں مذکر لکھا جائے یا مونث، قواعد کے لحاظ سے درست خیال کئے جائیں گے مثلاً"

قلم، فکر، سانس، طرز، نقاب، درود، فاتحہ، گیند، نشوونما، عندلیب، مجلس اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ، اہل دہلی اور اہل لکھنو کی تقلید میں مذکر بھی استعمال ہوتے ہیں مونث بھی چنانچہ پرانے شعراء کے یہاں جہاں اس قسم کی مثالیں نظر آئیں، طلبہ کی توجہ اُن کی تذکیر و تانیث کی طرف ضرور مبذول کرانا چاہئے ورنہ طلبہ عمر بھر مغالطے کا شکار رہیں گے۔

"مصدر" مثلاً پڑھنا، لکھنا، خریدنا وغیرہ کے استعمال میں بھی اہل لکھنؤ اور اہل دہلی کا اختلاف ہے۔ مندرجہ ذیل جملوں کو دیکھئے۔

(۱) مجھے کتاب خریدنی ہے

(۲) مجھے کتاب خریدنا ہے

دونوں جملے صحیح ہیں "کتاب" چونکہ مونث ہے اس لئے "خریدنا" مصدر کا بھی "مونث" بنا لیا گیا ہے لیکن بعض کے نزدیک چونکہ "مصدر" کا مونث لانا جائز نہیں اس لئے وہ ہر حال میں مصدر کو مذکر ہی استعمال کرتے ہیں۔

املا پر بعض حروف ربط کے اثرات

بعض حروف ربط یا حرف جار مثلاً "نے، کو، سے، پر" میں، کے، کی، کا، سے وغیرہ جب کسی ایسے لفظ کے بعد آتے ہیں جن کے آخر میں "ا" یا چھوٹی "ہ" آتی ہو تو ا اور ہ اکثر بڑی "ے" سے بدل جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل جملے دیکھئے۔

(۱) گھوڑے کی سواری صحت کے لئے مفید ہے۔

(۲) کتے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔

(۳) حقے کی نلی بہت لمبی ہے۔

(۴) جمعے کو چھٹی رہے گی۔

(۵) بیٹے نے باپ کی بڑی خدمت کی۔

(۶) ڈھاکے سے ہوائی جہاز کا سفر کرنا ہوگا۔

(۷) قلعے میں کئی سو سپاہی موجود تھے۔

(۸) کلکتے پر بمباری سے، شہریوں میں ہل چل مچ گئی۔

(۹) ٹھٹھے تک پختہ سڑک بنی ہوئی ہے۔

ان میں "گھوڑا"، "کتا"، "حقہ"، "جمعہ"، "بیٹا"، "ڈھاکا"، "قلعہ"، "کلکتہ" اور "ٹھٹہ" کی الف اور "ہ" نے حروف ربط کے زیر اثر بڑی "ے" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ قواعد میں اس تبدیلی یا عمل کا نام اِمالہ ہے —— طلبہ کی توجہ اس طرف ضرور مبذول کرانا چاہئے ورنہ آگے چل کر وہ لکھنے اور بولنے میں غلطیاں کریں گے لیکن اس قسم کے بعض الفاظ، مثلاً دریا، گنگا، رادھا وغیرہ اس سے مستثنیٰ بھی ہیں۔

واحد و جمع کے بعض نکتے

واحد و جمع کے اصول بتاتے وقت طلبہ کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ بعض الفاظ اگرچہ جمع ہیں لیکن بطور واحد استعمال ہوتے ہیں مثلاً ان جملوں میں :

(۱) جناب والا آداب عرض ہے۔

(۲) اس کا اخلاق بہت اچھا ہے۔

(۳) فلاں کی اولاد بڑی ناکارہ ہے۔

(۴) حاکم مزہ کر رہے ہیں رعایا پریشان حال ہے۔

(۵) شاہ صاحب نے کل وہ کرامات دکھائی کہ کچھ نہ پوچھئے۔

(۶) حامد کے معاملے کی ابھی تحقیقات ہو رہی ہے۔

(۷) میں اپنے مضمون کے لئے مواد جمع کر رہا ہوں۔

آداب، اخلاق، اولاد، رعایا، کرامات، تحقیقات اور مواد کے الفاظ حالانکہ بالترتیب ادب، خُلق، "ولد"، رعیت، کرامت، تحقیق، اور "مواد" کی جمع ہیں لیکن بطور واحد استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض الفاظ مثلاً اوسان، دام، درشن، دستخط اور کرتوت وغیرہ اگرچہ واحد ہیں لیکن ذیل کے جملوں میں

(۱) شیر کو دیکھ کر حامد کے اوسان خطا ہو گئے۔

(۲) ہر چیز کے دام آج کل چڑھے ہوئے ہیں۔

(۳) نام بڑا اور درشن تھوڑے

(۴) یہ کس کے دستخط ہیں۔

(۵) یہ تمہارے کرتوت معلوم ہوتے ہیں۔

یہ الفاظ بطور جمع استعمال ہوئے ہیں اور صحیح استعمال ہوتے ہیں۔

روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل

الفاظ کے معنی کے سلسلے میں جہاں مفرد و مرکب الفاظ کی بحث کی گئی ہے وہاں الفاظ کے اقسام میں روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل وغیرہ کا بھی ذکر آیا ہے، زبان کی تدریس میں ان سے اکثر سابقہ پڑتا ہے اور ان کے معنی طلبہ کے ذہن نشین کرانے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اُردو کے معلمین خود پوری طرح سمجھتے ہوں کہ یہ کیا ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔

"روزمرہ" الفاظ کے ایسے خاص استعمال کو کہتے ہیں جو پڑھے لکھے طبقے میں مروج ہو اور اس کے استعمال میں کسی قسم کی تبدیلی کو غیر فصیح یا غلط سمجھا جاتا ہو مثلاً ان جملوں کو دیکھئے۔

(۱) پانچ سات آدمی کو بلا لو اور معاملے کو طے کر لو۔

(۲) حامد و محمود میں آئے دن بحث ہوتی رہتی ہے۔

(۳) روز روز کی جھک جھک مجھے پسند نہیں۔

(۴) بلا ناغہ اسکول جایا کرو ورنہ نام خارج کر دیا جائے گا۔

(۵) ان دونوں میں زیادہ نہیں اُنیس بیس کا فرق ہے۔

ان میں "پانچ سات"۔ "آئے دن"۔ "روز روز" "بلاناغہ" اور "انیس بیس" کے الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں ان کا استعمال ہمیشہ اسی طرح ہوگا، انہیں کسی دوسرے لفظ سے بدلنے کی کوشش جملوں کو غلط اور مضحکہ خیز بنا دے گی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ روزمرہ سے مراد ایسا اسلوب بیان ہے جسے سارے پڑھے لکھے لوگوں نے متفقہ طور پر قبول کر لیا ہے اور اس میں رد و بدل کی اجازت نہیں ہے گو کہ روزمرہ کے الفاظ اپنے حقیقی معنی ہی میں استعمال ہوتے ہیں اور محاورہ کی طرح مجازی معنی سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

"محاورہ" سے مراد ایسے الفاظ ہیں جن سے حقیقی کے بجائے کوئی اور معنی مراد لے جاتے ہیں مثلاً ان لفظوں کو دیکھئے۔

کان کاٹنا، کان بھرنا، کان کھانا، کان کا کچا ہونا، کان دھرنا۔

یہ الفاظ ایسے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جن کا ان کے اصل معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ ان لفظوں میں کوئی نہ کوئی مقصد بھی شدید استعمال ہوا ہے اور یہی مقصد انہیں اپنے اصل معنی سے الگ دوسرے معنوں میں لے آیا ہے، اس طرح کے محاورے اُردو میں دو چار نہیں ہزاروں ہیں اور زبان کی فصاحت و بلاغت کے معیار عام طور پر انہیں سے متعین ہوتے ہیں۔ محاورے کے استعمال سے اسلوب بیان مختصر بھی ہو جاتا ہے اور دلکش بھی۔

روزمرہ اور محاورہ میں یہ فرق ہے کہ روزمرہ کا تعلق حقیقی معنوں سے اور محاورے کا تعلق مجازی معنوں سے ہوتا ہے۔ جس طرح روزمرہ میں کوئی تبدیلی جائز نہیں اُسی طرح محاورہ میں بھی کسی قسم کا رد و بدل مستحسن نہیں۔

کہاوت یا ضرب المثل بھی چند الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے، مثلاً

ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ وغیرہ ضرب المثل ہیں۔ ہر ضرب المثل کی پشت پر کوئی نہ کوئی حقیقی واقعہ ہوتا ہے یعنی کسی خاص موقع پر کسی خاص شخص کی زبان سے یہ الفاظ یا فقرے نکلتے ہیں اور اتنے برجستہ اور موثر ہوتے ہیں کہ جو شخص انہیں سنتا ہے وہ دوسروں سے اُن کی برجستگی اور دلچسپی کا حال بیان کرتا ہے یہی نہیں جب کبھی اُسی خاص قسم کے حالات سامنے آتے ہیں جن میں

یہ الفاظ یا فقرے پہلے پہل بولے گئے تھے، تو ان فقروں کو دُہرا دیا جاتا ہے، یہی تکرار ان فقروں کو مقبول عام بنا دیتی ہے اور اسی رعایت سے اُنہیں ضرب المثل یا کہاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ بعض کہاوتوں کے تاریخی واقعات، محققین نے تلاش کر لئے ہیں اور اکثر کا سراغ اب تک نہیں لگ سکا، لیکن ان فقروں کے تاریخی یا حقیقی ہونے میں شبہ نہیں۔ یہ فقرے اپنے اصل معنوں میں اُنہیں موقعوں پر بولے جاتے ہیں جن میں یہ پہلی بار استعمال ہوئے تھے۔ اُن کے استعمال کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جملے یا گفتگو کے آخر میں اس طور پہ ٹانک دیئے جاتے ہیں کہ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا"

اس مختصر گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل کا زباندانی سے بہت گہرا تعلق ہے معلم کو انہیں پوری طرح سمجھنا چاہئے اور ان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر اُن کے معنی اور استعمال پر توجہ دینی چاہئے۔

نظم کی تدریس اور معلم کی شخصیت

زبان کی تدریس میں سب سے مشکل تدریس، شاعری یا نظم کی تدریس ہے، اس میں معلم کی شخصیت، نظم اور شاعر دونوں سے اہم تر ہو جاتی ہے، اس لئے کہ باذوق معلم کے بغیر یہ دونوں چیزیں طلبہ کی نظر میں بے وقعت ہی رہتی ہیں، یہ دراصل معلم کی شخصیت ہوتی ہے جو شعر کے باریک نکتوں کو طلبہ کے سامنے اُجاگر کرتی ہے۔ یہی نہیں معلم اپنی ذہانت و شخصیت کی مدد سے نظم کے تاثر اور معنی کو طرح طرح سے اُبھارتا ہے، تشبیہ، استعارے، تلمیحات و اشارات و کنایات نظم کی جان کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت کو طلبہ سے محسوس کرا لینے کا دار و مدار معلم کی ذات و صفات پر ہے، ایک خوش ذوق معلم، شعر کی زبان اور معنی دونوں پر طرح طرح سے غور کرتا ہے اور جو نکتے اُس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں وہ ان سب کو ایک ایک کرکے طلبہ پر اُجاگر کرتا ہے۔ معلم کا یہ طرزِ عمل، طلبہ میں شعر و سخن سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کو ابھارتا ہے اور اُن کے اندر سوئی ہوئی شاعرانہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے تدریس نظم کی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ معلم شعر و سخن کا خاصا ذوق رکھتا ہو۔ اس کا مطالعہ وسیع ہو وہ شعر کے حُسن و قبح پر کم و بیش نظر رکھتا ہو، شعر سے لطف لینا اور چٹخارے کے ساتھ اس لطف کو بیان کر دینے کی اس میں صلاحیت ہو۔ الفاظ کے

لغوی معنی ہی تک اُس کی نظر محدود نہ ہو بلکہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ شاعری میں الفاظ کا مصرف حقیقی معنوں سے کہیں زیادہ مجازی معنوں میں ہوتا ہے، بطور مثال اُردو کا ایک مشہور شعر دیکھیئے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس شعر میں غزالاں، مجنوں، دوانہ اور ویرانہ کے حقیقی معنوں کی مدد سے شعر کا مفہوم نہیں نکالا جاسکتا یہ الفاظ بطور استعارہ وتشبیہ استعمال ہوئے ہیں، یہ شعر موزوں عظیم آبادی کا ہے اور انگریزوں کے مقابلے میں نواب سراج الدولہ والیِ بنگال کی شکست پر کہا گیا ہے اس شعر میں غزالاں سے مراد، سراج الدولہ کے جانباز سپاہی اور ساتھی ہیں۔ مجنوں اور دوانہ سے مراد خود سراج الدولہ ہے، "ویرانہ" سرزمین بنگال کی نمائندگی کرتا ہے۔ دیکھا آپ نے اس شعر کا پس منظر اور مطلب کہاں سے کہاں جا پہونچا۔ یہی صورت اکثر اشعار کی ہوتی ہے خاص طور پر غزل کے اشعار نہایت معنی خیز ہوتے ہیں۔ شعر کے الفاظ بظاہر کچھ ہوتے ہیں لیکن غور کرنے سے اُن کی تہہ میں عجیب و غریب معنی چھپے ہوتے ہیں، ان معنوں تک معلم کی رسائی نہ ہو تو اشعار کا پڑھانا نہ پڑھانا برابر ہے مناظر قدرت اور بیانیہ نظموں کا پس منظر بھی اکہرا نہیں ہوتا، اُن نظموں کے پس منظر میں سینکڑوں افق، متعدد واقعات اور رنگا رنگ تصورات ہوتے ہیں۔ اچھا معلم ان سب کو اپنے مطالعہ اور ذوق وشوق کی مدد سے دریافت کرلیتا ہے اور اپنے طلبہ کو بھی محسوس کراتا ہے۔ دراصل یہی شاعری کی تدریس کا مقصد ہے۔ جذبے کی جس شدت اور تخیّل کی جس بلند پروازی کے ساتھ نظم کہی گئی ہے جب تک معلّم، اُنہیں محسوس کرنے اور دوسروں سے محسوس کرانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ نظم کی تدریس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ معلم زبان وبیان اور فکر و خیال کے نکتوں سے آگاہی رکھتا ہو، یہ آگاہی محنت اور مسلسل مطالعہ چاہتی ہے، کاش اُردو کے معلمین اس طرف توجہ کریں۔

تشبیہ اور استعارہ

تشبیہ اور استعارہ سے کلام کو دو خاص فائدے پہونچتے ہیں ایک تو یہ کہ اُن کے استعمال سے کلام مختصر ہوجاتا ہے، دوسرے یہ کہ کلام کا حُسن و زور بڑھ جاتا ہے۔ شاعری میں اِن دونوں سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے اور شعر کے اکثر معنی

انہیں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں، معلم کو تشبیہ و استعارہ کے مصرف، اُن کے برمحل استعمال اور کلام پر اُن کے اثرات سے خود بھی واقف ہونا چاہئے اور طلبہ کو بھی بطور خاص اُن کا احساس دلانا چاہئے۔ تشبیہ، ایک چیز سے دوسری چیز کی مشابہت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں، جب کسی چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دیا جائے گا تو اُن میں کوئی مشترک خصوصیات ضرور ہوگی، یہ مشترک خصوصیات یا مشابہت ظاہری بھی ہوسکتی ہے باطنی بھی مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ

"حامد، شیر کی طرح بہادر ہے"

تو یہاں، حامد اور شیر کی شکل و صورت میں کوئی مشابہت ملحوظ نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی خصوصیت "بہادری" کے اشتراک کے سبب، دونوں کو ایک دوسرے سے مشابہ قرار دیا گیا ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ

"حامد بانس کی طرح لمبا ہے"

تو یہاں، بانس اور حامد کی باطنی خصوصیات نہیں بلکہ ظاہری خصوصیت یعنی لمبائی کو دونوں میں مشترک سمجھا جائے گا۔ تشبیہ کے چار خاص اجزاء ہوتے ہیں۔

(۱) مشبّہ :۔ جس سے تشبیہ دی جائے۔

(۲) مشبہ بہ :۔ جس کو تشبیہ دی جائے۔

(۳) وجہ شبہ :۔ جس کے سبب تشبیہ دی جائے۔

(۴) حرف تشبیہ :۔ جس سے ظاہر ہو کہ تشبیہ دی گئی ہے۔

مثلاً اس جملے میں

"بچہ پھول کی طرح خوبصورت ہے"

"بچہ" "مشبہ بہ ہے" "پھول" "شبہ" "ہے" "خوبصورتی" "وجہ شبہ ہے۔ اور" طرح "حرف تشبیہ ہے۔

استعارہ بھی حقیقتہً تشبیہ ہی کا ایک رُوپ ہے استعارہ کے اصلی معنی کسی چیز کو عاریتہً مانگ لینے کے ہیں۔ اصطلاحِ شاعری میں جب دو چیزوں کو تشبیہی تعلق کے سبب ایک ہی چیز قرار دے دیتے ہیں یا ایک چیز کی خوبی کو دوسری چیز کے لئے مستعار لے لیتے ہیں۔ تو اس تعلق کو استعارہ کہتے ہیں مثلاً حامد کو آتا ہوا دیکھ کر اگر یوں کہا جائے کہ

(۱) "شیر آرہا ہے"

(۲) "تاڑ چلا آرہا ہے"

تو صاف ظاہر ہے کہ شیر کے باطنی وصف "بہادری" کو اور "تاڑ" کے ظاہری وصف "لمبائی" کو عاریتہً حامد سے منسوب کر دیا گیا ہے، غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ استعارہ دراصل ایک طرح کی تشبیہ ہے فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ اور حرف تشبیہ سب کا بیان ہوا ہے، استعارہ میں صرف "مشبہ" کا ذکر آیا ہے اور اس سے مراد مشبہ بہ ہے۔

کنایہ، تلمیح اور اصطلاح کا مفہوم و مصرف

شعر و ادب کی زبان میں کنایہ، تلمیح اور بعض اصطلاحات سے بھی اکثر کام لیا جاتا ہے یہ چیزیں کلام میں اختصار و ایجاز کے ساتھ حسن و تاثیر بھی پیدا کرتی ہیں۔

کنایہ کے لغوی معنی پوشیدہ بات کے ہیں، اصطلاح ادب میں کنایہ، ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو صفت کا کام کرتا ہے لیکن اس کے ذریعے خود بخود موصوف ذہن میں اُبھر آتا ہے مثلاً

کمر خمیدہ، سفید ریش، شتر بے مہار

جب کسی شخص کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوں گے تو ان کے توسط سے ذہن خود بخود، بوڑھے اور آوارہ کے معنوں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ یعنی یہ الفاظ کنایہ ہیں "بڑھاپے" اور "آوارہ گردی" کا

تلمیح کے لغوی معنی، ملاحت پیدا کرنے یا نمکین کرنے کے ہیں۔ جس طرح کھانے میں نمک کی مقدار اگرچہ بہت معمولی ہوتی ہے پھر بھی کھانے کے ذائقہ کا مدار اسی پر ہوتا ہے بالکل اسی طرح کلام میں تلمیح کا استعمال چند لفظوں میں واقعات اور معنی کا سمندر بند کر دیتا ہے۔

تلمیح سے ایسے الفاظ یا فقرے مراد ہوتے ہیں جو اپنے پس منظر میں کوئی تاریخی، نیم تاریخی، یا افسانوی واقعہ رکھتے ہیں۔ مثلاً

ربّ ارنی۔ ید بیضا۔ کوہ طور۔ شق القمر۔ نار نمرود، وغیرہ کے الفاظ، لغوی معنی سے الگ اپنے اپنے پس منظر میں ایک لمبی چوڑی داستان رکھتے ہیں، جب تک کسی کو یہ داستان نہ معلوم ہو وہ ان الفاظ سے نہ کوئی لطف اُٹھا سکتا ہے اور نہ معنی سمجھ سکتا ہے اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جب کسی شعر یا نثر پارے میں کوئی تلمیح نظر آئے تو اس کے پسِ منظر کی پوری وضاحت

کی جائے اور طلبہ کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ تلمیح کی مدد سے شاعر یا نثر نگار نے کس طرح اپنے کلام کو معنی خیز اور جامع بنا دیا ہے۔

اصطلاح، جب کوئی خاص گروہ کسی علم وفن کے سلسلے میں کسی مفرد یا مرکب لفظ کو اُس کے اصلی معنی کے سوا، کسی اور معنی میں استعمال کرتا ہے تو وہ لفظ اُس گروہ اور اُس علم وفن کی اصطلاح کہلاتا ہے مثلاً

مطلع - رباعی - تخلص، بحر، تقطیع وغیرہ

اُردو شعر و ادب کی اصطلاحات ہیں، یہ الفاظ اپنے اصلی معنی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معنی بھی رکھتے ہیں جن پر ماہرینِ علم وفن کا اتفاق ہے مثلاً

مطلع کے لغوی معنی ہیں طلوع ہونے یا نکلنے کی جگہ، لیکن اصطلاح میں غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔

رباعی کے اصلی معنی ہیں چار والی، لیکن اصطلاح میں شاعری کی اُس صنف کو کہتے ہیں جس میں صرف چار مصرعے مخصوص وزن پر ہوتے ہیں۔

تخلص، اصطلاحِ ادب میں اس مختصر نام کو کہتے ہیں جسے شاعر اپنے کلام میں خاص طور پر غزل کے مقطع میں استعمال کرتا ہے۔

بحر، سے مراد مخصوص ارکان کا ایسا مجموعہ ہے جس کے ذریعہ شعر کا وزن معلوم کرتے ہیں مثلاً مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن، بحر ہزج کے ارکان ہیں۔

تقطیع کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا لیکن اصطلاح میں کسی مصرعہ یا شعر کو اجزا میں تقسیم کر کے کسی خاص بحر کے ارکان کے مطابق کرنے کو تقطیع کہتے ہیں مثلاً یہ مصرع

"نہیں جاتی نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی" (جگر)

بحر ہزج میں ہے اور چار بار مفاعیلن کہنے سے مصرعے کا وزن پورا ہو جاتا ہے، اس کی تقطیع کی صورت یہ ہوگی

نہیں جاتی	نمودِ سو	زِ پنہانی	نہیں جاتی
مفاعیلن	مفاعیلن	مفاعیلن	مفاعیلن

عربی کے بعض الفاظ کا تلفظ

عربی کے بے شمار الفاظ، اُردو میں مستعمل ہیں، ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں دخیل الفاظ کہنا چاہیئے یعنی اُردو والوں نے اُن کے تلفظ اور معنی میں کہیں کہیں تصرف کرلیا ہے اور وہ خالص عربی تلفظ یا اپنے اصل معنوں میں استعمال نہیں ہوتے، ہم اس قسم کے الفاظ کی بحث پچھلے ابواب میں کرچکے ہیں لیکن بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو اپنی اصل تلفظ ہی کے ساتھ مستعمل ہیں۔ اس لئے معلم کو اُن کے تلفظ سے باخبر رہنا چاہیئے۔

اُردو خواں طبقے کے لئے عربی کے جن لفظوں کے تلفظ میں خاص طور پر دشواری ہوتی ہے وہ عربی کے تین حرفی الفاظ ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی کے تین حرفی الفاظ کم از کم چھ تلفظ کے ساتھ اُردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ذیل کے الفاظ کو دیکھئے۔

(۱) عَمَلْ۔ خَبَرْ۔ کَرَمْ۔ شَجَرْ۔ غَضَبْ وغیرہ میں پہلے دو حرف زبر کے ساتھ متحرک ہیں اور آخری حرف ساکن ہے۔

(۲) وَقْتْ، فَضْلْ۔ صَبْرْ۔ ضَبْطْ۔ نَقْدْ وغیرہ میں صرف پہلا حرف زبر کے ساتھ متحرک ہے باقی دونوں ساکن ہیں۔

(۳) عِلم، فِکر، جِہل، حِفظ، حِرص وغیرہ میں صرف پہلا حرف زیر کے ساتھ متحرک اور آخری دونوں ساکن ہیں۔

(۴) عُمق، حُسن، عُرف، غُسل، ظُلم وغیرہ میں پیش کے ساتھ پہلا حرف متحرک اور آخری دو ساکن ہیں۔

(۵) عُمَرْ، اُفَقْ، کُہَن، وغیرہ میں پہلے دو حرف متحرک ہیں لیکن پہلے پر پیش اور دوسرے پر زبر ہے، تیسرا ساکن ہے۔

(۶) نَجِس، نَفِی، وَحِی وغیرہ میں بھی پہلے دو متحرک ہیں، لیکن پہلے پر زبر اور دوسرے پر زیر ہے تیسرا حرف یہاں بھی ساکن ہے۔

اس قسم کے الفاظ جب اُردو میں آتے ہیں تو عربی سے ناواقفیت کی بنا پر ہمارے معلمین، اکثر ان کے تلفظ میں غلطیاں کرتے ہیں اور طلبہ کو بھی اُن کا تلفظ غلط بتاتے ہیں اس سے بچنے کے لئے ضروری

ہے کہ معلم کو جہاں شبہ ہو، وہاں لغت سے رجوع کرے اور تصدیق کئے بغیر کسی لفظ کا تلفظ طلبہ کے گوش گذار نہ کرے۔

اُردو میں فارسی اور عربی ترکیبیں | اُردو میں فارسی اور عربی کے بہت سے مرکب اضافی بھی مستعمل ہیں، عربی کے کم اور فارسی کے بکثرت ہیں۔ مثلاً

علم الابدان، اور جنت الفردوس، عربی کے مرکبات ہیں ان میں "ال" اضافت کے طور پر یعنی کا، کے، اور کی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، "ال" عربی کے لئے مخصوص ہے اور اس کا استعمال دو عربی الفاظ ہی کے ساتھ ہوگا، کسی فارسی یا ہندی لفظ کے ساتھ عربی کا الف لام نہیں لگا سکتے، بعض ترکیبیں مثلاً فوق البھڑک، کثرت استعمال سے صحیح سمجھی جائے گی ورنہ اصولی طور پر غلط محض ہے۔ اس قیاس پر دوسری ترکیبوں کا بنانا درست نہ ہوگا۔

فارسی تراکیب مثلاً

حکمِ حاکم، قہرِ خدا، زخمِ دل، نوکِ قلم، فخرِ خاندان وغیرہ میں پہلے لفظ کے نیچے جو زیر آیا ہے وہ کا، کے، کی معنی دیتا ہے اور اُردو میں اُن کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرا لفظ پہلے آجائے گا اور پہلا حرف کا کے بعد آخر میں آئے گا یعنی اوپر کے مرکبات کی شکلیں۔

حاکم کا حکم، خدا کا قہر، دل کا زخم، قلم کی نوک، خاندان کے فخر میں بدل جائیں گے، فارسی کی ترکیبیں، اُردو میں بے شمار ہیں اور آئے دن بنتی رہتی ہیں۔ فارسی ترکیب کے لئے ضروری ہے کہ دونوں لفظ یا عربی ہوں یا فارسی یا ایک عربی ہو اور ایک فارسی یعنی فارسی ترکیب عربی و فارسی الفاظ ہی کے ساتھ استعمال ہو سکتی ہے۔ کسی ہندی یا علاقائی زبان کے الفاظ کے ساتھ، فارسی الفاظ کی ترکیب درست خیال نہ کی جائے گی مثلاً

سایۂ پہاڑ، سپوتِ حامد، ذائقۂ پھل

وغیرہ کی ترکیبیں غلط سمجھی جائیں گی، وجہ یہ ہے کہ ان میں پہاڑ، سپوت، اور پھل کے الفاظ ہندی کے ہیں اور ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی یا عربی الفاظ کی ترکیب جائز نہیں۔ اس قسم کی بعض ترکیبیں مثلاً "لبِ سڑک" اُردو میں مستعمل ہے، یہ غلط "عام فصیح" کے تحت آتی ہے ورنہ اصولاً غلط ہے، بعض قدیم شعراء مثلاً وَلی دکنی کے یہاں

بیڑۂ پان اور نقشِ چرن، وغیرہ کی ترکیبیں ملتی ہیں لیکن یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب اُردو قواعد کے اصول مرتب نہ ہوئے تھے۔ آج جبکہ ہر چیز کے اصول، اُردو قواعد نے طے کر دیئے ہیں، اس طرح کی ترکیبیں درست نہ سمجھی جائیں گی۔

اخذِ عُنوان یا اخذِ موضوع زیرِ تربیت اساتذہ بعض اوقات، تمہیدی سوالات کے ذریعہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ طلبہ کی زبان سے کسی نہ کسی طرح زیرِ تدریس سبق کا عنوان کہلوادیں، جیسے ہی طلبہ "عُنوان" کا نام لیتے ہیں معلم فوراً اعلان کر دیتے ہیں "اچھا، آج ہم آپ کو فلاں سبق پڑھائیں گے"

یہ طریقہ حد درجہ مہمل ہے، تمہید کا مقصود، طلبہ سے سبق کا "عنوان" اگلوانا نہیں بلکہ سبق کے نفسِ مضمون اور موضوع کی طرف اُنہیں رجوع کرنا ہے۔ عنوان اخذ کرانے کی کوشش میں بعض معلمین کی تدریس میں بڑی مضحکہ خیز چیزیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک صاحب چوتھی جماعت کے بچوں کو کسی خاص عنوان کا ایک سبق پڑھا رہے تھے۔ تمہیدی سوالات کے تحت پہلے اُنہوں نے پوچھا "آپ میں سے لاہور کس کس نے دیکھا ہے؟

چند طلبہ نے ہاتھ اُٹھایا، اب انہوں نے سوال کیا۔

"لاہور میں آپ نے کیا کیا چیزیں دیکھیں۔"

بعض نے شاہی مسجد کا نام لیا، کسی نے شالامار باغ کا، کسی نے قلعے کا اور کسی نے جہانگیر کے مقبرے کا، آخری جواب سے معلم صاحب قدرے خوش ہوئے اور سوال کیا۔

"جہانگیر کے مقبرے میں آپ نے کیا دیکھا۔"

بچوں نے اینٹ، پتھر، کھجور اور آم کے درخت، گھاس پات، مزار، پتھر کے دروازے، پارک اور میدان سے لے کر گنبد تک ساری چیزیں گنوادیں۔ لیکن ان میں سے شاید کوئی جواب اُن کے مطلب کا نہ تھا اس لئے معلم صاحب پریشانی محسوس کرنے لگے سبق کے نگراں کی حیثیت سے میں خود بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا پڑھانا چاہتے ہیں۔ آخر کار اُنہوں نے سوال کیا۔

گنبد کے اوپر آپ نے کیا دیکھا؟

لڑکے مختلف جوابات بتاتے رہے، معلم صاحب کسی سے مطمئن نہ ہوئے نہ کسی جواب کو صحیح کہتے تھے

نہ غلط۔ پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اتفاق سے ایک لڑکے نے کہا "کبوتر" کبوتر کے لفظ کا طالب علم کے منہ سے نکلنا تھا کہ معلم صاحب خوش ہو کر بولے

اچھا بچو! آج ہم آپ کو "کبوتر" کا سبق پڑھائیں گے۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آئی اور اندازہ ہوا کہ بعض معلمین طلبہ کو نفسِ مضمون یا موضوع سے قریب تر لانے کے بجائے، عنوان، اخذ کرانے کی بے ہودہ کوشش میں کیسی کیسی مضحکہ خیز تمہیدیں باندھتے ہیں۔ حالانکہ "عنوان" کا اخذ کرانا بالکل بے معنی بات ہے "عنوان" سے ہرگز یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ کسی خاص سبق کے اندر کس قسم کی اور کیا کیا باتیں بیان کی گئی ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل عنوانات کو لے لیجئے۔

(۱) ملّا اور شاعر

(۲) بچے

(۳) شہزادے کا بازار میں گھٹنا

(۴) بجن بی

(۵) ابرِ کرم

(۶) راوی میں کشتی

یہ اسباق نویں اور دسویں جماعت کے نصاب میں شامل ہیں اور علی الترتیب، علامہ اقبال پطرس بخاری، حسن نظامی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور حفیظ جالندھری کے لکھے ہوئے ہیں ان اسباق میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اور جس نہج اور جس غرض سے بیان کی گئی ہیں، اُن کے متعلق محض عنوانات سے کوئی اندازہ کرنا مشکل ہے اس لئے طلبہ کے ذہنوں کو عنوان کی طرف لے جانے کی کوشش بے معنی بات ہوگی، ہاں ان اسباق میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اُس کی طرف بچوں کے ذہن کو رجوع کرنے کے لئے تمہید سے کام لیا جائے تو البتہ معقول بات ہوگی۔

عربی کے بعض الفاظ اور اُن کے معانی

عربی مصادر کے ساتھ ساتھ اُن سے نکلے ہوئے بہت سے "اسم مشتق" بھی اُردو میں مستعمل ہیں، ان کے معنی ذہن نشین کرانے کے لئے معلم کو معلوم ہونا چاہئے کہ عربی میں الفاظ سازی کے لئے خاص خاص اصول اور قاعدے مقرر ہیں اگر ان اصولوں اور قاعدوں سے مدد لے لی جائے تو تھوڑے

وقت میں بہت سی باتیں طلبہ کو بتائی جا سکتی ہیں، مثلاً چند قاعدے یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) صَابِر، جَاہِل، عَالِم، شَاعِر، غَالِب، حَامِد، فَاعِل وغیرہ چار حرف کے الفاظ ان سب میں دوسرا حرف الف ہے اور تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے، اب اگر ان مثالوں کے ذریعہ بچوں کو بتا دیا جائے کہ اس قسم کے سارے الفاظ اسم فاعل ہیں یعنی کسی نہ کسی کام کے کرنے والے ہوتے ہیں تو بچوں کو اخذ معنی میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

(۲) مصدر، مَشرِق، مَقصد، مَنظر، مَقتل وغیرہ بھی عربی کے چار حرفی الفاظ ہیں لیکن ان سب کا پہلا حرف م ہے اور اُس کے اُوپر زبر ہے، یہ سب اسم ظرف ہیں یعنی جگہ یا وقت کے معنی دیتے ہیں۔ اس اصول پر طلبہ بہت سے عربی الفاظ کے معنی خود بخود معلوم کر لیں گے۔

(۳) مُسلِم، مُنعِم، مُحرِّک، مُقرِّر، مُقابِل، مُجاہِد، مُتعلِم، مُتفکِر، مُتبادِل، مُتخالِف، مُنحصِر، مُنکسِر، مُنتشِر، مُنہدِم وغیرہ کی قسم کے بے شمار عربی الفاظ اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ اِن الفاظ میں حروف کی تعداد یکساں نہیں ہے۔ کسی میں چار حرف ہیں، کسی میں پانچ اور کسی میں چھ لیکن دو باتیں سب میں مشترک ہیں ایک یہ کہ ان سب کا پہلا حرف "م" مضموم ہے (یعنی میم پر پیش یا ضمہ ہے) اور آخری حرف سے پہلے والا حرف مکسور ہے (یعنی اُس کے نیچے زیر یا کسرہ ہے) اس قسم کے سارے الفاظ بھی اسم فاعل یعنی کسی نہ کسی کام کو انجام دینے والے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان لفظوں کے آخری حرف سے پہلے والے حرف کو مکسور کے بجائے مفتوح کر دیا جائے۔ (یعنی زیر کے بجائے زبر لگا دیا جائے) تو ان لفظوں کے معنی بالکل الٹ جائیں گے اور ان کی حیثیت اسم فاعل کے بجائے اسم مفعول کی ہو جائے گی۔ اب ان کے معنی کام کرنے والے کے نہ ہوں گے بلکہ ان پر کام کا اثر پڑے گا مثلاً "مُنتظِر" کو اگر ظ کے زیر کے ساتھ پڑھیں تو معنی ہونگے "انتظار کرنیوالا" اور اگر ظ کو زبر کے ساتھ پڑھیں تو مطلب ہوگا "انتظار کیا ہوا" یعنی جس کا انتظار کیا گیا ہو۔

اِن نکتوں کو سمجھانے کے لئے طلبہ کو عربی پڑھانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر انہیں چٹکلے کے طور پر یہ باتیں بتا دی جائیں تو وہ لغت اور معلم کے بغیر بھی بہت سے الفاظ کے تلفظ اور معنی ذاتی غور و فکر سے اخذ کر لیں گے۔

تدریسِ نثر و نظم کے اہم اقدامات و اشارات

نثر و نظم کی تدریس کے مقاصد چونکہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اس لئے ان کے طریقۂ تدریس میں بھی فرق ہونا ضروری ہے۔ نثری سبق کی تدریس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں صحیح اُردو بولنے پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرکے انہیں تقریری و تحریری اظہار کرنے کے اہل بنایا جائے ان کی ذہنی نشو و نما کی جائے اور زیر تدریس سبق کو ان کے ذہن نشین کرایا جائے۔ لیکن نظم کی تدریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ بچوں کے جذبات کو متحرک کیا جائے ان میں نظم خوانی کا شوق پیدا کیا جائے۔ الفاظ کے وزن و آہنگ کا احساس دلایا جائے شعر و ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔ ان کی قوت تخیل کو فروغ دیا جائے اور قوت تخلیق کو اُبھارا جائے اور بچوں پر کم و بیش وہی جذبات و احساسات طاری کرنے کی کوشش کی جائے جو نظم لکھتے وقت شاعر کے دل و دماغ پر جاری و ساری تھے۔ یعنی نظم کی تدریس کا مقصد نثر کی طرح بچوں کے لئے صرف الفاظ و معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ نظم کی تدریس کا اولین مقصد بچوں کی حسِ لطیف کو بیدار کرنا۔ ان کی قوتِ متخلیہ کو ابھارنا۔ ان کے ذوق جمال کو حرکت میں لانا اور خوبصورت چیزوں کو محسوس کرنے اور ان سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ مقاصد کے اس فرق نے نظم و نثر کی تدریس میں نمایاں فرق ڈالا ہے۔ پھر بھی چونکہ بہ حیثیت مجموعی نظم کی تدریس کے اقدامات وہی ہیں جو نثر کے ہیں اس لئے ہم دونوں کا ایک ساتھ ذکر کریں گے اور جہاں جیسی ضرورت ہوگی وہاں نظم و نثر کے طریقہ کار کو واضح کرتے چلیں گے۔

اُردو تدریس کے اہم اقدامات مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ تمہید

۲۔ اعلان سبق

۳۔ قرأت معلم

۴۔ قرات متعلم

۵۔ صحت تلفظ

۶۔ اخذ معنی ۔ (نظم کے سبق میں اس اقدام کی چنداں ضرورت نہیں ۔ مناسب یہ ہوگا کہ الفاظ کے معنی ایک چارٹ کے ذریعے نظم کے آغاز سے پہلے ہی طلبہ کو بتا دیئے جائیں تاکہ وہ نظم سے پوری طرح لطف اٹھاسکیں)

۷۔ تفہیم و استحسان

۸۔ اعادہ

۹۔ گھر کا کام

تمہید :- تمہید کے لغوی معنی فرش بچھانے یا کسی کے استقبال کی تیاری کرنے کے ہیں ۔ اس جگہ تمہید سے تقریر یا تحریر کا وہ عمل مراد ہے جو بچوں کی سابقہ معلومات اور زیر تدریس سبق میں رابطہ پیدا کرتا ہے ۔ تمہید کے ذریعے بچوں کی معلومات کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔ تدریسی اقدامات میں تمہید کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ۔ اور کامیاب تمہید کو عموماً سبق کی کامیابی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے یہ جو کسی نے کہا ہے کہ جس کام کا آغاز اچھا ہوتا ہے بالعموم اس کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے ۔ کچھ غلط نہیں ہے ۔ اچھی تمہید فی الواقع سبق کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد کرتی ہے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر بچے شروع میں سبق سے دلچسپی لیتے ہیں تو پھر ان کا انہماک ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے ۔ اور پورے سبق کو بڑے غور و خوض اور دلچسپی سے سنتے ہیں ۔ اس کے برعکس بے ربط اور خشک ۔ بے کیف اور غیر دلچسپ تمہید بچوں کو سبق سے نفرت اور الجھن پیدا کر دیتی ہے ۔ اس لئے ہر سبق کی تمہید کے لئے معلم کو خاص محنت اور توجہ سے کام لینا چاہئے ۔ تمہید کی ترتیب کے لئے کوئی خاص اصول متعین نہیں کئے جاسکتے ۔ ذہین اور طباع معلم ہر سبق کے لئے دلچسپ تمہید تیار

کرسکتا ہے ۔ تصویریں، ماڈل ۔چارٹ ۔خاکہ ۔نقشہ ۔کہانی ۔تصویری کہانی اور سوال و جواب غرض ہر چیز سے تمہید میں مدد لی جاسکتی ہے اور معلم ضرورت و خواہش کے مطابق ان میں سے کسی بھی طریقہ کار یا مختلف اشیائے امدادی سے مدد لے سکتا ہے ۔شرط صرف یہ ہے کہ تمہید میں جو چیزیں پیش کی گئی ہوں یا جو چیزیں بطور سوال سامنے لائی گئی ہوں وہ بچوں کی دل چسپی ان کی معلومات اور زیر تدریس سبق کے نفس مضمون سے گہرا تعلق رکھتی ہوں لیکن تمہید پر زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں ہے ۔

تمہید سبق کی طرف رجوع کرنے کا ایک ذریعہ ہے ۔ اس لئے اسے سبق کا جزو خیال نہ کرنا چاہئے ۔زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ تمہید کے لئے دینا چاہئے اور اس کے بعد اصل سبق کا آغاز کر دینا چاہئے ۔ اس جگہ ایک اور بات کہنی ضروری ہے ۔بعض معلمین تمہید سے سبق کا عنوان اخذ کرانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں ۔ یہ طریقہ غلط ہے ۔عنوان کو نہیں بلکہ نفس مضمون کو ذہن میں رکھنا چاہئے ۔ اور عنوان اخذ کرانے کی کوشش میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے ۔

اعلان سبق :۔تمہید کے بعد جب یہ اندازہ ہو جائے کہ طلبہ تدریس کے لئے ذہنی طور پر آمادہ ہو گئے ہیں تو سبق کا اعلان کر دینا چاہئے اور طلبہ سے کہنا چاہئے کہ وہ اپنی درسی کتاب کا فلاں سبق کھولیں ۔ اس جگہ معلم کو سبق کے نفس مضمون کی اہمیت پر مختصر روشنی ڈالنا چاہئے ۔ مثلاً اگر " اقبال " کے عنوان کا سبق پڑھانا ہے تو سبق کی قرأت سے پہلے اقبال کی شخصیت اور شاعری کا مختصر تعارف طلبہ سے کرایا جائے ۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو چند لفظوں میں اجاگر کیا جائے اور ان کی قومی اور ملی خدمات کی طرف توجہ دلائی جائے اُن کی زندگی اور سیرت کے بعض ایسے دلچسپ اور اہم پہلوؤں کو سامنے لایا جائے جو طلبہ کی دلچسپی کا سبب ہوں ۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طلبہ کو سبق کی اہمیت کا احساس ہو جائے گا اور وہ سبق کو ذوق و شوق کے ساتھ پڑھنے کو تیار ہو جائیں گے ۔

قرأتِ معلم :۔ اعلان سبق کے بعد درس کا باقاعدہ آغاز کیا جائے ۔ دوسری اور تیسری جماعت تک کے طلبہ کے لئے زیادہ مفید یہ ہے کہ پہلے چند منٹ ان سے خاموش مطالعہ کرایا جائے

اس کے بعد معلم نمونے کے طور پر سبق کی قرأت کرے۔ لیکن چوتھی اور پانچویں جماعت کے بعد خاموش مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ معلم کو نمونۃً قرأت پیش کرنا چاہئے۔ نمونے کی قرأت کا اصل مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں صحیح اور مناسب و موثر لب و لہجے میں اردو پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس لئے ضرورت ہے کہ معلم کی قرأت نہایت موثر ہو۔ اس کا لب و لہجہ۔ رفتار قرأت۔ آواز اور تلفظ سب درست ہوں۔ معلم کی قرأت جس قدر مناسب، وہ موثر ہوگی طلبہ اسی قدر درس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس کے برعکس اگر معلم نے خود صحت تلفظ اور آواز کے اتار چڑھاؤ اور انداز قرأت میں احتیاط سے کام نہ لیا تو مثالی قرأت کا مقصد فوت ہو جائے گا اور اس سے فائدہ کی بجائے طلبہ کو نقصان پہونچے گا۔ کامیاب مثالی قرأت سے صرف یہی نہیں کہ طلبہ کو تلفظ کی درستگی۔ الفاظ کی تفہیم۔ اور مختلف قسم کی عبارتوں کو موثر لب و لہجہ سے پڑھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ نفس مضمون کو ذہن نشین کرانے میں بھی بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

تدریس نظم کی کامیابی کا سارا انحصار مثالی قرأت پر ہے۔ نظم کا پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے بعض معلمین نظم پڑھنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں اور نظم پڑھانے کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن بعض معلمین نظم پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ نظم پڑھنے میں تحت اللفظ یا ترنم دونوں طریقوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ بعض نظمیں تحت اللفظ پڑھنے کی ہوتی ہیں اور ترنم سے پڑھنے میں ان کا اثر کم ہو جاتا ہے یا زائل ہو جاتا ہے بعض نظموں کا اثر ترنم سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس لئے معلم کو سوچ سمجھ کر نظم پڑھنے کا انداز اختیار کرنا چاہئے۔ یقیناً کامیاب نظم خوانی کا مفہوم یہ ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر تھوڑی دیر کے لئے کم و بیش وہی فضا طاری ہو جائے جو نظم لکھتے وقت شاعر پر طاری تھی۔

قرأتِ متعلم:۔ مثالی قرأت کے بعد معلم کو چاہئے کہ وہ متعدد طلبہ سے، پڑھی ہوئی نظم یا نثر کو پڑھوائے۔ بعض نثری اسباق اور نظمیں مکالمہ یا ڈرامہ کی صورت میں ہوتی ہیں۔ انہیں جماعت کے سامنے مکالمہ یا ڈرامہ ہی کے انداز میں مختلف طلبہ سے ایک ساتھ پڑھوانا مناسب ہوگا۔ نظم خوانی کے لئے چھوٹی جماعتوں میں گروہ بندی اور بھی مفید ہوگی۔ اس لئے کہ طلبہ ساتھ مل کر گانے یا نظم پڑھنے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب تک طلبہ کو باقاعدہ تربیت نہ دی جائے، تدریس کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ثانوی جماعتوں میں انفرادی نظم خوانی ہی طلبہ کے

مفید ہوگی ۔ اگر طلبہ نظم یا نثر کی قرأت میں ناکامیاب نظر آئیں تو معلم کو دوبارہ سہ بارہ نمونے کے طور پر قرأت کرنی چاہئے لیکن پڑھنے کے دوران میں طلبہ کو بار بار ٹوکنا یا منع کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ قرأت کے بعد بچوں کی توجہ دوبارہ مثالی قرات کی طرف مبذول کرانی چاہئے اور پھر اس کی تقلید پر زور دینا چاہئے ۔

صحت تلفظ :۔ طلبہ کی قرأت کے وقت ان کے تلفظ اور لب و لہجے پر خاص نظر رکھنی چاہئے لیکن دورانِ قرأت طلبہ کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنا یا روکنا درست نہیں بلکہ قرات کے بعد ان کی توجہ غلطیوں کی طرف مبذول کرانا چاہئے ۔ تلفظ کی درستگی کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن لفظ کا تلفظ طلبہ غلط ادا کریں ، انہیں معلم کو تختۂ سیاہ پر خاموشی سے لکھتے رہنا چاہئے یا اشارات کی کتاب میں نوٹ کر لینا چاہئے تاکہ ساری غلطیاں حافظے میں رہیں اور ہر تلفظ کی صحت کرائی جا سکے ۔ بعد ازاں جنہ طلبہ نے غلطیاں کی تھیں پہلے انہیں سے ان الفاظ کو پڑھوایا جائے ۔ اگر یہ پھر غلطی کریں تو ان پر اعراب لگا کر پڑھوایا جائے اور مشق کے لئے کئی طلبہ سے الگ الگ ان الفاظ کو بلند آواز سے پڑھوا کر سارے طلبہ کے گوش گزار کرایا جائے ۔ ہر طالب علم کی غلطیاں الگ الگ انفرادی طور پر درست کرانا چاہئے ساری غلطیوں کو تختۂ سیاہ پر ایک ساتھ جمع کر کے ان کی اصلاح کرنا طلبہ کے ذہن میں الجھن پیدا کر سکتی ہے ۔

اخذ معنی :۔ چونکہ اردو تدریس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا جائے اس لئے نئے الفاظ کے معنی اور استعمال پر زور دینا نہایت ضروری ہے ۔ خاص طور پر نثری اسباق میں الفاظ کے معنی کی تفہیم خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ الفاظ چونکہ مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے معنی اخذ کرانے کے طریقے بھی جداگانہ ہوں گے ، ہم نے ان طریقوں پر "الفاظ کے معنی کیسے بتائیں" کے عنوان سے الگ اسی کتاب میں مفصّل بحث کی ہے ۔

لیکن نظم کی تدریس میں الفاظ کے معنی پر زور دینا مناسب نہیں ۔ نظم کی تدریس کا خاص مقصد چونکہ طلبہ کے جذبات کو متحرک کرنا شعر و سخن کا ذوق اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور نظم خوانی سے انہیں لطف اندوز کرانا ہے اس لئے دوران تدریس الفاظ کی تشریح ان کی ساخت اور ان کے معنی کا مسئلہ چھیڑ کر درس کو بے کیف بنانا کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔ اگر نظم میں چند الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم واضح کرنا ضروری ہے تو ان کے لئے معلم مترادف الفاظ سے مدد لے سکتا ہے ۔ مثلاً نظم میں "تو انگر" کا لفظ آیا ۔ اس

لفظ کے معنی معلم باتوں باتوں میں "مالدار" یا دولت مند کہہ کر آسانی سے واضح کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشکل الفاظ کے معنی تدریس سے پہلے طلبہ پر واضح کر دیئے جائیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں الفاظ کا چارٹ مع معنی جماعت میں تدریس کے وقت آویزاں کر دیا جائے تاکہ طلبہ دیکھ لیں۔ یا ان الفاظ کو معنی سمیت تختہ سیاہ پر لکھ دیا جائے اور طلبہ سے کہا جائے کہ وہ ان پر ایک نظر ڈال لیں۔ بعدازاں تدریس کا آغاز کیا جائے۔

تفہیم و استحسان :۔ نفس مضمون کو توضیحی اشیاء۔ کہانی۔ مترادفات واقعات اور تقریر کے ذریعے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ تقریری طریقہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ اگر اسے اختیار کرنا ضروری ہو تو مناسب سوالات کے ذریعے طلبہ کو درس میں شریک رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ورنہ اگر صرف معلم بولتا رہا اور طلبہ کو اس میں عملاً شریک نہ کیا گیا تو سبق بے جان ہو جائے گا۔ اگر طلبہ کی معلومات، دلچسپی، عمر، ماحول، جبلی میلانات اور ذوق و شوق کا لحاظ رکھ کر مختلف اشیاء ماڈل۔ چارٹ۔ تصویر۔ خاکے۔ نقشے۔ مترادف تصویری کہانیاں، واقعات۔ امثال، اشعار اور سوالات و جوابات کے ذریعے نفس مضمون کو سمجھانا چاہیئے۔ نظم کی تدریس میں تفہیم کے سوالات کے ساتھ ساتھ ایسے استحسانی سوالات بھی ہونے چاہئیں جن سے طلبہ کی معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے اور ان کی قوتِ متخیلہ کو ابھرنے کا بھی پورا موقع ملے۔ اس لئے بعض مرکبات، تشبیہات و استعارات کے متعلق سوالات کرنے ضروری ہیں۔

اعادہ :۔ اعادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا دہرانا۔ اس جگہ اعادہ سے ایسا اقدام مراد ہے جس میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ طلبہ زیرِ تدریس سبق کو پوری طرح ذہن نشین کر سکے ہیں یا نہیں اور اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اعادہ کے ذریعے اسے پورا کیا جائے۔ اعادہ میں سبق بہ حیثیت مجموعی طلبہ کے سامنے آجاتا ہے۔ اور پورے سبق کا خلاصہ ان کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے اعادہ میں سوالات بھی کئے جا سکتے ہیں اور سبق کو دوبارہ پڑھوایا بھی جا سکتا ہے تیسری جماعت تک مناسب یہ ہے کہ پورے سبق کی دوبارہ قرأت کرا دی جائے لیکن چوتھی اور پانچویں کے بعد خاص طور پر ثانوی جماعتوں میں سوالات اور جوابات کے ذریعہ ہی سبق کا خلاصہ تیار کرنا مناسب ہوگا۔ نظم کی تدریس میں نظم کا دوبارہ سنانا یا اسی مفہوم کی کوئی دوسری نظم پڑھوانا نہایت مناسب ہوگا۔ محض سوال و جواب

کے مرحلے پر جماعت کو چھوڑ دینا، نظم خوانی کے لطف کو زائل کرنا ہے اس لئے اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے

گھر کا کام :۔ آخر میں اگر تھوڑا بہت کام گھر کے لئے دے دیا جائے تو حرج نہیں ہے یہ کام ہمیشہ عملی نوعیت کا ہونا چاہئے۔ کہانی اور نظم کو یاد کر کے زبانی سنانے کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن گھر کا کام مختصر ہونا چاہئے۔

اشارات سبق :۔ سبق کے مذکورہ بالا اقدامات کی ترتیب و تنظیم کا نام اشارات سبق ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ زیر تدریس سبق کے متعلق تیاری کرنے اس کے مقاصد متعین کرنے۔ اس کے متعلق طلبہ کی سابقہ معلومات کا جائزہ لینے۔ آغاز کے لئے مناسب تمہید انتخاب کرنے۔ سبق کے استحضار و اعلان کی صورتوں پر غور و خوض کرنے۔ صحت تلفظ اور اخذ معنی کے طریقوں کو اپنانے نفس مضمون کی تفہیم اور اعادہ کی مختلف صورتوں کو پہلے سے طے کر لینے کا نام اشارات سبق ہے اشارات کی تیاری تدریس کے لئے نہایت ضروری ہے۔ سبق جس قدر اچھا تیار ہوگا اسی قدر کامیاب ہوگا۔ اشارات کی تیاری سے معلم میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ مختلف الفاظ اور فقرات کے لئے اسے لغت دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سبق کی ہر چیز مع تشریح و توضیح اس کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہے اس لئے اسے درس دینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ وہ بڑی آسانی سے درس کو دلچسپ اور مفید بنا لیتا ہے۔ دیکھا گیا ہے جو سبق تیار کر کے پڑھایا جاتا ہے وہ ہمیشہ طلبہ کی دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے اس کے برعکس غیر تیار شدہ سبق سے طلبہ کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اشارات کو تدریس کی کنجی سمجھنا چاہئے۔ اردو تدریس کے اشارات کس طور پر تیار کئے جائیں اس کے لئے بھی سخت اصول نہیں بنائے جا سکتے اچھے معلمین انہیں اپنے اپنے طور پر تیار کر سکتے ہیں۔ پھر بھی جن اقدامات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کا لحاظ رکھ کر مختلف جماعتوں کے لئے چند اسباق کے تدریسی اشارات بطور مثال اگلے صفحات میں دیئے جا رہے ہیں۔

نثر و نظم سے متعلق اشاراتِ سبق کے نمونے

(۱) **نثر**

تاریخ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۷۲ء

جماعت ہفتم

عنوان گذرا ہوا زمانہ

مضمون اُردو (نثر)

تدریسی اعانتیں ۱۔ سرسید احمد خان کی تصویر مع تعارف

۲۔ ڈراونی رات کے منظر میں بوڑھے کی تصویر

۳۔ بچوں کے اسکول جانے کی تصویر

۴۔ بوڑھے کے تخیل میں ماں باپ وغیرہ کی تصویر

۵۔ ادھیڑ عمر میں مسجدیں اور کنویں بنوانے کی تصویر

۶۔ بوڑھے اور دلہن کی تصویر

۷۔ لڑکے کو ماں کے گلے لگانے کی تصویر

۸۔ پلنگ سے لڑکے کے کودنے کی تصویر

سابقہ معلومات :۔ طلبہ اردو کے مختلف مضامین پڑھ چکے ہیں۔

مقاصد تدریس

مقاصد عام :۔ ۱۔ اردو زبان سے لگاؤ پیدا کرنا

۲۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرانا

۳۔ نئے الفاظ کے معنی اور ان کا استعمال بتانا۔

۴۔ صحیح بلند خوانی کی مشق کرانا

تمہیدی سوالات :۔ سرسید احمد خان کا مضمون "گذرا ہوا زمانہ" اس طرح پڑھانا کہ

طلبہ اس سے لطف اندوز ہوسکیں اور مضمون کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ یعنی وقت کی قدر اور قومی خدمت کا جذبہ ان میں پیدا ہو سکے۔

تمہیدی سوالات :۔ موضوع سے قریب تر لانے کے لئے مندرجہ ذیل جملے لکھ کر معلمہ طلبہ سے سوالات کریں گی۔

۱۔ احمد کل لاہور چلا گیا   ۲۔ سلیم اسکول سے واپس آگیا

۳۔ پچھلے سال زبردست بارش ہوئی   ۴۔ نونہال کا سالنامہ جولائی میں شائع ہوا تھا۔

سوالات :۔ ۱۔ بتائیے ان جملوں میں کون کون سے لفظ بطور فعل استعمال ہوئے ؟

۲۔ یہ فعل کس زمانے کو ظاہر کرتے ہیں ؟

۳۔ آپ اپنے گذرے ہوئے زمانے کا کوئی واقعہ سنائیے۔

اعلان سبق :۔ اچھا تو آج ہم سر سید احمد خان کا مضمون " گذرا ہوا زمانہ " پڑھیں گے۔

مصنف کا تعارف :۔ سر سید احمد خان ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ سر سید احمد خان ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گذرے ہیں۔ انہوں نے اس وقت اصلاح کا بیڑہ اٹھایا جبکہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور مسلمانوں پر افسردگی اور مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لئے انہوں نے رسالہ " تہذیب الاخلاق " جاری کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کی حالت تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی۔ سر سید احمد خان اردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور اہم قومی خدمت سمجھتے تھے۔ ان کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے۔ سر سید کے ہاں دوسری بڑی چیز ظرافت کی چاشنی ہے جس کی وجہ سے ان کے مضامین کا مطالعہ گراں نہیں گذرتا۔ ان کی مشہور تصانیف " آثار الصنادید " اسباب بغاوت ہند اور خطبات احمدیہ وغیرہ ہیں۔ آپ کے متفرق مضامین بھی کئی جلدوں میں " مقالات سر سید " کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

پیشکش :۔ زیر تدریس سبق دو اجزاء میں پیش کیا جائے گا۔

جزو اول

موادِ درس

ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے رات ڈراؤنی ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے بڈھا نہایت غمگین ہے۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد کرتا ہے اتنا ہی اس کا غم بڑھتا ہے ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں دبائے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کے ساتھ ہی اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے اور وہ بے اختیار چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت ہائے وقت" گذرے ہوئے زمانے افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ۔ سڈول ڈیل، امنگ

طریقۂ تدریس

مثالی بلند خوانی:۔

پہلے مثال کے طور پر سبق کے ایک حصے کی بلند خوانی کی جائے گی۔

طلبہ کی بلند خوانی

بعد ازاں طلبہ سے بلند خوانی کرائی جائیگی

اصلاح تلفظ

طلباء جس لفظ کے پڑھنے میں غلطی کریں گے اس کی اصلاح تختہ سیاہ پر اعراب کی مدد سے کرائی جائے گی۔

اخذ معانی و استعمال

مشکل الفاظ کے معنی اخذ کرانے کے لئے طلبہ سے جملے بنوائے جائیں گے۔ پہلے مثالی جملے ان کے سامنے رکھے جائیں گے

الفاظ	معنی	جملے
ڈراؤنی	خوفناک	مائیں روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے لئے ڈراؤنی چیزوں کے نام لیتی ہیں۔
دل کانپنا	خوفزدہ ہونا	سقوط ڈھاکہ کے واقعات یاد کر کے دل کانپ جاتا ہے۔

مواد درس

میں بھرا دل۔ ان آنکھوں میں چھائے ہوئے اندھیرا زمانے میں ماں باپ جو نیکی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا، آہ! ابھی بہت وقت ہے۔ بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ آہ! وقت گذر گیا اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔ اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے۔ ماں گویا چھاتی سے اس کو لگائے کھڑی ہے۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے خاموش کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑی جاری ہے دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں، اور کہتے ہیں۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی نہ وہ دل رہا تھا اس نے اپنے نیکی کے زمانے کو یاد کیا۔ وہ اپنا مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے

طریقۂ تدریس

الفاظ	معنی	جملے
غمگین	اُداس	اسلم اپنی امتحان میں ناکامی پر بہت غمگین ہے۔
آنکھوں کے سامنے پھرنا	شدت سے یاد آنا	غم کے دنوں میں خوشی کا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔
دانتوں میں انگلی دبانا	حیران ہونا	چینی بازی گروں کے کرتب دیکھ کر میں نے دانتوں میں انگلی دبالی۔
بیعت کرنا		حضرت امام حسین رضؓ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تفہیمی سوالات

(ڈراؤنی رات کے منظر دکھا کر ذیل کے سوالات کئے جائیں گے۔

۱۔ اس تصویر میں آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟

۲۔ رات کا منظر کیسا ہے؟

۳۔ بوڑھا کیوں اُداس ہے؟

(بچوں کے اسکول جانے کی تصویر دکھا کر)

موادِ درس	طریقۂ تدریس
دل کو تسلی دیتا تھا۔ اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل گھبراتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے، "ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"	۱۔ یہاں بوڑھا کس وقت کو یاد کرتا ہے؟ ۲۔ اسکول میں بچے کس چیز کی خوشی لے کر جاتے ہیں؟ (بوڑھے کے تخیل میں ماں باپ کی تصویر دکھا کر) ۱۔ بوڑھے کے بہن بھائی دانتوں میں انگلی دبائے کیوں کھڑے ہیں؟ (ادھیڑ عمر میں مسجدیں اور کنوئیں بنوانے کی تصویر دکھا کر) ۱۔ مسجدیں اور کنوئیں بنوانا کیسا کام ہے؟ ۲۔ نیکی کی باتوں کو یاد کر کے بوڑھا اپنے دل میں کیا محسوس کرتا ہے؟

جزوِ دوم

موادِ درس	طریقۂ تدریس
وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا، وہ	**بلند خوانی** نمونے کے طور پر سبق کے دوسرے جزو کی بلند خوانی کی جائے گی۔ **طلباء کی بلند خوانی** طلبہ سے دوسرے جزو کی بلند خوانی کرائی جائے گی۔ **اصلاحِ تلفّظ** طلباء جس لفظ کے پڑھنے میں غلطی کریں گے

مواد درس

قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی ۔ وہ اس کے حسن وجمال کو دیکھکر حیران رہ گیا اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ "تم کون ہو؟" وہ بولی ،میں ہمیشہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا ، تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے، وہ بولی ،ہاں نہایت آسان ، پر بہت مشکل ۔جو کوئی خدا کے فرائض ادا کرکے انسان کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں ۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں ۔جو مجھکو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے ۔کم سے کم اپنی قومی بھلائی میں دل وجان سے ساعی ہو ۔یہ کہکر وہ دلہن غائب ہوگئی اور بوڑھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا ۔اس نے پچھلا زمانہ یاد کیا ۔ اس کے تمام کام ذاتی اغراض پر مبنی تھے ۔خاص قومی بھلائی کی خالص ہیئت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا ۔ اپنا حال سوچ کر نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہوکر چلا اٹھا "ہائے وقت ، ہائے وقت ! اگر وقت پھر آتا اور میں نوجوان ہو سکتا" یہ کہکر اس نے سرد آہ بھری اور بے ہوش ہوگیا ۔

طریقۂ تدریس

ان کی اصلاح تختۂ سیاہ پر اعراب کی مدد سے کرائی جائے گی۔

اخذ معانی و استعمال

مشکل الفاظ کے معانی اخذ کرانے کے لئے طلبا سے جملے بنوائے جائیں گے ۔

الفاظ	معنی	جملے
ساعی	کوشش کرنیوالا	نیک کام میں جو شخص ساعی ہو، خدا اس کی مدد کرتا ہے
تسخیر	تابع کرنا فرمانبردار کرنا۔	مسلسل محنت سے انسان ہر چیز کو تسخیر کرسکتا ہے۔
سعی	کوشش	اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلسل سعی لازمی ہے۔
میٹھی میٹھی باتیں	اچھی اچھی باتیں	میٹھی میٹھی باتوں سے غم زدہ لوگوں کا غم ہلکا ہوجاتا ہے۔
مسخّر	تابع کیا گیا	اچھے ملازم اپنی محنت اور ایمانداری سے اپنے مالک کا دل مسخر کرلیتے ہیں۔

مواد درس	طریقہ تدریس
تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی ماں اس کے پاس آکھڑی ہوئی اور اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا "بیٹا کیوں تو بیقرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھی ہے؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ ماں نے سن کر جواب دیا "بیٹا۔ بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا۔ بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔	**تفہیمی سوالات** (بوڑھے اور دلہن کی تصویر دکھا کر) ۱۔ اس تصویر میں آپ کو کیا نظر آرہا ہے؟ ۲۔ دلہن نے اپنا کیا نام بتایا؟ ۳۔ اس دلہن کو حاصل کرنے کے لئے کون سا عمل ضروری ہے؟ (لڑکے کو ماں گلے لگاتے ہوئے کی تصویر دکھا کر) ۱۔ لڑکے نے اپنی بیقراری کا کیا سبب بتایا؟ ۲۔ ماں نے اسے کیا نصیحت کی؟ (لڑکے کا پلنگ سے کودنے کی تصویر دکھا کر)
یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا۔ اور نہایت خوشی سے پکارا کہ "او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا، اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھایا، اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی نے اپنا نام بتلایا۔ او خدا! او خدا تو میری مدد کر۔ آمین۔	۱۔ اس لڑکے نے کس چیز کا عہد کیا؟ ۲۔ اس مضمون سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟ **اعادۂ کلی۔** اعادہ کیلئے مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے؟ ۱۔ بوڑھا کس بات پر اداس ہے (۲) دلہن نے اپنا کیا نام بتایا (۳) لڑکے کا خواب سن کر ماں نے کیا نصیحت کی؟ (۴) اس مضمون سے ہمیں کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔

تفویض کار: درج ذیل وقت کی قدر کے عنوان پر ایک صفحہ کا مضمون لکھئے

تاریخ ۱۲؍دسمبر ۱۹۷۲ء

جماعت ہشتم

مضمون اردو نثر

عنوان "پھول والوں کی سیر"

تدریسی اعانتیں: مضمون سے متعلق میلہ کی تاریخ مقرر کرنے اور بادشاہ کے حرم کی تیاری اور روانگی سے متعلق پانچ تصاویر،

مقاصد عام: اردو لکھنے، پڑھنے میں مہارت پیدا کرنا۔ خیالات میں وسعت پیدا کرنا نئے الفاظ و محاورات کا مفہوم ذہن نشین کرانا۔ اردو ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا۔

مقاصد خاص: مغل دور کی تہذیب و ثقافت، بادشاہ اور اس کے حرم کی تیاری اور قافلہ کی سج دھج سے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔

تمہیدی سوالات

۱۔ آخری مغل بادشاہ کا کیا نام تھا؟

۲۔ اس کے بعد مغل حکومت کا کیا حشر ہوا؟

۳۔ مغل تہذیب کے واقعات اب کہاں ملتے ہیں؟

اعلان سبق: اچھا تو آج ہم دہلی میں مغل بادشاہوں کے زمانے میں منعقد ہونیوالے ایک میلہ "پھول والوں کی سیر" سے اقتباس پڑھیں گے۔ جس میں بادشاہ سے میلہ کی تاریخ مقرر کرنے کی اجازت اور اس کے حرم کی تیاری اور روانگی کا ذکر ہوگا۔ یہ مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ کا تصنیف کردہ ہے اور اس میں مغل تہذیب کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔

مصنف کا تعارف

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو ادب کے مشہور مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خوش مذاقی یا مزاح میں قہقہے کا موقع کم ملتا ہے ہاں تبسّم کے مواقع بہت ملتے ہیں۔ آپ دلّی میں پیدا ہوئے اور وہیں کی طرزِ معاشرت کی اپنے مضامین تصاویر کھینچے ہیں۔

پیشکش : سبق ایک جزو میں پڑھایا جائے گا۔

مواد درس	طریقۂ تدریس
ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ آیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلّی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفاء دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی پہنچے۔ اطلاع کرائی، باریابی ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے کہا۔ "پیرو مرشد، پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر گٹورہ ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرمادی جائے اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔ بادشاہ نے فرمایا "ہاں اماں! ٹھیک تو ہے، جو	**بلند خوانی** مثالاً سبق کی نظم خوانی کی جائے گی۔ **بلند خوانی طلبہ** مثالی بلند خوانی کے بعد طلبہ سے بلند خوانی کرائی جائے گی۔ **اصلاح تلفّظ** اگر کسی لفظ کا غلط تلفظ ادا کیا جائے گا تو جزو کے ختم ہونے پر تختہ سیاہ پر لکھ کر اس لفظ کے تلفظ کی اصلاح کرائی جائے گی **الفاظ معنی۔ جملے** مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی جملہ سازی کے ذریعے بتائے جائیں گے۔

مواد درس

تمہاری خوشی وہ ہماری خوشی۔ پندرہ تاریخ مقرر کردو۔ رہا ہمارا آنا، تو جہاں تم وہاں ہم کیوں نہ آئیں گے"؟ تاریخ کا مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لئے حاضر ہوا۔ لیجئے سیر کی تاریخ پکی ہوگئی۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونا شروع ہوئیں۔ ایک آتیں سلام کرکے بیٹھ جاتیں۔ لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے فرمایا "اماں بیگم تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے، پندرہ کو سیر ہے۔ لو جاؤ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہوں گے"۔

طریقۂ تدریس

الفاظ	معنی	جملے
باریابی	داخلہ، اجازت	خدا کی بارگاہ میں باریابی کا بھی ایک وقت معین ہے۔
زہے نصیب	خوش قسمتی، نصیب سے	حامد نے محمود کے آنے پر کہا کہ زہے نصیب آپ میرے گھر تشریف تو لائے۔
مقرر	طے کرنا، ٹھہرانا	اس کے جانے کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے اس لئے وہ تیار ہے۔
آنکھوں کے سامنے پھرنا۔	تصور کرنا، خیال کرنا	کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ بار بار آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔
دلوں میں گدگدی ہونا،	خواہش کا بیتاب ہونا، دل چاہنا	نمائش کے لگنے کی اطلاع سن کر میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔

سوالات

پہلی تصویر آویزاں کرکے مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے۔

۱۔ بتائیے اس تصویر میں کیا نظر آرہا ہے؟

۲۔ اجازت لینے کے لئے کون لوگ حاضر ہوئے؟

۳۔ کون سی تاریخ طے پائی؟

مواد درس

سب لوگ اتنا سننے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجا دیئے۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعے کے لاہوری دروازے کے سامنے نوبت خانے سے ملا ہوا جو میدان ہے اس میں سواریاں آلگیں۔ انائیں۔ مغلانیاں۔ خواصیں، چھوکریاں، لونڈیاں سوار ہونا شروع ہوئیں اور وہ ٹھساٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے مشکل آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہوئے نواب زینت محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹھ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں، گھونگھریالے بال، ان پر سرخ پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندنے، موٹے موٹے ہونٹ، لال لال دیدے سرخ گورنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کورٹ گھوڑوں

طریقۂ تدریس

دوسری تصویر دکھا کر مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے۔

۴۔ چارٹ دیکھ کر بتائیے کہ اعلان کس طرح کیا جا رہا ہے۔

تیسری تصویر دکھا کر مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے۔

۵۔ تصویر میں دیکھ کر بتائیے کہ کیا ہو رہا ہے۔

۶۔ بادشاہ نے ان سے کیا کہا

الفاظ	معنی	جملے
منڈھے	چپکے ہوئے، چڑھے ہوئے	جسم سے منڈھے ہوئے کپڑے پہننا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔
روبرو	سامنے	بزرگوں کے روبرو ادب و لحاظ سے بیٹھنا اٹھنا چاہئے۔
مشکل آسان ہونا	مشکل کام ختم ہونا مصیبت دور ہونا	خدا پر بھروسہ رکھنے سے بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔
پشت	پیٹھ	بعض لوگ اتنے ملتے جلتے ہوئے ہوتے ہیں کہ پشت کی طرف سے دیکھنے سے پہچان نہیں ہوتی۔
پلٹن	قطار۔ لائن	چھوٹی جماعتوں کے بچے جب پلٹن بنا کر چلتے ہیں تو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

<table>
<tr><th>مواد درس</th><th>طریقہ تدریس</th></tr>
<tr><td>پر سوار ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں
سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت
سے منڈھے ہوئے ڈنکے پر ایک چوب
مارتی دوسری پکارتی "ادب سے نگاہ
روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت"
سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں
ایک کے ہاتھ میں مورچھل، دوسری کے
ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر بسم اللہ
کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردا
بیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس
پہنے ہتھیار لگائے ساتھ ساتھ تھیں
تھوڑے فاصلے پر مشعلچیں ہاتھ میں
مشعل لئے اور کپّی لئے۔ کسی کے ہاتھ
میں دوشاخہ اور کسی کے ہاتھ میں
پنج شاخہ سواری کے ساتھ آہستہ
آہستہ بڑھ رہی تھیں۔</td><td>سوالات
۱۔ میلہ کی تاریخ سنکر سب لوگوں نے کیا کیا؟
۲۔ سب کی تیاری میں کتنا وقت لگا؟
۳۔ زینت محل کی تصویر دکھاکر مندرجہ ذیل سوالات کئے جائینگے
۳۔ کس کی سواری بہت سج دھج کے ساتھ روانہ ہوئی؟
۴۔ آگے آگے کون عورتیں ہیں؟
۵۔ تھوڑے تھوڑے سے فاصلہ پر کون تھا؟
اعادۂ کلّی
سوالات
۱۔ "پھول والوں کی سیر" میلہ کس زمانہ میں منایا جاتا ہے؟
۲۔ بادشاہ سے اجازت لینے کون لوگ آئے؟
۳۔ قافلہ میلہ منانے کس مقام پر گیا؟
۴۔ زینت محل کی سواری کیسی تھی؟
گھر کا کام
مرزا فرحت اللہ بیگ کے دوسرے مضامین پڑھ کر لکھئے کہ آپ ان کے مضامین میں کیا خاص بات محسوس کرتی ہیں۔</td></tr>
</table>

تاریخ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء

جماعت نہم

مضمون اردو نثر

عنوان "حجّن بی"

تدریسی اعانتیں ۱۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تصویر

۲۔ حجن بی کی دوکان

۳۔ حجن بی اور مزاجدار کا تصویری چارٹ

معلومات سابقہ

طلبہ اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور نظم و نثر کے متعدد اسباق پڑھ چکے ہیں۔

مقاصد عام: ۱۔ طلبہ میں اردو بولنے۔ لکھنے پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کرنا

۲۔ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرانا

۳۔ طلبہ میں خیالات کو بہتر انداز سے بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

مقاصد خاص: ۱۔ سبق کے مصنف ڈپٹی نذیر احمد اور ان کی تصنیف مرات العروس سے متعارف کرانا۔

۲۔ طلبہ کو حجن بی اور مزاجدار کے کرداروں سے روشناس کرانا اور ان کے اچھے برُے نتائج کا احساس دلانا۔

تمہید :۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تصویر دکھاتے ہوئے طلبہ سے پوچھا جائے گا کہ یہ تصویر کس کی ہے؟

تعارف :۔ ڈپٹی نذیر احمد ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم کی تکمیل کی۔ تالیف و تصنیف ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر

حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا ۔ نذیر احمد اردو ادب کے سب سے پہلے ناول نویس خیال کئے جاتے ہیں ۔ نذیر احمد کی تحریر میں سادگی، شگفتگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے ۔ محاوروں کے استعمال کا انہیں بہت شوق تھا اور اکثر محاورات استعمال کرتے تھے ۔ ان کی تحریر میں شوخی اور ظرافت بھی پائی جاتی ہے ۔ ان کی مشہور تصانیف مراۃ العروس ۔ بنات النعش ، توبۃ النصوح ۔ فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت ہیں ۔ انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی سلیس اور بامحاورہ اردو میں کیا ہے ۔ قانون کی بھی کئی کتابیں انہوں نے انگریزی سے اردو میں منتقل کی ہیں ۔ آپ کی وفات ۱۹۱۳ء میں ہوئی ۔

مراۃ العروس کا مطبوعہ نسخہ دکھاتے ہوئے طلبہ سے پوچھا جائے گا کہ اس کتاب کا کیا نام ہے ۔

"مراۃ العروس" دلّی کی تہذیب کا وہ مرقع ہے جس کے پس منظر میں مسلمان گھرانوں کے سماجی اور اخلاقی مسائل کو ناول کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کا یہ لافانی ناول اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا یہ ناول بیگماتِ دلّی کی ٹکسالی زبان کا گوہرِ نایاب ہے

حجن بی کی دوکان دکھاتے ہوئے طلبہ سے سوال کیا جائے گا ۔

اس تصویر میں آپ کو کیا کیا چیزیں نظر آرہی ہیں ۔

بچو! یہ حجن بی ہیں ۔ بظاہر بڑی خدا رسیدہ معلوم ہوتی ہیں مگر ہیں بڑی چالباز اور مکار ۔

نفسِ مضمون : پہلے زمانے میں چالاک اور مکار عورتیں طرح طرح کے بھیس بدل کر بے وقوف عورتوں کو لوٹا کرتی تھیں ۔ اسی طرح ایک چالباز اور مکار عورت نے حجن بی کا روپ بدلا اور عورتوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کچھ چیزیں اپنے پاس رکھیں اور جگہ جگہ اپنی دوکان لگاتی رہتی ۔ ایک دفعہ ایک گلی میں اس نے اپنی دکان لگائی اور وہاں کی عورتوں کو بے وقوف بنا کر اپنی چیزیں فروخت کرتی رہی ۔ اسی گلی میں ایک بہت بے وقوف عورت رہتی تھی ۔ اس نے بھی انہیں بلایا ۔ حجن بی نے باتوں باتوں میں سمجھ لیا کہ یہ عورت بے وقوف ہے ۔ وہ روز اس کے

گھر آنے لگی۔ آخر ایک دن اس بے وقوف عورت کا سارا زیور صاف کر کے بہلانے لے کر بھاگ گئی۔

اچھا تو ان باتوں کی روشنی میں بتایئے کہ

۱۔ پہلے زمانے میں کیسی عورتیں ہوتی تھیں ؟

۲۔ مکار اور چالباز عورتیں کون کون سے روپ بدلتی ہیں؟

اعلان سبق :۔ آج ہم آپ کو چھن بی کے بارے میں پڑھائیں گے۔

پیشکش :۔ سبق ایک جزو میں پیش کیا جائے گا۔

طریقۂ تدریس	موادِ درس
بلند خوانی پہلے طلبہ کے سامنے بلند خوانی کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔ **طلبہ کی بلند خوانی** چند طلبہ سے عبارت کی بلند خوانی کروائی جائے گی۔ **اصلاحِ تلفظ** طلباء جن الفاظ کا تلفظ غلط ادا کریں گے ان کو اعراب کی مدد سے تختۂ سیاہ پر درست کرایا جائے گا۔ **مشکل الفاظ** طلبہ کو مشکل الفاظ کے معنی سمجھانے کے لئے مثالی جملے طلبہ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔	یہ مکار چھن بے وقوف عورتوں کو بہکانے کے واسطے طرح طرح کے تبرکات اور صدہا قسم کی چیزیں اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ تسبیح، خاکِ شفا، زمزمیاں (آبِ زم زم کے پانی سے بھری ہوئی ڈبیاں)۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں، کوہ طور کا سرمہ، خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا، عقیق البحر (ایک قسم کا سرخی مائل قیمتی پتھر جسے بطور نگینہ انگوٹھی میں جڑا جاتا ہے) اور مونگے کے دانے، نادِ علی۔ پنجسورے اور بہت سی دوائیں۔ گلی میں آکر جو اس نے اپنی دکان کھولی بہت سی لڑکیاں جمع ہو گئیں۔ مزاجدار نے بھی ناز لطف سے کہا، گلی سے جب اٹھنے لگے چھن کو یہاں

مواد درس

بلا لانا۔ ہم بھی تبرکات کی زیارت کریں گے۔ زلفن جا کھڑی ہوئی اور حجن کو لِوا لائی مزاجدار نے بہت خاطرداری سے حجن کو پاس بٹھایا اور سب چیزیں دیکھیں۔ سرمہ اور نادعلی دو چیزیں مزاجدار نے پسند کیں۔ حجن نے مزاجدار کو باتوں باتوں میں تاڑ لیا کہ یہ عورت ڈھب پر جلد چڑھ جائے گی ایک پیسے کا بہت سا سرمہ تول دیا اور دو آنے کو نادعلی حوالے کی، اور فیروزے کی ایک انگوٹھی تبرک کے طور پر اپنے پاس سے مفت دی۔ مزاجدار ریجھ گئیں اس کے بعد حجن نے سمندر کا حال، عرب کی کیفیت اور دل سے جوڑ کر، دو چار باتیں ایسی کیں کہ مزاجدار نے کمال شوق سے سنا اور اس کی طرف خاص التفات کیا۔ حجن نے پوچھا "کیوں بی! تمہارے کوئی بال بچہ نہیں؟ مزاجدار نے آہ کھینچ کر کہا "ہماری ایسی تقدیر کہاں؟ حجن نے پوچھا "بیاہ کو کتنے دن ہوئے ہیں؟" مزاجدار نے کہا "ابھی برس روز نہیں ہوا" مزاجدار نے کہا۔ ابھی برس روز نہیں ہوا۔" مزاجدار

طریقۂ تدریس

پھر چند طلباء سے جملے بنوا کر نئے الفاظ کے معانی ذہن نشین کرلئے جائیں گے۔

الفاظ	معنی	جملے
باتوں باتوں میں تاڑ لینا	کسی کی باتوں سے اس کے مزاج کا اندازہ لگانا	حجن بی نے مزاجدار کو باتوں ہی باتوں میں تاڑ لیا تھا کہ وہ وہمی عورت ہے۔
زیارت کرنا	کسی بزرگ یا مزار یا مقدس اشیاء کو دیکھنا	مزاجدار حجن بی کی دکان کی زیارت کے لئے بیتاب ہوگئیں۔
ڈھب پر جلد چڑھ جانا۔	آسانی کے ساتھ دھوکہ کھا جانا	حجن بی نے مزاجدار کو جلد ہی ڈھب پر چڑھا لیا۔
ریجھ جانا	مائل ہونا لٹو ہوجانا	مزاجدار جلد ہی حجن بی کے سامان پر ریجھ گئیں۔
کمالِ شوق سے	بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ	مزاجدار نے حجن بی سے کمال شوق سے ملاقات کی۔
التفات	توجہ۔ مہربانی	حجن بی مزاجدار کی باتیں سن کر خاص التفات کیا۔
جزو و کل	چھوٹی بڑی تمام باتیں	مزاجدار نے حجن بی کے سامنے اپنا جزو و کل رکھ دیا۔

مواد درس

کی بے عقلی کا اب تو جمن کو یقین ہوا اور دل میں کہنے لگی کہ اس نے تو اولاد کا نام سن کر ایسی آہ کھینچی جیسے کوئی برسوں کا امیدوار ہو۔

جمن نے کہا۔ ناامیدی کی بات نہیں تمہارے اتنے بچے ہوں گے کہ تم سنبھال نہ سکو گی! البتہ بالفعل اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہوگا۔ میاں کا کیا حال ہے؟ مزاجدار نے کہا "ہمیشہ مجھ سے ناخوش رہا کرتے ہیں۔

غرض پہلی ہی ملاقات میں مزاجدار نے جمن سے ایسی بے تکلفی برتی کہ اپنا حال جزو جزو اس سے کہدیا اور جمن بی نے باتوں ہی باتوں میں تمام بھید معلوم کر لیا۔

طریقۂ تدریس

تفہیمی سوالات

تفہیم عبارت کے سلسلہ میں سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

۱۔ مکار جمن نے بے وقوف عورتوں کے لئے کیا کیا چیزیں اپنے پاس رکھی تھیں؟

۲۔ جمن بی نے اپنی دکان کہاں کھولی تھی؟

۳۔ جمن بی نے دکان کیوں کھولی تھی؟

۴۔ جمن بی کی دکان پر کس کا ہجوم تھا؟

۵۔ مزاجدار نے زلفن سے کیا کہا؟

۶۔ مزاجدار نے جمن کی خاطر کس طرح کی؟

۷۔ مزاجدار نے جمن سے کیا کیا خریدا؟

۸۔ جمن بی نے مزاجدار کو باتوں باتوں میں کیسے تاڑ لیا۔

۹۔ جمن نے مزاجدار کو کہاں کہاں کے قصے سنائے۔

۱۰۔ جمن نے مزاجدار کو کس طرح بیوقوف بنایا۔

۱۱۔ جمن بی نے مزاجدار سے کیا رازدارانہ بات پوچھی؟

۱۲۔ مزاجدار نے آہ بھر کر کیا جواب دیا۔

طریقۂ تدریس	مواد درس

مواد درس

قواعد کے تفہیمی پہلو

واحد	جمع
اتفاقات	اتفاقات
حال	احوال
عادت	عادات
جزو	اجزا
تبرک	تبرکات
قسم	اقسام

طریقۂ تدریس

۱۳- جحن نے مزاجدار سے راز معلوم کر کے دل میں کیا سوچا؟

۱۴- جحن نے مزاجدار سے اس کے شوہر کے بارے میں کیا دریافت کیا؟

۱۵- مزاجدار نے شوہر کے بارے میں جحن کو کیا بتایا؟

۱۶- پہلی ہی ملاقات میں مزاجدار جحن بی سے کس طرح پیش آئیں؟

اعادۂ کلی

۱- مکار جحن نے عورتوں کو کس طرح بے وقوف بنایا؟

۲- جحن نے مزاجدار کو کس طرح بے وقوف بنایا؟

۳- مکار عورتوں کے فریب سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے؟

گھر کا کام

جحن بی کا خلاصہ لکھئے

تاریخ ۲۷/ستمبر ۱۹۷۲ء

عنوان "بچے"

جماعت دہم

مضمون اردو

تدریسی اعانتیں ۱- احمد شاہ بخاری پطرس کی تصویر

۲- ہنگوڑے میں سوئے ہوئے بچے کی تصویر جس میں بلّی اور فاختہ کے بچے دکھائے گئے ہیں۔

۳- روتے ہوئے بچے کی تصویر کا چارٹ

۴- روتے ہوئے بچے کو بہلانے کی مختلف کوششوں کی تصویر کا چارٹ۔

۵- مرزا صاحب کے گھر کی تصویر جس میں مصنف مرزا صاحب کے بچوں کو بُلا بُلا کر پیار کر رہا ہے۔

معلوماتِ سابقہ: طلباء اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ بعض دلچسپ اور مزاحیہ کہانیاں اور مضمون پڑھ چکے ہیں۔

مقاصد عام:- طلباء میں صحیح تلفظ اور روانی کے ساتھ اردو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرنا۔ طلباء کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کرنا۔

مقاصد خاص:- طلباء کو بچہ کی فطرت اور اس کے عادات سے مزاحیہ انداز میں روشناس کرانا۔ ان میں مزاح نگاری کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرنا۔ پطرس کی شخصیت اور فن کا تعارف کرانا

تمہید:- ۱- ایک انسان عام طور پر اپنی زندگی میں عمر کی کن کن منزلوں سے گذرتا ہے؟

۲- اس تصویر میں انسان عمر کی کس منزل میں نظر آرہا ہے؟

دوسری تصویر آویزاں کر کے پوچھا جائے گا اس میں آپ کو کیا
نظر آ رہا ہے۔

اعلان سبق: آج ہم آپ کو اسی قسم کے بچوں کے متعلق ایک نہایت دلچسپ مضمون
پڑھائیں گے جس کا عنوان بھی "بچے" ہے

پیش کش —— زیر تدریس سبق دو اجزاء میں پیش کیا جائے گا۔

تعارفِ مصنف

مضمون "بچے" پطرس کا تحریر کردہ ہے۔ احمد شاہ بخاری پطرس یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان کا رُخ کیا۔ پطرس ایک عظیم مزاح نگار مصنف تھے، وہ بڑے ذہین تھے، ان کا مطالعہ نہایت گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ پطرس زندگی میں جراءت، شوخی اور تیزی کو پسند کرتے تھے۔ پطرس مزاح پیدا کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے تھے۔ ان کا محبوب انداز واقعہ سے مزاح پیدا کرنا ہے۔ وہ فطری واقعہ کو الفاظ کی تبدیلی سے ایسے نئے معنیٰ پہناتے کہ اس کی صورت مضحکہ خیز ہو جاتی۔ پطرس مغربی مزاح نگاری سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کی بدولت اردو نثر میں وہ شگفتگی اور تازگی پیدا ہوئی جو صرف مغربی ادب کا حصہ تھی۔ وہ ظرافت کے لئے نہ تو الفاظ کے گھروندے بناتے ہیں، نہ الفاظ کی چاشنی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے بیان میں ایسی سادگی ہوتی ہے، گویا وہ اپنے قاری سے بے تکلف گفتگو کر رہے ہیں۔ پطرس ایک مصنف ہی نہیں بلکہ ایک باوقار مقرر اور سلجھے ہوئے سیاستداں بھی تھے۔ اسی لئے انہیں ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل کے فرائض انجام دیئے اور اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو نیویارک میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

مثالی بلند خوانی : سب سے پہلے مثالی بلند خوانی کی جائے گی ۔

تقلیدی بلند خوانی: بعد ازاں چند طلبہ سے سبق پڑھوایا جائے گا ۔

اصلاح تلفظ : طلبہ جن الفاظ کا تلفظ غلط ادا کریں گے ان کی اصلاح بلند خوانی کے بعد کرائی جائے گی ۔

اخذ معانی و قواعد: عبارت کی تفہیم سے قبل بعض الفاظ کے معنی اور تشبیہ کے بعض ارکان سے طلبہ کو روشناس کرایا جائے گا ۔

الفاظ	معنی	جملے
قوت ناطقہ	بولنے کی قوت	غالب نے انسان کی قوتِ ناطقہ کے پیش نظر اس کو حیوان ناطق کہا ہے ۔
مُہمَل	بے معنی	بچے ابتدائی بول چال کے دوران مہمل الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں ۔

تشبیہ : مصنف نے اس سبق میں بچے کو پھول اور چاند سے تشبیہ دی ہے ، جیسے پھول سا بچہ ، چاند سا بچہ

تشبیہ کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز کی مانند قرار دینے کو کہتے ہیں ۔

ارکان تشبیہ: تشبیہ کے پانچ ارکان ہوتے ہیں ۔

۱۔ مشبّہ : جس چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے اسے مشبّہ کہتے ہیں جیسے بچہ

۲۔ مشبّہ بہ : جس چیز سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ بہ کہتے ہیں جیسے چاند۔ پھول ۔

۳۔ وجہ شبہ : وہ صفت جو مشبہ اور مشبہ بہ میں تعلق پیدا کرنے کا سبب ہو جیسے : چاند اور بچہ کی مماثلت کا سبب خوبصورتی ۔

۵۔ حرفِ تشبیہ : وہ حروف جو تشبیہ دینے کے لئے استعمال کئے جائیں جیسے سا، طرح، مانند، گویا

مواد درس

جزوِ اوّل

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگیں۔ بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جو میں نے لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا و کلا میں اس بات کا قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ بچہ سنتا بھی اور دیکھتا بھی ہے۔ لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوتِ ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اِسے

طریقہ تدریس

تفہیمی سوالات

مصنف اس مضمون میں کس کے بچوں کا ذکر کر رہا ہے؟

دنیا میں انسان کے بچوں کے علاوہ اور کس کس کے بچے ہوتے ہیں؟

مضمون نگار نے اس مضمون میں بچہ کو کن کن چیزوں سے تشبیہ دی ہے؟

بچہ کو چاند اور پھول سے تشبیہ دینے کی کیا وجہ ہے؟

بچہ بھلا اور پیارا کب تک معلوم ہوتا ہے؟

پانچوں حواس سے کیا مراد ہے؟

بچہ کے پانچوں حواس کب کام کرنے لگتے ہیں؟

بیدار ہونے پر عام طور پر بچہ کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟

جب بچہ بیدار ہو جاتا ہے تو الارم کلاک کی شکل کیوں اختیار کر لیتا ہے؟

بیدار ہونے پر بچہ کے پانچوں حواس کام کرنے لگتے ہیں

مضمون نگار اس بات کا قائل کیوں نہیں ہے؟

بچہ کے پانچوں حواس مثلاً دیکھنے سننے وغیرہ

مواد درس

چپ کرانا۔ میں نے اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں۔ ناچ ناچے ہیں۔ تالیاں بجائی ہیں گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں۔ بھیڑ، بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یک سوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو جس سُر میں اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت۔ بچہ کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گذرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے مہمل فقرے، بے معنی سے بے معنی جملے منہ بنا کر بلند آوازمیں ان کے سامنے دہرائیے، اور کچھ نہ ہو تو شغل بیکاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجئے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بیکار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں۔ یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے گُڑ کا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک

طریقہ تدریس

قطع نظر مضمون نگار بچے کی کس قوت کا اعتراف کرتا ہے ؟

اگر بچہ روتا ہوا ہو تو والدین یا متعلقین کس بات کی کوشش کرتے ہیں۔ روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کے لئے مضمون نگار نے کیا کیا کوششیں کی تھیں ؟

اس کی ان کوششوں کا بچہ کے رونے پر کیا اثر پڑا ؟

جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو۔ اس جملے سے مضمون نگار کی کیا مُراد ہے ؟

جس جگہ بچے ہوتے ہیں وہاں کس قسم کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے ؟

شور پیدا کرنے میں بچوں کے علاوہ والدین اور لواحقین کس طرح حصہ لیتے ہیں ؟

بچے کو سلانے کے لئے عام طور پر کیا کیا جاتا ہے ؟

روتے ہوئے بچے کو بہلانے کے لئے والدین یا دیگر لوگ اس کے لئے کیا کیا چیزیں مہیا کرتے ہیں ؟

بچوں کے کھلونوں میں سیٹی دار گڑیا ،

موادِ درس	طریقہ تدریس
ایسی بے سری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے۔ اور جب آپنے "ماما" یا "پاپا" کے جوش میں آکر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگوادی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ! اس سے بڑھ کر صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔	جھنجھنا وغیرہ کو مضمون نگار نے صحت کے لئے مضر کیوں قرار دیا ہے۔

جزو دوم

موادِ درس	طریقۂ تدریس
خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں، کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ ضرور کہیں کہ "کیا پیارا بچہ ہے"! میرے ساتھ کے گھر میں ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر ۹ سال ہے۔ بہت شریف	**نوٹ:-** عبارت کی تفہیم سے پہلے، وہ سارے اقدامات کئے جائیں گے جو جزو اول کی تدریس میں کئے گئے تھے۔ **تفہیمی سوالات** مصنف نے خوش قسمت کن لوگوں کو کہا ہے؟ والدین کو خوش قسمت کیوں کہا جاتا ہے؟ مضمون نگار نے بدقسمت کن لوگوں کو کہا ہے؟

مواد درس

آدمی ہیں ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں ایک روتا ہے تو باقی سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سُر ذرا باریک ہے آپ انگلیاں بھینچوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر کانوں میں روئی دیکر، لحاف میں سر لپیٹ کر سوئیے۔ ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کر اٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر پر جب جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا، مرزا صاحب سے کہوں "حضرت" آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ نہ دن کو کام کر سکتا ہوں، نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسم سے کہتے ہیں۔

طریقۂ تدریس

دوست، احباب کے بچہ کو دیکھ کر ہمیں اپنے جذبات کے برخلاف کس بات کا اظہار کرنا پڑتا ہے؟

مضمون نگار نے اپنے پڑوسی مرزا صاحب کا ذکر کیوں کیا ہے؟

مرزا صاحب کے بچے کس قسم کے ہیں؟

جب ان کا ایک بچہ روتا ہے تو ان کے دوسرے بچے کیا کرتے رہتے ہیں؟

جب ان کا ایک بچہ چپ ہو جاتا ہے تو ان کے دوسرے بچوں کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟

رات کی ڈیوٹی والے بچوں سے کیا مراد ہے؟

رات کے وقت رونے والے بچوں کا سُر کیسا ہے؟

ان بچوں کے شور و غل کی وجہ سے رات کو مصنف کو کس پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

وہ سونے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرتا ہے؟

جب مصنف، مرزا صاحب کے گھر جاتا ہے تو اس کا رویہ ان کے بچوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟

مواد درس

۱۰ اختر بیٹا" ! ان کو سلام کرو۔ "سلام کرو بیٹا" اس کا نام اختر ہے۔ صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا۔ کبھی نہیں روتا۔ کبھی ماں کو دق نہیں کرتا، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور و شور میں کچھ نہیں سنتے۔ بدبختی ہماری ہوتی ہے۔ لیکن کہتا ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا" گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے ہوتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے، عید، بقر عید کو تھوڑا اسا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی کیونکہ ایسے موقع پر ضد کار آمد ہوا کرتی ہے لیکن یہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

گھر کا کام

پطرس نے اپنے مضمون "بچے" میں بچوں کی کس خصوصیت کا ذکر کیا ہے؟

طریقۂ تدریس

وہ مرزا صاحب سے کس بات کی شکایات کرنا چاہتا ہے؟

وہ اپنے ارادے میں کیونکر کامیاب نہیں ہو پاتا؟

مرزا صاحب اپنے ان نالائق بچوں کی تعریف کن لفظوں میں کرتے ہیں؟

مصنف کے خیال میں کن کن مواقع پر ضد کار آمد ہوتی ہے؟

عید، بقر عید یا کسی مہمان کی آمد پر ضد کرنا کیوں کار آمد ہوا کرتا ہے؟

اعادۂ کلی

مضمون نگار نے اس سبق میں بچوں کی کس عادت کا ذکر کیا ہے؟

احباب اور دوستوں کے بچوں کو دیکھ کر اپنے جذبات کے برخلاف ہمیں کیا کرنا پڑتا ہے؟

مصنف کو اپنے پڑوسی مرزا صاحب کے بچوں کے شور و غل سے کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

مصنف کے خیال میں ضد کن کن موقعوں پر کار آمد ہوا کرتی ہے؟

(۲)

نظم

تاریخ ـــــ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

جماعت ـــــ ہفتم

مضمون ـــــ اردو (نظم)

عنوان ـــــ کلی کی بے کلی

تدریسی اعانتیں ۱۔ باغ اور چاندنی رات کے مناظر کی دو تصویریں

۲۔ تقابلی اور تمہیدی اشعار کے چار عدد چارٹ

۳۔ مطبوعہ نظم

سابقہ معلومات:۔ طلباء نے شوق قدوائی کا نام سنا ہے اور ان کی شہرۂ آفاق نظم پھول کی فریاد سے واقف ہیں۔

مقاصدِ عام ۱۔ طلبہ کو اظہارِ خیال کرنے کے قابل بنانا۔

۲۔ قوتِ مشاہدہ کو فروغ دینا

۳۔ مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

مقاصدِ خاص ۱۔ طلبہ میں شعر خوانی اور مطالعہ نظم کا شوق پیدا کرنا

۲۔ تخلیقی اور استحسانی صلاحیتوں کو فروغ دینا۔

۳۔ احساس کی گہرائی اور فکر و خیال کی بلندی پیدا کرنا

۴۔ طلبہ میں رحم و مروت کے جذبات پیدا کرنا۔

۵۔ زیر تدریس نظم کا مفہوم ذہن نشین کرانا۔

تمہید: بچو! ہم آپ کو مرحوم شکیل بدایونی کا ایک مشہور شعر سناتے ہیں

غم عمرِ مختصر سے ابھی بے خبر ہیں کلیاں
نہ چمن میں پھینک دینا کسی پھول کو مسل کے

(اس موقع پر تمہیدی شعر کو تختۂ سیاہ پر لکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کئے جائینگے)

۱۔ غم عمرِ مختصر سے کون بے خبر ہے؟

۲۔ شاعر کس بات سے منع کر رہا ہے؟

۳۔ آپ کے سامنے اگر آپ کے کسی دوست یا عزیز پر کوئی ظلم ہو تو آپ پر کیا اثر ہوگا؟

۴۔ اسی طرح اگر چمن میں کسی پھول کو مسل کر پھینک دیا جائے تو کلیوں پر اس کا کیا اثر ہوگا؟

اعلانِ سبق: ۔ آئیے ہم دیکھیں کہ جب ایک شاعر کسی کو چمن میں پھول توڑتے اور مسلتے دیکھتا ہے تو اس کے نازک اور حساس دل پر کیا گذرتی ہے اور وہ اپنی بے کلی یا بے قراری کو کلی کی زبان میں کس طرح بیان کرتا ہے۔ شاعر نے اپنے انہیں احساسات کو دراصل کلی کی بے کلی کا نام دیا ہے۔ اور یہ مشہور شاعر ہے شوق قدوائی۔

شاعر کا تعارف: اِن کا نام احمد علی اور شوق تخلص ہے ۱۸۵۳ء میں لکھنؤ کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ شوق نے قدیم و جدید دونوں قسم کی شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ مظفر علی خان اسیر کے شاگرد تھے لیکن قلق لکھنوی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ پہلے غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا یہ عموماً قدیم رنگ میں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی مثنویاں بھی لکھیں جن میں مثنوی عالمِ خیال اور "ترانہ شوق" بہت مشہور ہیں۔ قومی و ملی جذبات اور مناظر قدرت پر مشتمل نظمیں ان کے علاوہ ہیں۔ شوق قدوائی کی زبان صاف، رواں اور انداز بیان شگفتہ اور دلکش ہے۔

پیشکش: ۔ حسن اور تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے نظم صرف ایک جز میں پیش کی جائے گی۔

اصلاح تلفظ: نظم خوانی کے دوران طلبہ جن الفاظ کا تلفظ غلط کریں گے۔ آخر میں تختۂ سیاہ پر مع اعراب ان کی اصلاح کرائی جائے گی۔

لفظ و معنی: طلبہ کو نظم کا مفہوم سمجھنے میں مدد دینے کے لئے مندرجہ ذیل مشکل الفاظ اور ان کے معنی نظم کے ساتھ منسلک کر دیئے گئے ہیں۔

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
نسیم	ٹھنڈی ہوا	حجاب	شرم - پردہ
کلید	چابی	دہن	منہ
گلچیں	پھول توڑنے والا	سلسلہ	تعلق
شعاعِ مہر	سورج کی کرنیں (شعاع - روشنی)	چوک	غلطی - بھوک
	(مہر - سورج)	تبسم	مسکراہٹ
پیرہن	لباس	قفل	تالا
قفلِ دہن	منہ کا تالا (منہ بند)	حُبِّ وطن	وطن کی محبت
شجر	درخت	جفائیں	مصیبتیں - تکلیفیں
طمع	لالچ		

مواد درس	طریقہ تدریس
نسیم نے مجھے آ کے گدگدایا ہے اسی سے میرے لبوں پر تبسّم آیا ہے	**تفہیم اشعار:** نظم کا ایک ایک شعر پڑھ کر سوالات کے ذریعے مفہوم سمجھایا جائے گا اور بوقت ضرورت اشعار کی تشریح بھی کی جائے گی۔ ۱- کلی کو کس نے گدگدایا ہے ؟ ۲- کلی کے لبوں پر تبسم کیوں آیا ہے ؟

مواد درس	طریقہ تدریس
	٣۔ نسیم کے گدگدانے سے کیا مراد ہے؟
یہ میری بُو کو نہ چھوڑے گی میں سمجھتی ہوں	١۔ اس شعر میں "میں سمجھتی ہوں" کون کہہ رہی ہے؟
مرے حجاب کو توڑے گی میں سمجھتی ہوں	٢۔ "یہ میری بُو کو نہ چھوڑے گی" کلی کس کے متعلق کہہ رہی ہے؟
	٤۔ کلی کے حجاب کو کون توڑے گی؟
	٥۔ نسیم کس طرح کلی کے حجاب کو توڑے گی؟
	وضاحت:۔ "خوشبو" دراصل کلی کا حجاب، شرم یا پردہ ہے۔ جب کلی بند ہوتی ہے تو گویا وہ پردے میں ہوتی ہے۔ نسیم کے چلنے سے جوں جوں کلی کھلتی جاتی ہے خوشبو اڑتی جاتی ہے۔ گویا کلی کا حجاب ٹوٹتا جاتا ہے۔
بنے گی ہاتھ، مرے پیرہن کو کھولے گی کلید ہو کے یہ قفلِ دہن کو کھولے گی	بچو! آپ جانتے ہیں کہ ساری نظم کلی کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ "مرے پیرہن کو کھولے گی" کون کہہ رہی ہے۔
	١۔ اچھا بچو! یہ بتائیے کہ "بنے گی ہاتھ" کہنے میں کلی کا اشارہ کس کی طرف ہے۔؟
	٢۔ نسیم ہاتھ بنکر کلی کے پیرہن کو کس طرح کھولیگی؟
	٣۔ ہاتھ بن کر پیرہن کو کھولنے سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
	وضاحت: کلی جب بند ہوتی ہے تو گویا وہ لباس پہنے ہوئے ہوتی ہے اور جب ہوا کے چلنے سے کلی کھلتی ہے

اور اس کی پنکھڑیاں الگ الگ ہو جاتی ہیں تو گویا اس کا راس کُھل جاتا ہے۔

۴۔ قفلِ دہن سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

۵۔ کلید ہو کے یہ قفل دہن کو کھولے گی، اس کا مطلب کیا ہوا؟

وضاحت:۔ جس طرح چابی تالے کو کھولتی ہے اسی طرح ہوا منہ بند کلیوں کو کھلاتی ہے۔

جو میں ہنسوں گی تو گلچیں مجھے نہ چھوڑے گا
وہ سلسلہ مری حبِّ وطن کا توڑے گا

۱۔ کلی کے ہنسنے سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کلی کھل جائے گی تو کیا بنے گی؟

۳۔ پھولوں کو گل چیں کیا کرتے ہیں؟

اس موقع پر مندرجہ ذیل تقابلی شعر پیش کیا جائے گا

انجام گلوں کا دیکھا ہے جس روز سے میری آنکھوں نے
اے دوست یہ عالم ہے کہ ہنسی کے نام سے دل گھبراتا ہے

۴۔ جس جگہ ہم پیدا ہوتے ہیں اور پلتے بڑھتے ہیں وہ جگہ ہمارے لئے کیا کہلاتی ہے؟

۵۔ اس طرح کلی کا وطن کیا ہوا؟ (باغ)

۶۔ اگر کلی کو باغ سے توڑ لیں تو کیا ہوگا؟

۷۔ حُبِّ وطن یا وطن کی محبت کا سلسلہ کون توڑیگا؟

شجر کی شاخ نہ مجھکو نصیب پھر ہوگی
شعاعِ مہر نہ میرے قریب پھر ہوگی

۱۔ شجر کی شاخ کلی کو کیوں نصیب نہیں ہوگی؟

۲۔ اگر کلی کو شاخ سے توڑ لیا جائے تو کیا ہوگا؟

مواد درس	طریقۂ تدریس
	۳- سورج کی روشنی سے کلی کیوں محروم ہو جائے گی؟
کہاں یہ رات کو تاروں کی چھاؤں میں ہنسنا جگر چھدے گا، بنوں گی میں ہار یا گہنا	۱- سامنے کی تصویر میں بیٹھا ہوا شخص کیا کر رہا ہے؟ ۲- پھولوں کا ہار کس طرح بنایا جاتا ہے؟ ۳- سامنے بیٹھا ہوا شخص کس طرح ہار بنا رہا ہے؟ ۴- ہار بنانے میں کلی کا جگر کس طرح چھدے گا؟ ۵- جب کلیوں کو دھاگے میں پرو دیا جائے گا وہ کیا بن جائے گی؟
گلے پڑونگی میں جس کے وہ مل کے چھوڑیگا مرے لباس کی رنگت بدل کے چھوڑیگا	بچو! پہلے تو آپ یہ سمجھ لیں کہ لفظ "گلے پڑنا" کیا ہے؟ یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں زبردستی کسی سے مل بیٹھنے کی کوشش کرنا لیکن یہاں جن معنوں میں استعمال ہوا ہے اس کے معنی گلے میں پہننے کے ہیں یعنی ہم کلیوں اور پھولوں کو گلے کا ہار بنا لیتے ہیں۔ ۱- کلی کو ہار پہننے والوں سے کیا شکایت ہے؟ ۲- ہار پہننے والے کلیوں اور پھولوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ ۳- کلی کو مَلنے سے اس کی رنگت کیسی ہو جائے گی یا اس پر کیا اثر ہوگا۔؟
جفائیں سہنے کو شاید جہاں میں آئی میں ہوئی یہ چوک کہ حسن اور جان لائی میں	بچّو! ہم آپ کو کلی کی زبان میں اسی طرح کا ایک شعر اور سناتے ہیں:۔ جورِ گلچین و جفائے باغباں دیکھا کئے جو دکھایا تو نے وہ اے آسماں دیکھا کئے

طریقہ تدریس	موادِ درس
۱۔ جفائیں سہنے کو دنیا میں کون آتی ہے ؟ ۲۔ کلی یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ وہ دنیا میں جفائیں سہنے کو آئی ہے ؟ ۳۔ کلی سے کیا غلطی یا بھول ہوئی ؟ ۴۔ کلی نے اپنی زندگی اور حسن کو اپنی بھول یا چوک کیوں قرار دیا ہے ؟ بچّو! اسی خیال کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں یوں ادا کیا ہے، یہ جانتے کہ جو چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے	
۱۔ کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈرا و گلچیں ، یہ کون کہہ رہی ہے ؟ ۲۔ شاعر کے یہ الفاظ کلی کی زبان میں کس قسم کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں ؟ اس شعر میں کلی فریاد کرتی ہوئی کہہ رہی ہے کہ کوئی تو گلچیں سے یہ کہدے وہ خدا سے ڈرے ۔ خدا کا خوف کرے ۔ ۳۔ اس شعر میں کون بے زبان ہے ؟ ۴۔ کلی کس سے کہہ رہی ہے کہ اس پر ستم نہ کر" ؟ ۵۔ کلی پر گلچیں کس طرح ستم کرتا ہے ؟	کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈر، او گلچیں یہ بے زباں ہے، نہ اس پر ستم کر او گلچیں
۱۔ "وہ کیا سنے گا اسے" اس میں کلی کا اشارہ کس کی طرف ہے ؟ ۲۔ گلچیں کو کس چیز کا لالچ ہے ؟	وہ کیا سنے گا اسے کوڑیوں کا لالچ ہے طمع بے سخت بری چیز، شوق ہیچ ہے

طریقہ تدریس	مواد درس
۳۔ آخر میں شاعر نے کس چیز کو بُرا کہا ہے ؟	

استحسانِ نظم

نظم کے استحسان برقرار رکھنے کے لئے نظم کو دوبارہ موثر انداز میں پڑھا جائیگا

گھر کا کام

نظم کے دوسرے اور تیسرے شعر کا مطلب لکھ کر لائیے ۔

تاریخ ۱۲ مئی ۱۹۷۲ء

جماعت ہشتم

مضمون اردو نظم

عنوان "راوی میں کشتی"

اشیائے امدادی ۱۔ الفاظ و معنی کا چارٹ

۲۔ تقابلی اشعار کا چارٹ

۳۔ حفیظ جالندھری کی تصویر

۴۔ تمہیدی نظم کا چارٹ

۵۔ نظم سے متعلق ایک تصویر (آسمان پر چاند اور اس کا عکس پانی میں)

۶۔ ایک تصویر جس میں دریا میں کشتی اور اس میں ایک شخص اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔

۷۔ دوسری تصویر جس میں جہانگیر کا مقبرہ، بارہ دری اور راوی کا کنارہ دکھایا گیا ہے۔

مقاصدِ عام: ۱۔ موثر انداز میں نظم خوانی کرنے کی ترغیب دینا

۲۔ قوتِ تخیل کی نشو و نما کرنا۔

۳۔ ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا

مقاصد خاص: ۱۔ طلباء کو راوی کے قدرتی اور دلکش مناظر سے روشناس کرانا

۲۔ شاعر کے کلام کی خصوصیات سے آگاہ کرنا۔

تمہید: ۔ مندرجہ ذیل شعر سنا کر چند سوالات کئے جائیں گے۔

۵۔ چاندنی رات اور دریا کے کنارے کا سماں

منعکس نکھرے ہوئے پانی میں حسنِ کہکشاں

۱۔ اس نظم میں شاعر نے کس وقت کا منظر پیش کیا ہے؟

۲۔ چاندنی رات میں ہر چیز کیسی نظر آتی ہے؟

اعلان سبق: آج ہم اسی قسم کے منظر کے متعلق ایک نظم "راوی میں کشتی" پڑھیں گے۔

شاعر کا تعارف | محمد حفیظ نام۔ حفیظ ہی تخلص۔ ابوالاثر کنیت ۱۹۰۰ء میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے اردو شاعری سے رغبت تھی حفیظ نے شعروشاعری کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنے کا تہیہ کیا، اور "شاہ نامہ اسلام لکھا جو انکی شہرت کا باعث بنا۔

حفیظ نے نظموں کے ساتھ ساتھ اردو میں گیت کی روایت کو بھی مستحکم کیا۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں ایک خاص قسم کی فضا اور موسیقی نظر آتی ہے جس سے ہر صاحبِ ذوق لطف اٹھاتا ہے پاکستان کا قومی ترانہ بھی حفیظ ہی کا لکھا ہوا ہے۔

نظم خوانی: مثالی نظم خوانی کے بعد چند طلبہ سے نظم پڑھوائی جائے گی۔

مواد درس	طریقۂ تدریس
بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل یا کسی ساحر نے ساکن کردیا دریائے نیل	**تفہیمی و استحسانی سوالات** ۱۔ شاعر نے آسماں کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟ ۲۔ نتھرا ہوا پانی کیسا ہوتا ہے؟ ۳۔ یہاں پر کیا چیز نتھرے ہوئے پانی جیسی شفاف ہے؟ ۴۔ نیلا رنگ کس چیز کو ظاہر کرتا ہے؟ ۵۔ یہ کون سا دریا بہہ رہا ہے؟ ۶۔ دریائے نیل کو کس نے ساکن کر دیا ہے؟

مواد درس	طریقہ تدریس
	۷۔ شاعر نے آسمان کو اور کس چیز سے تشبیہہ دی ہے؟ اسی خیال کو دوسرے شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے، ع اس قدر شفاف گردوں جیسے ہر تصویرِ آب۔ اور اس آبِ رواں پر بہہ رہا ہے ماہتاب۔ **تصویر آویزاں کر کے**
کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے	۱۔ تصویر میں آسمان کا رنگ کیسا نظر آ رہا ہے؟ ۲۔ شاعر نے نیلگوں وسعت کا لفظ کس لئے استعمال کیا ہے؟ ۳۔ شاعر کو آسمان کیسا لگ رہا ہے؟ ۴۔ فضا پرسکون کیوں ہے؟ ۵۔ شاعر نے سکوت انگیز کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟ ۶۔ چاند کی روشنی کا اس منظر پر کیا اثر ہو رہا ہے؟ ۷۔ اس دلکش روشنی میں چاند کا چہرہ کیسا لگ رہا ہے؟ **تصویر آویزاں کر کے**
شہ درے کے نوحہ خواں مینار بھی خاموش ہیں مقبرہ بھی باغ میں اشجار بھی خاموش ہیں	۱۔ یہ کس وقت کا منظر ہے؟ ۲۔ عام طور پر لوگ اپنے دن رات کیسے گذارتے ہیں؟ ۳۔ رات کو فضا کیسی ہوتی ہے؟ ۴۔ اس تصویر میں آپ کو کیا کیا نظر آ رہا ہے؟ ۵۔ بتائیے دریائے راوی کے کنارے کون سے مغل بادشاہ کا مقبرہ ہے؟

مواد درس	طریقہ تدریس
	۶۔ نوحہ خوانی کس موقع پر کی جاتی ہے ؟
	۷۔ نوحہ خواں کون ہوتے ہیں ؟
	۸۔ شہ درے کے مینار رات کی خاموشی میں کس وجہ سے نوحہ خواں ہیں ؟
	تصویر آویزاں کرکے
اس طرف اجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے	۱۔ بارہ دری کہاں ہے ؟
اک گئے گذرے پُرانے خواب میں مدہوش ہے	۲۔ اس دریا کا نام کیا ہے ؟
	۳۔ یہ بارہ دری اجڑی ہوئی کیوں ہے ؟
	۴۔ تاریخی عمارات کو دیکھکر ہم کو کیا یاد آتا ہے ؟
	۵۔ ان یادوں کو شاعر نے کن الفاظ میں ادا کیا ہے ؟
	۶۔ یہاں پر خواب کون بکھیر رہا ہے ؟
	۷۔ یہ دراصل کس کے خواب ہیں جو بارہ دری سے وابستہ کر دیئے ہیں ؟
	۸۔ بارہ دری پر کیا کیفیت طاری ہے ؟
	۹۔ اس کو اس حالت میں کون دیکھ رہا ہے ؟
نغمہ سو یا بربط آبِ رواں کی گود میں	۱۔ بربط کسے کہتے ہیں ؟
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں	۲۔ بربط کی آواز کہاں سے آرہی ہے ؟
	۳۔ پانی کی آواز میں کیا بات ہے جو بربط سے اس کا مقابلہ کیا ہے ؟

طریقۂ تدریس	مواد درس
۴۔ رات کی آمد کا پانی پر کیا اثر ہو رہا ہے ؟ ۵۔ آواز کے کم ہو جانے کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ ۶۔ دریائے راوی کی اس خاموشی کو کس سے تشبیہ دی گئی ہے ؟	
تصویر آویزاں کر کے	
۱۔ آسمان پر کیا نظر آ رہا ہے ؟ ۲۔ چاند اور کہاں نظر آ رہا ہے ؟ ۳۔ بیک وقت چاند دو جگہ کس طرح نظر آ رہا ہے ؟ ۴۔ چاند کا عکس کہاں پڑ رہا ہے ؟ ۵۔ چاند کس جگہ ساکن ہے ؟ ۶۔ بے تاب کس جگہ ہے ؟ ۷۔ کس وجہ سے بے تاب ہے ؟ ۸۔ لہریں کس طرح پیدا ہوتی ہیں ؟	چاند بالائے فلک ہے چاند زیرِ آب ہے چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بیتاب ہے
تصویر آویزاں کر کے	
۱۔ اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ ۲۔ شاعر نے کون سے دھارے کا ذکر کیا ہے ؟ ۳۔ بتائیے دریا کا دھارا چاندی کی طرح کیوں ہو گیا ہے؟ ۴۔ دریا میں اور کیا چیز آپ دیکھ رہے ہیں ؟ ۵۔ آپ کے خیال میں کشتی میں کون سوار ہے ؟ ۶۔ شاعر کس عالم میں ہے ؟	اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں خواب کے آغوش میں سب دیکھتا جاتا ہوں میں

طریقۂ تدریس	موادِ درس
۷۔ لیکن یہ منظر شاعر کو کیسا لگ رہا ہے ؟ اسی خیال کو علامہ اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے ؎ سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں خبر نہیں مجھے لیکن کھڑا ہوا ہوں میں	
۱۔ شاعر نے اپنی کشتی کو کس چیز سے تشبیہہ دی ہے ؟ ۲۔ شاعر نے کشتی کو آغوشِ خواب کیوں کہا ہے ؟ ۳۔ راوی کے پرکیف منظر کے متعلق شاعر کے کیا تصورات ہیں ؟ ۴۔ شاعر پر بے خودی کی کیفیت کیوں طاری ہے ؟ ۵۔ شاعر کو کس بات کا ہوش ہے ؟	یہ مری کشتی بھی گویا خواب کی آغوش ہے میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے
اعادہ اعادہ کے طور پر نظم دوبارہ پڑھی جائے گی اور طلباء سے بھی نظم خوانی کروائی جائے گی۔ **گھر کا کام** اس نظم کا جو شعر آپ کو پسند آیا ہو اس کی تشریح کیجئے	

تاریخ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۲ء

جماعت نہم

مضمون اردو (نظم)

عنوان "صبح کا سماں"

تدریسی اعانتیں : میر انیس کی تصویر
صبح کے تین خوبصورت مناظر
تقابلی اشعار کے چارٹ
تمہیدی نظم، شاعر کا تعارف، نظم، الفاظ اور معنی پر مشتمل
پچاس مطبوعہ کاپیاں

معلوماتِ سابقہ :- طلباء اردو کے بہت سے شعراء کے ناموں سے واقف ہیں۔
اور ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں پڑھ چکے ہیں۔

مقاصد عام طلباء میں شعر و شاعری کا شوق پیدا کرنا۔
طلباء کو شعراء کے تخلیقی کارناموں کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا۔
ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنا۔

مقاصد خاص نظم "صبح کا سماں" پڑھانا اور اشعار کے مفہوم سے طلباء کو
آگاہ کرنا۔
قوتِ استحسان کو فروغ دینا اور شعر سمجھنے کی صلاحیت کو جلا دینا

تمہید طلباء کو موضوع سے قریب تر لانے کے لئے میر انیس کی نظم "نمودِ صبح"
کے دو بند پیش کر کے چند سوالات کئے جائیں گے۔

نمودِ صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں — چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گُلِ مہتاب پر خزاں — مُرجھا کے رہ گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے — (انیسؔ)

تمہیدی سوالات :- یہ نظم کس شاعر کی ہے ؟ (انیسؔ)
انیسؔ نے اس نظم میں کس وقت کا منظر پیش کیا ہے (صبح کا)

اعلانِ سبق :- آج ہم میر انیس کی ایک اور نظم "صبح کا سماں" پڑھیں گے اس میں بھی انہوں نے نہایت خوبصورت انداز میں صبح کے منظر کو پیش کیا ہے

پیشکش ادبی و استحسانی فضا کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے نظم کو ایک جزو میں پیش کیا جائے گا۔

شاعر کا تعارف

میر ببر علی نام، انیسؔ تخلص تھا۔ میر خلیق کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، لیکن عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذارا۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔ میر صاحب کو قدرت نے شاعر پیدا کیا اور شاعری ورثے میں پائی۔ مرثیہ گوئی کو انہوں نے کمال تک پہنچایا۔ جذبات کی ترجمانی، واقعہ نگاری، تخیل کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کا اعتدال، سلاست روانی، فصاحت و دل آویزی، ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اپنے شاعرانہ کمال کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

تعریف میں چشمے کو سمندر میں ملادوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملادوں
ذرّے کی چمک مہرِ منور سے ملادوں — کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملادوں
گلدستۂ معنیٰ کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

انہیں مناظر قدرت کے بیان میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ان کی نظم "صبح کا سماں" میں بھی اس منظر کشی کا کمال موجود ہے۔

انیس کے مراثی پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں ان کے سلام اور رباعیاں بے شمار ہیں۔

مثالی نظم خوانی: ۔ اعلان نظم کے بعد مثالی نظم خوانی کی جائے گی جس میں خوش خوانی کے جملہ تقاضوں مثلاً صحیح تلفظ، روانی، تاثر اور کیفیات وغیرہ کا خاص خیال رکھا جائے گا۔

تقلیدی نظم خوانی طلباء: ۔ بعد میں چند طلباء سے نظم خوانی کرائی جائے گی اور ان کے تلفظ اور دیگر اوصافِ نظم خوانی پر توجہ دی جائے گی۔

اصلاح تلفظ: طلباء جن الفاظ کا تلفظ غلط کریں گے انہیں تختۂ سیاہ پر اعراب لگا کر لکھ دیا جائے گا۔ اور نظم خوانی کے فوراً بعد دیگر طلبہ کی مدد سے اصلاح کرائی جائے گی۔

الفاظ اور معنیٰ: ۔ مندرجہ ذیل مشکل الفاظ کے معنی تحریری صورت میں طلبہ کو پہلے ہی دے دیئے جائیں گے تاکہ ادبی و استحسانی فضا میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔

الفاظ	معنیٰ	الفاظ	معنیٰ
پھولنا	ظاہر ہونا۔ نمودار ہونا	اخضری	سبز رنگ کا
شفق	سرخی، جو طلوع آفتاب سے قبل نمودار ہوتی ہے	سرگرم ہونا	مصروف ہونا
		دم بدم	لمحہ بہ لمحہ
چرخ	آسمان	مرغانِ باغ	باغ کے پرندے

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لالہ	سرخ پھول جس کے درمیان کالا داغ ہوتا ہے۔	طاعت گذار	عبادت گذار
		آب وتاب	چمک دمک
لالہ زار	وہ جگہ جہاں لالہ کے پھول بکثرت ہوں	خوش الحانی	اچھی آواز
		بہم	مل کر
انجم	نجم کی جمع ستارے	مینائے لاجورد	نیلے رنگ کا شیشہ
		کچھار	وہ جھاڑیاں جہاں شیر رہتا ہے۔ دریا کے قریب کی زمین۔ یہاں دریا کے قریب کی زمین مراد ہے۔
گیاہ	گھاس		

موادِ درس	طریقۂ تدریس
پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہار صبح	**تفہیم اشعار** آسان اور واضح سخن فہمی کے لئے ایک ایک شعر کا مطالعہ کیا جائے گا۔ سوالات کے ذریعہ شعر کے مفہوم ومطلب کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی اس کے علاوہ حسب ضرورت وضاحت بھی کی جائے گی۔ (تصویر پیش کرتے ہوئے) اس تصویر میں آسمان پر کیسا رنگ پھیلا ہوا ہے ؟ اس سرخی کو کیا کہتے ہیں ؟ شفق کو شاعر نے کس سے تشبیہ دی ہے ؟ لالہ زار سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے ؟ گلزار شب خزاں ہوا سے شاعر کی کیا مراد ہے ؟

خزاں کے بعد کونسا موسم آتا ہے؟

اب رات پر کس کی بہار آئی ہے؟

تقابلی شعر

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
فلک پر کھلا ہے عجیب لالہ زار
(اسماعیل میرٹھی)

کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گذارِ صبح

آسماں نے صبح پر کیا چیز نچھاور کی؟ (ستارے)

آسمان نے صبح پر ستارے کیوں نچھاور کئے؟

صبح کے وقت کون ذکرِ حق کرتا ہے؟

صبح کے وقت عبادت کیوں کرتے ہیں؟

تقابلی شعر ؎

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں (انیس)

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کِھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

باغ میں گلاب کا پھول کھلتا ہوا کیسا لگتا ہے؟

صبح کے وقت آسمان پر کیا چیز طلوع ہو رہی ہے؟

سورج کے نکلنے کو شاعر نے کس کے کھلنے سے تشبیہ دی ہے؟

یہ تشبیہ کیوں دی گئی؟

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم

صبح کے وقت کیسی ہوا چل رہی ہے؟

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کیسے چل رہے ہیں؟

صبح کی ہوا میں کس کی خوشبو شامل ہوتی ہے؟

تصویر میں دیکھکر بتائیے کہ باغ میں کون چہچہا رہا ہے۔

طریقۂ تدریس	مواد درس
یہ پرندے کیوں چہچہا رہے ہیں ؟	
اس تصویر میں پانی کہاں بہتا ہوا نظر آرہا ہے ؟	وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
نہر کا پانی کیسا ہے ؟	سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
نہر کا پانی کیسے بہہ رہا ہے ؟	
اس وقت شاعر کو باغ کا موسم کیسا محسوس ہو رہا ہے ؟	
خوشگوار موسم سے کیا مراد ہے ؟	
تقابلی اشعار برائے شعر ۴+۵	
پرند نغمہ ریز ہیں ہوائیں عطر بیز ہیں	
چمن کی ہر جاگ اٹھی ہر ایک ہر جاگ اٹھی	
ترنم ہزار سے گلوں کو وجد آ گئے	
(حفیظ جالندھری)	
تصویر میں دیکھ کر بتائیے ۔	
باغ میں صبح کے وقت کیا چیز چمک رہی ہے ؟	کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
شبنم کے قطرے کیسے لگ رہے ہیں ؟	تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
شاعر نے موتیوں سے تشبیہ کیوں دی ؟	
موتیوں سے کس کا دامن بھرا ہوا ہے ؟	
سبزے کے اوس کھانے سے شاعر کی کیا مراد ہے ؟	
یہ منظر کیسا لگ رہا ہے ؟	
(تصویر دیکھ کر بتائیے)	

مواد درس	طریقہ تدریس
وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد مخمل سی وہ گیاہ وگل سبز و سرخ و زرد	آسمان پر کس کی سرخی ہے ؟ اس کے علاوہ اور کیسا نظر آ رہا ہے ؟ شاعر نے آسمان کو مینائے لاجورد کیوں کہا ہے ؟ باغ کی گھاس کیسی لگ رہی ہے ؟ شاعر نے گھاس کو مخمل سے تشبیہ کیوں دی ہے ؟ باغ میں کس رنگ کے پھول کھلے ہیں ؟ تقابلی شعر چمن اور دشت میں ہے ہر طرف انبار پھولوں کا جدھر دیکھو زمیں پہنے ہوئے ہے ہار پھولوں کا
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد	باغ میں کیسی ہوا چل رہی ہے ؟ تصویر دیکھ کر بتائیے کہ باغ میں پھول کیسے لگ رہے ہیں ؟ اگر باغ کی ہوا میں گرد و غبار شامل ہو تو کیا ہوگا ؟ ٹھنڈی ہوا کس بات سے ڈر کر باغ میں قدم رکھ رہی ہے ؟ اس جگہ وضاحت کیجائے گی کہ یہ بہت نازک خیال ہے کیونکہ پھول تو نازک ہوتا ہی ہے اور دامنِ گل اس سے بھی نازک۔ اسی وجہ سے ہوا پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے ۔

طریقہ تدریس	موادِ درس
تصویر دیکھ کر بتایئے کہ باغ میں کس رنگ کے پھول زیادہ ہیں؟ ان سرخ پھولوں کا کیا نام ہے ؟ لالہ زار دیکھ کر شاعر کو کیسا محسوس ہوا ؟ اچھا منظر دیکھ کر انسان کو کس چیز کا احساس ہوتا ہے؟ شاعر کو کس جگہ سردی محسوس ہوئی ؟	دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

استحسان کلی

نظم کا استحسان برقرار رکھنے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ طلباء پر مفہوم و مطلب کے واضح ہو جانے کے بعد کیا اثر پڑا، نظم کی دو بارہ نظم خوانی کرائی جائے گی۔

تفویض کار

میر انیس نے نظم "صبح کا سماں" میں جس طرح منظر کشی کی ہے اسے اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

تاریخ ۲ر اپریل ۱۹۷۲ء

جماعت دہم

مضمون اُردو (نظم)

عنوان "رات اور شاعر"

اشیائے امدادی ۱۔ علامہ اقبال کی تصویر

۲۔ علامہ اقبال کا تعارف (چارٹ)

۳۔ الفاظ و معنی کا چارٹ

۴۔ ایک تصویر جس میں شاعر کو چاندنی میں پریشان پھرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

۵۔ ایک چارٹ جس میں دریا کو خاموشی سے بہتے ہوئے اور آبادیوں کو نیند میں ڈوبا ہوا دکھایا گیا ہے۔

۶۔ تصویر جس میں شاعر کو روتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

۷۔ تصویر جس میں ایک قبر پر شمع خاموشی سے جل رہی ہے۔

معلومات سابقہ طلبہ اردو زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں اور متعدد نظمیں پڑھ چکے ہیں۔

۱۔ مقاصد عام محاورات اور تشبیہات کے برمحل استعمال اور ایک ہی بات کو مجاز کے سہارے مختلف انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ شعر و شاعری کے ذوق کو ابھارنا جذبۂ استحسان پیدا کرنا۔ طلباء کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنا۔

۲۔ مقاصد خاص ۱۔ طلبہ کو علامہ اقبال کی نظم "رات اور شاعر" کا مفہوم سمجھانا

۲۔ نظم کے ذریعہ اقبال اور ان کے کلام کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

۳۔ قومی و ملی خدمات کی تڑپ پیدا کرنا

تمہید:- علامہ اقبال کی تصویر آویزاں کرتے ہوئے طلباء سے مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے۔

۱۔ یہ کس کی تصویر ہے؟

۲۔ علامہ اقبال کیوں مشہور رہیں؟

۳۔ ان کی شاعری میں کیا کیا خوبیاں ہیں؟

(اس جگہ طلبہ کو شریک کرکے کلام اقبال کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جائیگا جو شاعر اور رات کی نظم سے نمایاں ہیں)

اعلان سبق- اچھا، آج ہم علامہ اقبال کی ایک نظم "رات اور شاعر" پڑھیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ اقبال "شاعر اور رات" کے مکالمے کے پردے میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اور کس طرح کہا ہے؟

پیشکش: طوالت کے باعث نظم کو دو جزو میں پیش کیا جائیگا۔

شاعر کا تعارف

شیخ محمد اقبال نام اور اقبال تخلص تھا۔ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے پہلے سیالکوٹ، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ وہیں سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور یورپ کی علمی ترقیوں سے پورا فائدہ اٹھاکر وطن واپس آئے۔ ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا مقصد ملک و قوم کی اصلاح اور مسلمانوں کی فلاح تھا۔ اقبال اعلیٰ درجے کے مفکر اور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دل پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے اور ذہن کو بھی جھنجھوڑتی ہے۔ ان کی شاعری نے اردو شاعری کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ یہ موڑ قومی و ملی زندگی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ اقبال کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس کے ذریعہ حیات انسانی کو تازہ اور شگفتہ بنانے اور انسان کو جینے کا حوصلہ دیا ہے بچے جوان اور بوڑھے سب کے لئے ان کی شاعری ایک پیغام کی حیثیت رکھتی ہے یہ پیغام در اصل زندگی کو روشن اور متحرک بنانے کا پیغام ہے اقبال نے ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا اور شاہی مسجد لاہور میں مدفون ہو

مثالی نظم خوانی:۔ پہلے طلبہ کے سامنے نظم خوانی کا نمونہ پیش کیا جائے گا اور خوش خوانی کے تمام اوصاف کا خیال رکھا جائے گا۔

طلباء کی نظم خوانی:۔ اس کے بعد چند طلبہ سے نظم خوانی کرائی جائے گی اور خوش خوانی کے تمام تقاضوں کا خاص خیال رکھا جائے گا۔

اصلاح تلفظ: طلبہ نظم خوانی کے دوران جن الفاظ کا تلفظ غلط ادا کریں گے انہیں اعراب لگا کر نظم خوانی کے فوراً بعد درست کرایا جائے گا۔

جزو اول

طریقہ تدریس	نفس مضمون
تفہیمی سوالات	**رات**
۱۔ تصویر میں رات کیسی نظر آ رہی ہے ؟	کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
۲۔ رات کس سے مخاطب ہے ؟	خاموش صورت گل مانند بُو پریشاں
۳۔ شاعر چاندنی میں کس طرح پھر رہا ہے ؟	
۴۔ چاندنی رات میں پھول کیسے نظر آ رہے ہیں ؟	
۵۔ شاعر اور خاموش پھولوں میں کیا مناسبت ہے ؟	
۶۔ پھول جب کھلتا ہے تو خوشبو کس طرح پھیل جاتی ہے ؟	
۷۔ شاعر کے نزدیک خوشبو پھول سے نکل کر کس حال میں ہوتی ہے ؟	
۸۔ چاندنی میں پھرتا ہوا شاعر کس حال میں ہے ؟	
۹۔ شاعر کے پریشاں حال کو خوشبو کی طرح سے پریشان کیوں کہا گیا ہے ؟	
تصویر کی مدد سے بتائیے :۔	

نفس مضمون	طریقہ تدریس
تاروں کے موتیوں کا شائد ہے جوہری تو	۱۔ آسمان پر کیا کیا نظر آرہا ہے ؟
مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو	۲۔ شاعر نے تاروں کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے ؟
	۳۔ شاعر کس وقت پریشان حال گھوم رہا ہے ؟
	۴۔ رات کے وقت دنیا عام طور پر کیا کرتی ہے ؟
	۵۔ شاعر اس وقت کیا کر رہا ہے ؟
	۶۔ جوہری کیا کام کرتا ہے ؟
	۷۔ شاعر کو تاروں کے موتیوں کا جوہری کیوں کہا گیا ہے ؟
	۸۔ دریائے نور سے آپ کیا مطلب سمجھتے ہیں ؟
	۹۔ شاعر نے کس چیز کو نور کا دریا کہا ہے ؟
	۱۰۔ چاندنی کا یہ سماں کس کی مانند لگ رہا ہے ؟
	۱۱۔ چاندنی کو اپنا دریائے نور کس نے کہا ہے ؟
	۱۲۔ مچھلیاں کہاں پائی جاتی ہیں ؟
	۱۳۔ چاندنی کے اس دریا میں شاعر کس کی مانند ہے ؟
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے	۱۔ ستارے کہاں ہوتے ہیں ؟
رفعت کو چھوڑ کر جو بستی میں جا لیا ہے	۲۔ تارے کس وقت نکلتے ہیں ؟
	۳۔ آسمان کو اپنی جبین کس نے کہا ہے ؟
	۴۔ ستارے ٹوٹ کر کہاں گر جاتے ہیں ؟
	۵۔ آسمان بہت بلند ہے اور زمین اس کے مقابلے میں کیسی ہے ؟

طریقۂ تدریس	نفس مضمون
۶۔ رات کے وقت جبکہ آسمان پر تارے ہیں زمین پر پریشان پھرتا ہوا شاعر کیسا لگ رہا ہے؟	
۱۔ گرداب کسے کہتے ہیں؟ ۲۔ شاعر نے گرداب کو کیا کہا ہے؟ ۳۔ کس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی چیز سو چکی ہے؟ ۴۔ دریا سو چکا ہے یہ بات کس کی آنکھ کے بند ہونے سے ظاہر ہو رہی ہے؟ ۵۔ دن کے وقت دریا میں لہریں اٹھتی ہیں شاعر کے نزدیک رات کے وقت لہریں کہاں سو گئی ہیں؟ ۶۔ تصویر میں خاموش دریا کیسا لگ رہا ہے؟	دریا کی تہہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے ساحل سے لگ کے موج بیتاب ہو گئی ہے
۱۔ دن کے شور و غل سے انسانوں کی دنیا کیسی معلوم ہوتی ہے؟ ۲۔ ہنگامہ آفریں سے آپ کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ ۳۔ اور رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو انسانوں کی آبادی کیسی لگتی ہے؟ ۴۔ تصویر میں کون سے وقت کا منظر دکھایا گیا ہے؟ ۵۔ رات کے اس ویران ماحول میں کون جاگ رہا ہے؟ ۶۔ شاعر کیوں جاگ رہا ہے؟	بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے یوں سو گئی ہے جیسے آبادہی نہیں ہے

طریقہ تدریس	نفس مضمون
۱۔ انسان اگر خوش ہو تو سکون سے رات کو سو جاتا ہے، لیکن اگر اسے کچھ پریشانی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ ۲۔ شاعر کیوں نہیں سو سکا ہے؟ ۳۔ رات کو جادو کائنات پر کس طرح چھا گیا ہے؟ ۴۔ لیکن شاعر پر اس جادو کا اثر کیا ہوا ہے؟ ۵۔ شاعر کے اس طرح جاگتے رہنے پر رات کیا کہہ رہی ہے؟	شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے آزاد رہ گیا تو کیوں کر مرے فسوں سے

جزو دوم

۱۔ شاعر کس سے مخاطب ہے؟ ۲۔ رات کیسی ہے؟ ۳۔ چاندنی کی کھیتی سے آپ کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ ۴۔ شاعر تصویر میں کیا کر رہا ہے؟ ۵۔ گہر کس چیز کو کہا گیا ہے؟ ۶۔ شاعر کس وقت آنسو بہاتا ہے؟ ۷۔ باغ میں صبح کے وقت پتوں پر کس کے قطرے ہوتے ہیں؟ ۸۔ شبنم کس وقت پتوں پر نظر آتی ہے؟ ۹۔ شاعر نے شبنم کو کس کے آنسو بتایا ہے؟ ۱۰۔ رات کو دنیا سے چھپ کر شاعر کس طرح روتا ہے؟ ۱۱۔ شاعر کے نزدیک صبح کا رونا کس بات کو ظاہر کرتا ہے؟	"شاعر" میں تیرے چاندنی کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں چھپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں

نفسِ مضمون	طریقہ تدریس
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں	۱۔ شاعر کو کس وقت روتے ہوئے دکھایا گیا ہے؟
عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں	۲۔ شاعر دن میں کیوں نہیں روتا؟
	۳۔ شاعر رات کے اندھیرے میں کیوں روتا ہے؟
مجھ میں پنہاں ہے جو فریاد سناؤں کس کو؟	۱۔ شاعر کیا چاہتا ہے؟
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟	۲۔ شاعر کی بات سننے والا کون ہے؟
	۳۔ وہ اپنی بات دنیا کو کیوں نہیں سنا سکتا؟
	۴۔ تپشِ شوق سے آپ کیا مطلب سمجھتے ہیں؟
	۵۔ شاعر کس بات پر رو رہا ہے؟
	۶۔ شاعر کس آگ میں جل رہا ہے؟
	۷۔ شاعر کا دکھ کون محسوس کر رہا ہے؟
صفتِ شمعِ لحد مردہ ہے محفل میری	۱۔ شاعر کی شاعری کا کیا مقصد ہوتا ہے؟
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری	۲۔ شاعر اپنی بات کہاں سنانا چاہتا ہے؟
	۳۔ مگر شاعر کی محفل کیسی ہے؟
	۴۔ محفل کے مردہ ہونے سے شاعر کو دکھ کیوں ہے؟
	۵۔ محفل کو جگانا کون چاہتا ہے؟
	۶۔ شاعر محفل کو کیوں جگانا چاہتا ہے؟
	۷۔ قبر پر جلی ہوئی شمع سے قبر کے اندر کیا فرق پڑتا ہے؟
	۸۔ شاعر کی شاعری کس کی مانند بیکار ہے؟
	۹۔ ابھی شاعر اپنی منزل سے کتنی دور ہے؟
	۱۰۔ شاعر اپنا دکھ کسے سنا رہا ہے؟

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
	۱۱- پھر شاعر اپنی منزل کو کس طرح پا سکتا ہے؟
عہدِ حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو	۱- شاعر کی محفل کیسی ہے؟ ۲- مردہ لوگ کیسے ہوتے ہیں؟ ۳- علامہ اقبال کا پیغام کن لوگوں کے لئے ہے؟ ۴- اسلام کے شروع میں مسلمان کیسے تھے؟ ۵- آج کل کے مسلمان کیسے ہو گئے ہیں؟ ۶- عہدِ حاضر سے آپ کیا مطلب سمجھتے ہیں؟ ۷- مسلمانوں کیلئے موجودہ دور کے طور طریقے کیسے ہیں؟ ۸- کس راہ پر چلنے میں مسلمانوں کا نقصان ہے؟ ۹- پھر بھی مسلمان اس راہ پر کیوں چل رہے ہیں؟
ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں	۱- شاعر کا پیغام کیا ہے؟ ۲- شاعر اپنا پیغام دنیا کو کیوں نہیں سنا سکتا؟ ۳- اپنا پیغام نہ سنا سکنے سے شاعر پر کیا اثر ہوتا ہے؟ ۴- گھبرا کے شاعر کیا کرتا ہے؟ ۵- شاعر اپنے دل کی بات کیسے بتا دیتا ہے؟ ۶- ستاروں سے اپنی بات شاعر کس وقت کہتا ہے؟ ۷- شاعر یہ بات کس سے کہہ رہا ہے؟

اعادۂ کلّی

۱۔ رات کس سے مخاطب ہے؟

۲۔ شاعر چاندنی میں کس طرح پھر رہا ہے؟

۳۔ رات کے اس ماحول میں دنیا کیا کر رہی ہے؟

۴۔ شاعر اس وقت کیا کر رہا ہے؟

۵۔ رات شاعر سے کیا کہہ رہی ہے؟

۶۔ شاعر کس سے مخاطب ہے؟

۷۔ رات کو جاگ کر شاعر کیا کرتا ہے؟

۸۔ شاعر رات کو کیوں روتا ہے؟

۹۔ شاعر کو کس بات کا دکھ ہے؟

۱۰۔ رات کو شاعر اپنا دکھ کسے سناتا ہے؟

گھر کا کام

رات اور شاعر کی گفتگو اپنے الفاظ میں لکھئے۔

تصویری انشاء سے متعلق اشارات سبق کے نمونے

تاریخ ——— ۱۵ر اپریل ۱۹۷۲ء

جماعت ——— سوم

مضمون ——— اردو (تقریری انشاء)

عنوان ——— وعدہ خلافی

معلوماتِ سابقہ ——— بچے اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں

مقاصد تدریس :———

مقاصد عام | ۱ - مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ پیدا کرنا

۲ - مربوط اور مسلسل اظہار خیال کرنے کی عادت ڈالنا

مقاصد خاص | ۱ - بچوں میں ایفائے وعدہ کی عادت پیدا کرنا

۲ - وعدہ خلافی کی عادت سے نفرت پیدا کرنا

حاشیائے امدادی | سبق سے متعلق مندرجہ ذیل چارٹس جماعت میں آویزاں کئے جائیں گے

چارٹ نمبر ۱ : چوہے پھل کھاتے ہوئے ، اور درخت پر چڑھتے ہوئے

چارٹ نمبر ۲ : گاؤں کا چودھری بانسری والے سے بات کر رہا ہے ۔

چارٹ نمبر ۳ ۔ بانسری والا بانسری بجاتے ہوئے جا رہا ہے ۔

چارٹ نمبر ۴ ۔ بانسری والے کے پیچھے چوہے جا رہے ہیں ۔

چارٹ نمبر ۵ ۔ بانسری والے کے ساتھ چوہے بھی پانی میں کود گئے ہیں ۔

چارٹ نمبر ۶ ۔ بانسری والا چودھری سے پیسے مانگ رہا ہے ۔

چارٹ نمبر ۷ ۔ بانسری والے کے گرد بچے جمع ہیں ۔

تمہید | کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا جب فصل ہوتی تو اس کے کھیت سوکھ جاتے اس وجہ سے وہ پریشان رہتا تھا کسی دن کہیں جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک فقیر ملا۔ کسان نے سوچا شاید زندگی کا حل یہاں مل جائے، یہ سوچ کر وہ فقیر کے پاس گیا اور کہا بابا خدا سے دعا کرو کہ میری فصل اچھی ہو جائے تو میں آپ کو فصل کا چوتھائی حصہ دوں گا۔ فقیر نے دعا کی کھیت لہلہانے لگے کسان کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ فقیر نے وعدہ یاد دلایا، کسان نے مزید دعا کے لئے کہا، خدا کا کرنا اس مرتبہ بھی فصل اچھی ہو گئی۔ کسان کے دل میں پھر بے ایمانی پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ پھر کسان نے دعا کے لئے کہا۔ فقیر نے پھر دعا کی فصل بہت اچھی ہو گئی اور کسان سامان لاد کر فقیر کو دینے کے لئے چل دیا۔ راستہ میں دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر میں یہ سامان فقیر کو نہ دوں تو وہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔

غرض وہ سامان لیکر بازار بیچنے چل دیا۔ راستہ میں بڑے زور کی بارش آئی۔ بارش سے اتنا زبردست سیلاب آیا کہ کسان مع سامان کے بہہ گیا اور اس طرح اس کی بھی جان گئی۔

سوالات | ۱۔ کسان نے راستہ میں کیا دیکھا

۲۔ فقیر سے کسان نے کیا وعدہ کیا؟

اعلان سبق | بچو! آج ہم ایک اور ایسی ہی کہانی تصویروں کی زبانی پڑھائیں گے جس کا عنوان "وعدہ خلافی" ہے۔

پیش کش | زیر تدریس سبق ایک جز میں پیش کیا جائے گا۔

نفس مضمون	طریقہ تدریس
فراہمی مواد	
بہت دنوں کی بات ہے کہ یورپ کے ایک گاؤں میں ایک دفعہ خدا جانے	تصویر آویزاں کر کے مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے:۔

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
کہاں سے چوہے آ گئے۔ گھروں میں چوہے بازار میں چوہے۔ جدھر دیکھو چوہے ہی چوہے۔ یہاں تک کہ گرجا میں بھی چوہے تھے۔ گھروں میں چوہے کپڑے کتر لیتے، جوتے کاٹ ڈالتے۔ باورچی خانے میں گھس کر کھانے پینے کی چیزیں چٹ کر جاتے یہاں تک کہ درختوں پر چڑھ کر پھلوں تک نہیں چھوڑتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بڑے پریشان تھے۔ اس زمانے میں ایک اجنبی گاؤں میں آیا۔ دبلا پتلا اور ہنس مکھ۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت بانسری تھی۔ چوپال کے قریب پہنچا تو گاؤں کے چودھری نے اسے سلام کیا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے پوچھا۔ تم کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا میں بانسری بجاتا ہوں۔ ایسی سُریلی کہ آدمی تو آدمی چاہوں تو پرندوں اور جانوروں تک کو بانسری کی آواز سے اپنے پاس بُلا لوں۔ چودھری اچھل پڑا، خوش ہو کر بولا تب تو تم ہمارا ایک کام کرو۔ اس گاؤں	۱۔ تصویر دیکھ کر بتائیے کہ یہ کہاں کا منظر ہے؟ (گاؤں کا) ۲۔ گاؤں میں کیا نظر آ رہا ہے؟ ۳۔ چوہے گاؤں والوں کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں؟ ۴۔ چوہے کہاں کہاں نظر آ رہے ہیں؟ (ہر جگہ) ۵۔ گاؤں کے تمام لوگ کیا چاہتے ہوں گے؟ ۶۔ تصویر نمبر ۲ ۱۔ اس تصویر میں کیا نظر آ رہا ہے؟ (آدمی کھڑے ہیں) ۲۔ دبلے آدمی کے ہاتھ میں کیا ہے (بانسری) ۳۔ جو گاؤں کے فیصلے کرتا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟ (چودھری) ۴۔ سر پہ پگڑی باندھے کون شخص ہے؟ (چودھری) ۵۔ کون معلوم کر رہا ہے؟ (چودھری) ۶۔ چودھری نے بانسری والے سے کیا پوچھا؟ (کام کے بارے میں پوچھا) ۷۔ بانسری والے نے کیا جواب دیا ہوگا؟ (بانسری بجانا کام بتایا) اس موقع پر بتایا جائے گا کہ بانسری والے نے کہا کہ " ایسی سُریلی بانسری بجاتا ہے کہ آدمی تو آدمی وہ جانوروں اور پرندوں کو بھی اپنے پاس بلا سکتا ہے؟

طریقہ تدریس	نفس مضمون
۸۔ چودھری نے یہ باتیں سن کر کیا کیا؟ (خوش ہوگیا) ۹۔ جب آپ دوکاندار سے کوئی چیز لیتے ہیں تو اس کے بدلے کیا دیتے ہیں؟ (روپے) ۱۰۔ یہ شخص کیا مانگ رہا ہے؟ (روپیہ) ۱۱۔ بانسری والے نے کیا کہا ہوگا؟ (روپے مانگے ہونگے) ۱۲۔ چودھری نے کیا کہا ہوگا؟ (اچھا دیں گے) **تصویر نمبر ۳** ۱۔ اس تصویر میں کیا نظر آرہا ہے؟ (بانسری والا اور چودھری) ۲۔ بانسری والا کیا کر رہا ہے؟ (بانسری بجا رہا ہے) ۳۔ چودھری کیا کر رہا ہے؟ (خوش ہو رہا ہے) ۴۔ بانسری کی آواز سے کیا ہوا؟ (چوہے اکٹھے ہوگئے) ۵۔ بانسری والے کے گرد کیا نظر آرہے ہیں؟ (چوہے) **تصویر نمبر ۴** ۱۔ اس تصویر میں کیا نظر آرہا ہے؟ (چوہے اور آدمی) ۲۔ بانسری کی آواز سن کر چوہے کیا کر رہے ہیں؟ (چوہے پیچھے آرہے ہیں)	کے چوہوں کو بلاؤ اور کہیں دور چھوڑ آؤ۔ بانسری والے نے کہا کہ ایک ہزار روپے لوں گا۔ چودھری نے روپے دینے کا وعدہ کرلیا۔ بانسری والے نے بانسری بجانی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے چوہے دوڑ دوڑ کر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اور ہزاروں چوہوں کی فوج بانسری کی آواز پر اس کے پیچھے ہو گئی۔ بانسری والا گاؤں سے باہر ندی کے پاس پہنچا۔ چوہے اس کے پیچھے تھے۔ بانسری والا ندی میں داخل ہوا تو چوہے بھی پانی میں کود پڑے اور پانی کے تیز بہاؤ میں ڈوب کر مر گئے۔ بانسری والا گاؤں واپس آیا۔ وہاں گھر گھر خوشی منائی

نفس مضمون	طریقہ تدریس
جا رہی تھی ، بانسری والے نے چودھری سے ایک ہزار روپیہ مانگا، تو وہ صاف انکار کر گیا اور بولا کہ ہم تو تمہارے ساتھ مذاق کر رہے تھے ۔	۳۔ بانسری والا چوہوں کو لیکر کہاں جا رہا ہے؟ (گاؤں سے باہر) **تصویر نمبر ۵** ۱۔ یہ کہاں کا منظر ہے؟ (ندی کا) ۲۔ بانسری والا کہاں ہے؟ (ندی میں) ۳۔ بانسری والے کے پاس کیا ہے؟
بانسری والے کو غصہ آگیا اس نے اپنے ہونٹوں سے بانسری لگائی اور بجانے لگا اور گاؤں کے بچے بانسری والے کے پاس جمع ہونے لگے ۔ اور گاؤں میں کوئی بچہ باقی نہ رہا ۔ بانسری والا جدھر جاتا بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتے ۔ بچوں کے ماں باپ نے بچوں کو بہت روکا اور ڈانٹا مگر وہ بچے بانسری والے کے ساتھ چلے گئے	۴۔ ندی میں گر کر چوہوں کا کیا حشر ہوا؟ (مرگئے) **تصویر نمبر ۶** ۱۔ بانسری والا چودھری سے کیا کہہ رہا تھا؟ (پیسے مانگ رہا تھا) ۲۔ چودھری کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ ۳۔ چودھری کو اب کیا کرنا چاہیے تھا؟ ۴ مگر چودھری کے ہاتھ کے اشارہ سے آپ کو کیا معلوم ہو رہا ہے؟ ۵۔ بانسری والا اب کیا کر رہا ہے؟ ۶۔ بانسری والے کی آواز کا اب کس پر اثر ہوا؟ **تصویر نمبر ۷** ۱۔ اس تصویر میں کون کون ہیں؟ ۲۔ بانسری والا کیا کر رہا ہے؟

نفس مضمون	طریقہ تدریس
چلتے چلتے بچے گاؤں کے باہر جنگل میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک غار تھا۔ بانسری والا غار میں داخل ہوا اور بچے بھی اس میں داخل ہو گئے۔ پھر یکایک غار کا منہ بند ہو گیا۔ آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بانسری والے اور بچوں کا کیا حشر ہوا۔ **اشارہُ انشاء** ١۔ گاؤں میں چوہوں کا ہونا ٢۔ گاؤں میں بانسری والے کا آنا ٣۔ بانسری بجانا اور چوہے اکٹھا کرنا ٤۔ چوہوں کو ساتھ لے کر باہر جانا۔	٣۔ بچے کیا کر رہے ہیں؟ ٤۔ بانسری والا کہاں جا رہا ہے؟ ٥۔ بچے کہاں جا رہے ہیں؟ اس موقع پر بتایا جائے گا کہ بانسری والا اور تمام بچے غار میں چلے گئے اور اس کے بعد غار کا منہ بند ہو گیا۔ ١۔ اس کہانی سے آپ کو کیا سبق ملتا ہے؟ ٢۔ گاؤں کے بچوں کا حشر کیوں خراب ہوا؟ سلسلے وار تصاویر دوبارہ آویزاں کر کے مندرجہ ذیل سوالات و نکات اخذ کئے جائیں گے اور تختۂ سیاہ پر لکھے جائیں گے؟ ١۔ گاؤں میں کیا چیز زیادہ ہو گئی تھی؟ ٢۔ گاؤں میں کون شخص آیا؟ ٣۔ بانسری والے نے کیا کہا؟ ٤۔ بانسری والے نے چوہوں کو اکٹھا کر کے کیا کیا؟ ٥ بانسری کی آواز سے چوہوں کا کیا انجام ہوا؟ ٦۔ پھر بانسری والا کہاں آ گیا تھا؟ ٧۔ بانسری والے نے چودھری سے کیا کہا تھا؟ ٨۔ چودھری نے کیا کہا؟

نفس مضمون	طریقہ تدریس
۵۔ بانسری کی آواز سے چوہوں کا ندی میں ڈوبنا	۹۔ چودھری کی بات سن کر بانسری والے نے کیا کہا؟
۶۔ بانسری والے کا دوبارہ گاؤں میں آنا۔	۱۰۔ بانسری کی آواز سے کیا نقصان ہوا؟
۷۔ بانسری والے کا چودھری سے روپے مانگنا۔	**عمل انشاء** تختۂ سیاہ پر سرخیاں قائم کرنے کے بعد طلبہ سے کہا جائے گا کہ وہ پوری کہانی سنائیں۔
۸۔ چودھری کا روپے دینے سے انکار کرنا۔	**اصلاح انشاء** کہانی سننے کے دوران جو غلطیاں ہوں گی ان کی اصلاح کرائی جائے گی۔
۹۔ بانسری والے کا دوبارہ بانسری بجانا	**اعادہ** بچوں سے دوبارہ وہی کہانی سنی جائے گی۔
۱۰۔ بانسری والے کا بچوں کو غار میں لے جانا۔	**گھر کا کام** بچوں سے کہا جائے گا کہ وہ کہانی کو زبانی یاد کر کے آئیں۔

تاریخ ——— ۱۶ اپریل ۱۹۷۲ء

جماعت ——— چہارم

مضمون ——— اردو (انشاء)

عنوان ——— "چالاک لومڑی"

اشیائے امدادی | مندرجہ ذیل واقعات پر مشتمل آٹھ تصویریں

۱۔ کھیت میں کسان اور اس کی بیوی کا کام کرنا اور لومڑی کا گھر کے اندر جھانکنا

۲۔ لومڑی کا مٹھائی چرا کر جنگل کی طرف بھاگنا۔

۳۔ لومڑی کا گڑھے میں گرنا۔

۴۔ لومڑی کا گڑھے سے باہر نکلنے کی ترکیب سوچنا

۵۔ لومڑی کا غار میں رہنے کی شرط پیش کرنا اور ہرن کو غار میں پناہ دینا۔

۶۔ شیر کا شرط منظور کرنا اور گڑھے میں کود جانا اور مختلف جانوروں کو جمع کر کے لومڑی کا چھینک دینا

۷۔ شیر کا لومڑی کو باہر پھینکنا

۸۔ لومڑی کا جنگل کی طرف بھاگ جانا۔

مقاصد تدریس

۱۔ طلباء کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کرنا

۲۔ مافی الضمیر کے اظہار خیال کا سلیقہ پیدا کرنا

۳۔ مربوط اور مسلسل اظہار خیال کی عادت ڈالنا

۴۔ قوت مشاہدہ کی نشوونما کرنا۔

۵۔ طلبا میں مل جل کر رہنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۶۔ بچوں میں عقل سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کرنا۔

۷۔ کہانی سے لطف اندوز کرانا۔

کہانی | بچوں کو کہانی سے قریب تر لانے کے لئے مندرجہ ذیل کہانی سنائی جائے گی اور آخر میں چند سوالات کئے جائیں گے۔

کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ جنگل میں اور ہزاروں جانور بھی تھے۔ شیر روزانہ ایک جانور کو کھا جاتا تھا۔ لہذا جنگل میں جانوروں کی کمی ہونے لگی، جس سے شیر کو شکار کی تکلیف ہوتی تھی اور جانور بھی پریشان تھے کہ اس طرح تو سارے جانور ختم ہو جائیں گے۔ ایک دن تمام جانور شیر کے پاس گئے اور کہنے لگے حضور آپ کو شکار میں بہت تکلیف ہوتی ہے ہم روزانہ ایک جانور آپ کو بھیجدیا کریں گے۔ یہ بات شیر کی سمجھ میں آگئی۔ اب ہر روز ایک جانور شیر کے پاس بھیج دیا جاتا۔ ایک دن لومڑی کی باری آئی، تو وہ گھر سے دیر کر کے چلی اور دیر ہی سے شیر کے پاس پہنچی تو شیر بہت غصہ میں تھا کیونکہ اس کو بہت بھوک لگی تھی۔ اس نے غصہ میں گرج کر کہا، کہاں رہ گئی تھی کم بخت لومڑی۔ اس نے عاجزی سے جواب دیا حضور میں تو گھر سے جلدی ہی چلی تھی لیکن راستے میں ایک اور شیر مل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس سے جان بچا کر آ رہی ہوں۔ شیر غصہ میں تھا کہنے لگا مجھے اس کے پاس لے چل میں ابھی اس کو مزہ چکھاتا ہوں۔ لومڑی شیر کو ایک کنوئیں پر لے گئی اور بولی وہ شیر اس کنوئیں میں ہے۔ شیر نے جب کنوئیں میں جھانکا تو اس کو اپنا عکس نظر آیا۔ اس نے سمجھا یہی دوسرا شیر ہے اور بلا سوچے سمجھے اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی، اور ڈوب کر مر گیا

تو بچو! اس طرح لومڑی نے اپنی عقلمندی سے اور چالاکی سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچائی۔

سوالات

۱۔ تمام جانور کیوں پریشان تھے ؟ (اس لئے کہ شیر جانوروں کو کھا جاتا تھا)

۲۔ انہوں نے شیر سے کیا کہا ؟ (مختلف جوابات)

۳۔ لومڑی نے اپنی جان کس طرح بچائی ؟ (چالاکی اور عقلمندی سے)

اعلان سبق

بچو آج ہم اسی طرح کی ایک اور کہانی "چالاک لومڑی" تصویروں کی مدد سے پڑھیں گے۔

پیشکش

کہانی کا تسلسل اور طلباء کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے آج کا سبق ایک جزو میں پڑھایا جائے گا۔

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
	کہانی سے متعلق تصاویر کا چارٹ سلسلہ وار پیش کر کے کہانی اخذ کرائی جائے گی۔
تصویر نمبر ۱	آپ کے خیال میں یہ گھر کس کا ہو سکتا ہے؟ (کسان کا) یہ جگہ کون سی ہو سکتی ہے؟ (کھیت) جو لوگ کھیتوں میں کام کرتے ہیں ان کو کیا کہتے ہیں؟ (کسان) بتائیے ان کے گھر میں کون جھانک رہا ہے؟ (لومڑی) **سُرخی :-** کھیت میں میاں بیوی کا کام کرنا اور لومڑی کا ان کے گھر میں جھانکنا۔
تصویر نمبر ۲	آپ کو اس مکان کی کھڑکی اور دروازہ کیسا نظر آ رہا ہے؟ (کھلا ہوا) لومڑی کیا کر رہی ہے؟ (کھڑکی میں سے جھانک رہی ہے) سامنے میز پر کیا چیز رکھی ہے؟ (مٹھائی) بتائیے یہ مٹھائی کس میں لپٹی ہوئی ہے؟ (کیلے کے پتے میں) مٹھائی دیکھ کر لومڑی کے دل میں کیا خیال آیا؟ (مٹھائی کھانے کا)

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
	سُرخی لومڑی کا مٹھائی چرا کر جنگل کی طرف بھاگنا۔
تصویر نمبر ۳	
	اس تصویر میں لومڑی کے منھ میں کیا ہے؟ (کیلے کے پتے میں مٹھائی) یہ مٹھائی اس کے پاس سے کہاں سے آئی؟ (کسان کے گھر سے) لومڑی کس طرف جا رہی ہے؟ (جنگل کی طرف) غور سے دیکھ کر بتایئے لومڑی کہاں دیکھ رہی ہے۔ (اوپر سامنے) یہ سامنے کیا نظر آ رہا ہے (گڑھا)
	سُرخی لومڑی کا مدہوشی کے عالم میں مٹھائی کھاتے ہوئے آنا اور سامنے گڑھا واقع ہونا۔
تصویر نمبر ۴	
	اس تصویر میں لومڑی کہاں ہے؟ (گڑھے کے اندر) لومڑی کے ہاتھ میں کیا ہے؟ (کیلے کا پتہ)
	جب لومڑی نے اپنے آپ کو گڑھے میں پایا ہوگا تو کیا محسوس کیا ہوگا؟ (پریشانی۔ شرمندگی) گڑھے کے باہر کون کھڑا ہے؟ (ہرن) آپ کے خیال میں جب لومڑی گڑھے کے اندر گری ہوگی تو کیا

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
	کیا ہوگا (چیخنا - چلانا) اچھا بتائیے ہرن یہاں کیوں کھڑا ہے ؟ (لومڑی کی آواز سن کر) کیلے کے پتے کو پکڑنے سے کیا ظاہر ہوتا ہے (جیسے کچھ پڑھ رہی ہے) **وضاحت** لومڑی ہرن پر یہ ظاہر کرنے لگی جیسے وہ پڑھ رہی ہو، اور بولی آج کا دن منحوس ہے آج دنیا تباہ ہو جائے گی جو بچنا چاہتا ہے اس غار میں پناہ لے۔ ہرن نے لومڑی کی بات سن کر کیا کیا ہوگا ؟ (پریشان ہوگیا ہوگا) پھر اس نے لومڑی سے کیا کہا ہوگا ؟ (غار میں آنے کی اجازت) **وضاحت** لومڑی نے کہا یہ مقدس جگہ ہے یہاں چھینکنا منع ہے اگر تم چھینکو گے تو میں آنے نہیں دوں گی - یہ سن کر ہرن نے کیا کیا ہوگا ؟ (شرط منظور کرلی) **سُرخی** لومڑی کا غار میں رہنے کی شرط پیش کرنا اور ہرن کا غار میں پناہ لینا ۔

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
تصویر نمبر ۵	
	اس تصویر میں غار کے اندر کون نظر آرہا ہے؟ (لومڑی اور ہرن) گڑھے کے کنارے پر کون کھڑا ہے؟ (شیر) شیر کیسے آیا؟ (لومڑی کی آواز سن کر) جب شیر نے لومڑی اور ہرن کو دیکھا تو کیا کہا ہوگا (تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو) لومڑی نے شیر کو کیا جواب دیا؟ (وہی دیا ہوگا جو ہرن کو دیا) یہ سن کر شیر نے کیا کہا ہوگا؟ (گڑھے میں آنے کی اجازت) شیر کے گڑھے میں آنے کی انہوں نے کیا رکھی تھی؟ (نہ چھینکنے کی) یہ شرط شیر نے کیا کی ہوگی؟ (منظور کر لی ہوگی)
	سُرخی
	شیر کا شرط منظور کرنا اور گڑھے میں کود جانا۔
تصویر نمبر ۶	
	اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ (مختلف جانور) یہ سب جانور گڑھے میں کیوں گر گئے؟ (پناہ لینے کے لئے) پناہ لینے کے لئے لومڑی نے کیا شرط رکھی تھی؟ (نہ چھینکنے کی)
	سُرخی
	لومڑی کا شرط منوا کر مختلف جانوروں کو گڑھے میں جمع کرنا۔
تصویر نمبر ۷	
	اب آپ کو لومڑی کہاں نظر آرہی ہے؟ (جنگل سے باہر) بتائیے لومڑی گڑھے سے کس طرح باہر آگئی؟ (چھینک لی ہوگی)

نفس مضمون	طریقۂ تدریس
	اچھا بتائیے لومڑی کیوں چھینکی ؟ (غار سے باہر آنے کے لئے) سُرخی : لومڑی کا چھینک کر غار سے باہر نکلنا ۔
تصویر نمبر ٣	اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ (جنگل اور لومڑی) لومڑی کہاں جا رہی ہے ؟ (جنگل کی طرف) آپ کے خیال میں لومڑی کیوں چھینکی ؟ (غار سے باہر نکلنے کے لئے) لومڑی نے اپنی جان کس طرح بچائی ؟ (چالاکی سے) اگر آپ امتحان میں پاس ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے (خوشی) سُرخی : لومڑی کا غار سے باہر آکر جنگل کی طرف بھاگنا ۔ اشارات سبق : طلباء کو تصویر دکھا کر اور ایک تصویر کا مواد اخذ کرکے اشارات انشاء تختۂ سیاہ پر درج کئے جائیں گے ۔ ١۔ لومڑی کا مٹھائی چرا کر جنگل کی طرف بھاگنا ٢۔ لومڑی کا گڑھے میں گرنا اور باہر نکلنے کی ترکیب سوچنا ٣۔ لومڑی کا غار میں رہنے کی شرط پیش کرنا اور ہرن کا غار میں پناہ لینا شیر کا شرط منظور کرنا ۔ لومڑی کا چھینکنا ، گڑھے سے باہر نکالدیا جانا اور جنگل کی طرف بھاگنا ۔ **عملی انشاء** تختۂ سیاہ پر اشارات تحریر کرنے کے بعد طلباء سے کہا جائیگا کہ اشارات اور تصویر کی مدد سے کہانی مکمل کریں ۔

تاریخ ——— ۵ را پریل ۱۹۷۲ء

جماعت ——— پنجم

مضمون ——— اردو انشاء

عنوان ——— لالچ بری بلا ہے

اشیائے امدادی

سات بڑی تصویریں مندرجہ ذیل تفصیلات پر مشتمل ہوگی :-

۱۔ جنگل کا منظر، دو بلّیوں کا ہونا اور ان کے درمیان ایک روٹی

۲۔ روٹی کے لئے دو بلّیوں کا لڑنا اور درخت سے بندر کا دیکھنا

۳۔ دو بلّیاں ۔ بندر ۔ بندر کے ہاتھ میں ترازو ۔

۴۔ بلّیوں کا بیٹھنا ۔ اور بندر کا ترازو کے پلڑوں میں روٹی تولنا

۵۔ بلّیوں کا انتظار میں بیٹھنا اور بندر کا روٹی کھانا

۶۔ بندر کا روٹی تولنا اور سیدھا پلڑا جھک جانا اور دونوں بلّیوں کا بیٹھنا

۷۔ بندر کے ہاتھ میں ترازو اور اس کا درخت پر چڑھنا

معلومات سابقہ :

طالبات مختلف قسم کی کہانیاں پڑھ اور سن چکے ہیں ۔

مقاصد تدریس

مقاصد عام

۱ ما فی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ پیدا کرنا

۲ قوت مشاہدہ اور قوتِ تخیل کی نشوونما کرنا

۳ ذخیرہ الفاظ میں توسیع کرنا

مقاصد خاص

۱۔ طلبہ میں باہم میل جول کا جذبہ پیدا کرنا

۲۔ مل جل کر رہنے کی صلاحیت پیدا کرنا

۳۔ لالچ کے بُرے نتائج سے آگاہ کرنا

تمہیدی کہانی

ایک کتا منہ میں روٹی کا ٹکڑا لئے جا رہا تھا۔ راستہ میں اسے ایک دریا ملا۔ جب وہ دریا پار کرنے لگا۔ تو اسے پانی میں اپنا عکس نظر آیا۔ اُس نے اِسے دوسرا کتا سمجھا اور اس سے روٹی کا ٹکڑا چھیننا چاہا۔ جونہی اس نے اسے لینے کے لئے منہ کھولا اُس کے منہ کا ٹکڑا بھی گر گیا اب نہ وہاں کوئی دوسرا کتا تھا اور نہ ہی اس کے منہ کا روٹی کا ٹکڑا۔ وہ اپنی لالچ پر بہت شرمندہ ہوا کیونکہ لالچ میں آ کر اس نے اپنا ٹکڑا بھی پانی میں گرا دیا تھا۔

تمہیدی سوالات

۱۔	کتے کے منہ میں کیا تھا؟	(روٹی کا ٹکڑا)
۲۔	وہ کیا پار کر رہا تھا؟	(دریا پار کر رہا تھا)
۳۔	دریا کے پانی میں اس نے کیا دیکھا؟	(اپنا عکس)
۴۔	اپنے عکس کو اس نے کیا سمجھا؟	(دوسرا کتا)
۵۔	ٹکڑا چھیننے کے لئے اس نے کیا کیا؟	(منہ کھولا)
۶۔	منہ کھولنے سے کیا ہوا؟	(ٹکڑا گر گیا)

اعلان سبق

آج ہم اور آپ مل کر ایسی ہی ایک کہانی "لالچ بُری بلا ہے" تصویروں کی زبانی پڑھیں گے۔

پیشکش زیر تدریس سبق ایک جزو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

طریقہ تدریس	نفسِ مضمون
تصاویر آویزاں کر کے سوالات کے ذریعہ کہانی اخذ کرائی جائے گی اور ساتھ کہانی کے اشارات بھی مرتب کئے جائیں گے ۔ **تصویر نمبر ۱ آویزاں کر کے** ۱۔ (تصویر دکھا کر) اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ (دو بلّیاں) ۲۔ اس بلّی کا رنگ کیسا ہے ؟ (کالا) ۳۔ دوسری بلّی کا رنگ کیسا ہے ؟ (سفید) ۴۔ دونوں بلّیوں کے درمیان کیا چیز رکھی ہوئی ہے ؟ (روٹی) ۵۔ کتنی روٹیاں ہیں ؟ (ایک) ۶۔ جب دو بلّیوں کے درمیان ایک روٹی ہوگی تو کیا ہوگا ؟ (لڑائی) **اشارہ** جنگل کا منظر ۔ دو بلّیوں کا بیٹھنا اور ان کے درمیان ایک روٹی **تصویر نمبر ۲ آویزا کر کے** ۱۔ اس تصویر میں سفید بلّی کالی بلّی سے کیا مانگ رہی ہے ؟ (روٹی) ۲۔ دونوں بلّیاں آپ کو کس حالت میں نظر آ رہی ہیں ؟ (لڑتی ہوئی)	ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو بلّیاں بھوک کی تاب نہ لا کر خوراک کی تلاش میں جا رہی تھیں اتفاق کی بات ہے کہ ان میں سے کالی بلی کو روٹی مل گئی اور وہ بہت خوش ہوئی ۔ سفید بلّی نے کالی سے کہا کہ تھوڑی روٹی مجھے بھی دے کالی بلّی نے کہا، یہ روٹی مجھے ملی ہے اس پر میرا حق ہے میں روٹی نہیں دوں گی ۔ اس پر سفید بلّی لڑنے لگی ۔ درخت پر ایک بندر بیٹھا ان دونوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا ان کو لڑتا دیکھ کر بندر ترازو لے کر نیچے آیا اور بلّیوں سے کہا، تم کیوں لڑ رہی ہو لاؤ میں انصاف سے آدھی آدھی روٹی بانٹ دوں ، دیکھو میرے پاس ترازو ہے بندر کی بات سن کر دونوں بلّیاں راضی ہو گئیں ۔

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
روٹی بندر کو دے دی بندر نے روٹی کے دو ٹکڑے کئے اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر تولنے لگا۔ جب اس نے روٹی تولی، تو الٹے ہاتھ کا پلڑا جھک گیا جب ترازو کے پلڑے میں روٹی زیادہ ہوگئی تو اس میں سے تھوڑی روٹی نکالی اور اسے کھا گیا۔ پھر بندر نے دوبارہ ترازو کے پلڑوں میں روٹی رکھی اور تولنے لگا۔ اس مرتبہ سیدھے ہاتھ کے پلڑے میں روٹی زیادہ ہوگئی اور پلڑا جھک گیا۔ بندر نے اس میں سے بھی تھوڑی روٹی نکالی اور کھا گیا۔ بندر اسی طرح کرتا جاتا	۳۔ درخت پر کون سا جانور بیٹھا ہے؟ (بندر) ۴۔ بندر کا رنگ کیسا ہے؟ (بھورا) ۵۔ بندر درخت کے اوپر سے کیا دیکھ رہا ہے؟ (بلّیوں کا لڑنا) **اشارہ** روٹی کے لئے دونوں بلیوں کا لڑنا اور درخت کے اوپر سے بندر کا دیکھنا۔ **تصویر نمبر ۳ آویزاں کرکے** ۱۔ اس تصویر میں آپ کون کون سے جانور دیکھ رہے ہیں۔ (بلّیاں اور بندر) ۲۔ بندر کے ہاتھ میں کیا ہے؟ (ترازو) ۳۔ بندر ترازو کیوں لایا ہے؟ (روٹی تولنے کیلئے) ۴۔ بندر نے بلّیوں سے روٹی آدھا کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے کیا جواب دیا؟ (راضی ہوگئیں) ۵۔ بلّیوں نے روٹی کس کو دی؟ (بندر کو) **اشارہ** (دو بلّیاں۔ بندر اور بندر کے ہاتھ میں ترازو) **تصویر نمبر ۴ آویزاں کرکے** ۱۔ اس تصویر میں کالی بلّی کس طرف بیٹھی ہوئی ہے؟ (دائیں طرف)

نفس مضمون	طریقہ تدریس
تھا، اور روٹی کھاتا جاتا تھا یہاں تک کہ روٹی کا صرف ایک نوالہ باقی رہ گیا۔ تب بلیوں نے کہا کہ اب یہ نوالہ ہمیں واپس دے دو ہم خود انصاف سے بانٹ لیں گے بندر نے جواب دیا کہ یہ نوالہ میرے انصاف کی فیس ہے۔	۲۔ سفید بلی کس طرف بیٹھی ہے؟ (بائیں طرف) ۳۔ دونوں کے درمیان کیا ہے؟ (بندر) ۴۔ بندر کے سامنے کیا رکھا ہے؟ (ترازو) ۵۔ بندر کے ہاتھ میں کیا ہے؟ (روٹی کے ٹکڑے) ۶۔ بندر روٹی کے ٹکڑے کہاں رکھ رہا ہے؟ (ترازو کے پلڑوں میں) ۷۔ ترازو کے پلڑوں میں کیا ہے؟ (ترازو) ۸۔ روٹی رکھنے سے ترازو کا کون سا پلڑا جھک گیا؟ (الٹا پلڑا) ۹۔ ترازو کا الٹا پلڑا کیوں جھک گیا؟ (روٹی کے وزن سے)
نتیجہ طلبہ کو کہانی کا نتیجہ اخذ کرانے کے لئے ان سے مندرجہ ذیل سوالات کئے جائیں گے: ۱۔ آپ نے اس کہانی سے کیا نتیجہ نکالا؟ لالچ کا انجام برا ہوتا ہے بلی نے لالچ میں آکر اپنی روٹی کھودی۔	**اشارہ** بندر کا بیٹھنا اور بندر کا ترازو میں روٹی تولنا۔ **تصویر نمبر ۵ آویزاں کر کے** ۱۔ بلیوں کو کتنی روٹی چاہئے؟ (برابر برابر) ۲۔ اس تصویر میں بلیاں کس کے انتظار میں بیٹھی ہیں؟ (روٹی کے) ۳۔ تھوڑی روٹی کھانے کی وجہ سے کیا ہوگا؟ (روٹی برابر ہو جائے گی) وضاحت، اشارہ (بلیوں کا انتظار میں بیٹھنا اور بندر کا روٹی کھانا)

طریقہ تدریس	نفسِ مضمون
تصویر نمبر ۶ آویزاں کرکے ۱۔ اس تصویر میں بلیاں کیا کر رہی ہیں؟ (بیٹھی ہیں) ۲۔ بندر کے ہاتھ میں کیا ہے؟ (ترازو) ۳۔ وہ ترازو میں کیا تول رہا ہے؟ (روٹی) ۴۔ اب ترازو کا کونسا پلڑا جھکا ہوا ہے؟ (سیدھا پلڑا) ۵۔ جب بندر نے پہلی بار روٹی کھائی تھی تو کونسا پلڑا جھک گیا تھا؟ (الٹا پلڑا) ۶۔ الٹا پلڑا کیوں جھک گیا تھا؟ (روٹی زیادہ تھی) ۷۔ اب سیدھے پلڑے میں روٹی زیادہ ہے تو بندر کیا کرے گا؟ (تھوڑی روٹی کھا جائے گا) **وضاحت** اس موقع پر بتایا جائے گا کہ بندر اس طرح ترازو میں روٹی تولتا جاتا تھا اور کھاتا جاتا تھا یہاں تک کہ صرف ایک نوالہ باقی رہ گیا تو بلیوں نے بندر سے کہا کہ اب یہ روٹی واپس کردو۔ بندر نے جواب دیا یہ تو میری فیس ہے جو میں نے تم دونوں کا فیصلہ کیا اس طرح وہ آخری نوالہ بھی کھا گیا۔ **اشارہ** بندر کا روٹی تولنا اور سیدھا پلڑا جھک جانا اور دونوں بلیوں کا بیٹھنا۔	**اصلاحِ انشا۔** طلبہ سے کہانی لکھنے کے دوران جو غلطیاں سرزد ہوں گی ان کی اصلاح کی جائے گی انفرادی غلطیاں کاپیوں پر اور اجتماعی غلطیاں تختۂ سیاہ پر لکھ کر درست کی جائیں گی۔

طریقہ تدریس	نفس مضمون
تصویر نمبر ۲ آویزاں کرکے ۱۔ بندر کے کندھوں پر کیا ہے؟ (ترازو) ۲۔ ترازو لیکر بندر کہاں گیا؟ (درخت پر چڑھ گیا) ۳۔ بلّیاں کیسی نظر آ رہی ہیں؟ (شرمندہ) ۴۔ اگر بلّیاں آپس میں نہ لڑتیں تو ان کو کیا چیز برابر ملتی؟ (روٹی) ۵۔ بلّیوں نے لالچ میں آکر کیا کیا؟ (اپنی روٹی کھو دی) **اشارہ** بندر کا ہاتھ میں ترازو لیکر درخت پر چڑھنا **اشاراتِ انشاء** دوبارہ سلسلہ وار تصاویر دکھا کر طلباء سے بذریعہ سوالات کہانی کے اشارات مرتب کئے جائیں گے۔ ۱۔ جنگل کا منظر۔ بلیاں اور ان کے درمیان روٹی ۲۔ دو بلّیاں روٹی کے لئے لڑتی ہیں اور درخت پر بندر بیٹھا ہوا ہے۔ ۳۔ دو بلیاں۔ بندر اور بندر کے ہاتھ میں ترازو **عمل انشاء** اشارات قائم کر دینے کے بعد اشارات اور تصاویر کی مدد سے دو تین بچوں سے مکمل کہانی سنی جائے گی۔ **اعادہ** جس بچّے نے بہتر طور پر یہ کہانی مکمل کی ہوگی اس سے کہانی دوبارہ سنی جائے گی۔	**گھر کا کام** اس کہانی کو گھر سے لکھکر لائیے۔

تاریخ ــــــــــ ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۲ء

جماعت ــــــــــ ششم

مضمون ــــــــــ اردو انشاء (تحریری اور تصویری)

عنوان ــــــــــ احسان فراموشی کا انجام

اشیائے امدادی

کہانی سے متعلق چھ۶ عدد تصویریں

۱۔ شہزادہ جنگل سے گذر رہا ہے۔

۲۔ شاہزادہ پٹاری کی مدد سے سانپ کو آگ سے باہر نکال رہا ہے

۳۔ پٹاری زمین پر رکھی ہے اور سانپ اس میں پھن نکالے بیٹھا ہے۔

۴۔ سانپ اور شہزادہ گائے کے پاس کھڑے ہیں۔

۵۔ سانپ اور شہزادہ لومڑی کے پاس فیصلہ کرانے آئے ہیں۔

۶۔ سانپ پٹاری کے اندر جا رہا ہے اور شہزادہ سانپ کو پٹاری سمیت آگ میں پھینک دیتا ہے۔

معلومات سابقہ | طلبہ کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اس سے پہلے بھی کئی سبق آموز کہانیاں پڑھ چکے ہیں۔

مقاصد عام:۔

۱۔ طلبہ کی ذہنی نشوونما کرنا

۲۔ طلبہ کی قوت غور و فکر کو جنبش دینا۔

۳۔ طلبہ میں مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ پیدا کرنا

۴۔ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کرنا

۵۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا

۶۔ طلبہ میں دلچسپ اور دل آویز اسلوب بیان کی صلاحیت پیدا کرنا۔

مقاصدِ خاص | طلبہ کو احسان فراموشی کا انجام پڑھاتے ہوئے انہیں یہ بتانا کہ کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرنا چاہئیے۔

تمہید | طلبہ کو کہانی سے قریب ترلانے کے لئے ان کو مندرجہ ذیل کہانی تمہید کے طور پر سنائی جائے گی۔

تمہیدی کہانی | ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی جنگل سے گذر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک پنجرے پر پڑی جس میں شیر بند تھا اور مدد کے لئے چلّا رہا تھا۔ آدمی رحم دل تھا اس نے شیر کو آزاد کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے قریب آکر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔

شیر پنجرے سے نکلتے ہی آدمی پر لپکا اور کہنے لگا مجھے سخت بھوک لگی ہے اس لئے میں تجھ کو کھا جاؤں گا۔ آدمی شیر کی بات سن کر گھبرا گیا اور کہنے لگا " میں نے تجھ پر رحم کھایا، تجھے آزاد کیا اور تو مجھے ہی کھانا چاہتا ہے کیا یہی میرے احسان کا انجام ہے "

اتفاق سے ایک لومڑی اُدھر سے گذر رہی تھی اس نے ان دونوں کو لڑتے دیکھا تو قریب آکر پوچھا کیا قصہ ہے ؟ آدمی نے جب تمام واقعہ لومڑی کو سنایا تو لومڑی شیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ مہاراج یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے سے پنجرے میں آپ کیسے چلے گئے۔

شیر بولا اگر تم کو یقین نہیں آتا تو تمہارے سامنے اس پنجرے میں جاکر دکھاتا ہوں۔ جیسے ہی شیر پنجرے کے اندر داخل ہوا، آدمی نے جلدی سے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا اور ہنس کر کہا کہ جنگل کے راجہ اس پنجرے میں آرام کیجئے میں تو جا رہا ہوں۔ اس طرح شیر کو احسان فراموشی کا بدلہ مل گیا۔

تمہیدی سوالات |

۱۔ آدمی نے جنگل میں کیا دیکھا ؟ (ایک شیر کو)

۲۔ شیر کس میں بند تھا ؟ (پنجرے میں)

۳۔ شیر کو پنجرے سے باہر کس نے نکالا ؟ (آدمی نے)

۴۔ آدمی کی جان لومڑی نے کس طرح بچائی ؟ (اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے)

۵۔ شیر نے باہر نکلنے کے بعد آدمی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ (آدمی کو کھا جانا چاہا)

۶۔ اچھا تو یہ بتائیے شیر کو کس کا بدلہ ملا ؟ (احسان فراموشی کا)

اعلان سبق

آج ہم آپ کو ایسی ہی ایک کہانی تصویروں کی زبانی سنائیں گے جس کا عنوان ہے،

"احسان فراموشی کا انجام"

پیشکش :- زیر تدریس سبق ایک جزو میں پڑھایا جائے گا۔

نفسِ مضمون	طریقۂ تدریس
مواد کہانی	**فراہمی مواد اور سرخیوں کا قیام**
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہزادہ جنگل سے گذر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک جھاڑی پر پڑی جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی اور ایک سانپ اس میں گھرا ہوا تھا اس نے شہزادے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو کہا "اے نیک دل شہزادے مجھے اس آگ سے باہر نکال دے تو تیری بڑی مہربانی ہوگی" شہزادہ رحم دل تھا جب اس نے سانپ کو اس حالت میں دیکھا تو اس کو ترس آگیا چنانچہ اس نے نیزے میں پٹاری لٹکا کر سانپ کے آگے کر دی سانپ اس میں داخل ہو گیا۔ شہزادے نے پٹاری کو باہر نکال لیا، اور اس کے منہ کو کھول کر سانپ سے کہا "میں نے تجھے آگ سے باہر نکال دیا ہے	سلسلہ وار تصاویر پیش کر کے مندرجہ ذیل سوالات کے ذریعہ کہانی کا مواد اخذ کیا جائے گا۔ **تصویر نمبر ۱** ۱۔ اس تصویر میں آپ کس جگہ کا منظر دیکھ رہے ہیں؟ (جنگل کا) ۲۔ جنگل میں آپ کو کیا کیا چیزیں دکھائی دے رہی ہیں؟ (گھوڑ سوار۔ جلتی ہوئی جھاڑی میں سانپ) ۳۔ اس وقت سانپ کا کیا حال ہے۔ (تڑپ رہا ہے اور گھبرایا ہوا ہے) ۴۔ اگر آپ خطرے میں گھر جائیں تو آپ کا کیا حال ہوتا ہے؟ (گھبرا جاتے ہیں) ۵۔ اگر اس گھبراہٹ کے عالم میں کوئی آدمی نظر آجائے تو آپ کیا کرتے ہیں؟ (مدد کے لئے پکارتے ہیں) ۶۔ سانپ نے مدد کے لئے کسے پکارا؟ (شہزادے کو)

نفسِ مضمون

اب جہاں جی چاہے جا۔

شہزادے کی یہ بات سن کر سانپ نے اپنا پھن اٹھایا اور کہا جب تک میں تجھے اور تیرے گھوڑے کو ڈس نہ لوں گا اس وقت تک یہاں سے ہرگز نہ جانے دوں گا۔"

شہزادہ سانپ کی یہ بات سن کر بہت پریشان ہوا اور کہا

"میں نے تیری جان بچائی ہے اور تو مجھے ہی ڈسنا چاہتا ہے۔"

سانپ نے جواب دیا کہ،

"میں تجھے اور تیرے گھوڑے کو ضرور ڈسوں گا"

شہزادے نے پریشان ہو کر کہا۔

اچھا تو پھر کسی ثالث کے پاس چلو وہ جو کچھ فیصلہ کر دے گا ہم دونوں اس پر عمل کریں گے۔ سانپ راضی ہو گیا لہٰذا دونوں ایک گائے کے پاس گئے اور اس کو تمام واقعہ سنایا۔

گائے نے کہا جو سانپ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے تمہاری نیکی کا یہی انجام ہونا

طریقۂ تدریس

اشارہ نمبر ۱

شہزادے کا جنگل میں جانا اور سانپ کو آگ میں گھرا ہوا دیکھنا

تصویر نمبر ۲

۱۔ اس تصویر میں آپ کو کیا چیزیں نظر آ رہی ہیں؟
(شہزادہ اور جلتی ہوئی جھاڑی میں سانپ)

۲۔ شہزادہ کیا کر رہا ہے؟ (سانپ کو آگ سے باہر نکال رہا ہے)

۳۔ سانپ کو کس چیز کے ذریعہ باہر نکال رہا ہے؟
(نیزے میں پٹاری لٹکا کر)

۴۔ سانپ کہاں پر ہے؟ (جلتی ہوئی جھاڑی کے اندر)

اشارہ نمبر ۲

شہزادے کا رحم کھا کر پٹاری کے ذریعہ سانپ کو آگ سے باہر نکالنا۔

تصویر نمبر ۳

۱۔ اس تصویر میں آپ سانپ کو کہاں دیکھ رہے ہیں؟
(پٹاری میں)

۲۔ سانپ کو آگ سے باہر کیسے نکالا؟ (شہزادے نے)

۳۔ سانپ کس طرح بیٹھا ہے؟ (پھن پھیلائے)

۴۔ سانپ کس وقت پھن پھیلاتا ہے؟ (غصے میں)

۵۔ سانپ کے ڈسنے کے خیال سے شہزادے نے کیا کیا محسوس کیا؟
(ڈر۔ خوف)

نفس مضمون	طریقہ تدریس
چاہیئے۔ کیونکہ اس دنیا کا دستور ہے، اس کے ساتھ جو بھی بھلائی کی جاتی ہے یہ اس کے ساتھ برائی کرتی ہے مجھے ہی دیکھو جب تک میں دودھ دیتی ہوں میرا مالک بہت قدر کرتا تھا لیکن جب میں دودھ دینا چھوڑ دیا اس نے میری قدر کرنی بھی چھوڑ دی۔ اب میں جنگل میں ماری ماری پھر رہی ہوں لہذا تمہارے احسان کا بدلہ یہی ہونا چاہیئے۔ شہزادہ بڑا ہوشیار تھا کہنے لگا، ایک اور کا فیصلہ بھی لے لیں پھر جو چاہے کرنا۔ چنانچہ سانپ اس مرتبہ بھی راضی ہو گیا اور اتفاق سے انہیں ایک لومڑی نظر آئی۔ انہوں نے لومڑی سے کہا، اے لومڑی ہمارا فیصلہ کرتی جاؤ لومڑی بولی کیا قصہ ہے؟ شہزادے نے لومڑی کو بتایا کہ کہ میں نے سانپ کو آگ سے باہر نکالا	۶۔ شہزادے نے اپنی جان کا خطرہ محسوس کر کے کیا کیا؟ (ثالث کا مشورہ دیا) **وضاحت** جب شہزادے نے خطرہ محسوس کیا تو سانپ نے کہا کہ چلو کسی جانور سے فیصلہ کروائیں۔ **اشارہ نمبر ۳** سانپ کا پٹاری سے باہر آ کر شہزادے کو ڈسنے کی کوشش کرنا۔ **تصویر نمبر ۴** ۱۔ تصویر میں آپ سانپ کو کہاں دیکھ رہے ہیں؟ (پٹاری میں) ۲۔ شہزادہ فیصلہ کرانے کے لئے کس کے پاس گیا؟ (گائے کے پاس) ۳۔ سانپ کو دیکھ کر گائے کی کیا حالت تھی؟ (ڈر گئی) ۴۔ ڈر کے مارے گائے نے کس کے حق میں فیصلہ دیا؟ (سانپ کے حق میں) **وضاحت** گائے نے کہا اس دنیا کا دستور یہی ہے اس کے ساتھ جو بھی بھلائی کرتا ہے اس کے ساتھ یہ برائی کرتی ہے اور گائے نے اپنا پورا قصہ سنایا۔

طریقہ تدریس	نفس مضمون
۵ ۔ گائے کا فیصلہ سن کر سانپ نے کیا محسوس کیا ؟ (خوشی) ۶ ۔ شہزادے نے جان بچانے کے لئے کیا کیا ؟ (دوسرے جانور کو ثالث بنانے کا فیصلہ کیا) **اشارہ نمبر ۴** شہزادے کا جان بچانے کے لئے گائے کو ثالث بنانا ۔ **تصویر نمبر ۵** ۱ ۔ اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ (شہزادہ ۔ سانپ اور لومڑی) ۲ ۔ لومڑی اپنی کس عادت کی وجہ سے مشہور ہے ؟ (چالاکی کی وجہ سے) ۳ ۔ لومڑی نے اپنی چالاکی کی وجہ سے کس کے حق میں فیصلہ دیا ؟ (شہزادے کے حق میں) **اشارہ نمبر ۵** شہزادے کا گائے کے بعد لومڑی سے فیصلہ کرانا ۔ **تصویر نمبر ۶** ۱ ۔ اس تصویر میں آپ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ (شہزادہ ، سانپ لومڑی) ۲ ۔ اب سانپ کہاں ہے ؟ (پٹاری میں)	اور اس کی جان بچائی ، اور اب یہ مجھے ہی ڈسنا چاہتا ہے ۔ چونکہ لومڑی بہت چالاک اور مکار جانور ہے اس نے شہزادے کو بچانے کی ایک ترکیب سوچی اور کہنے لگی کہ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اتنی سی پٹاری میں اتنا بڑا سانپ کیسے آگیا ؟" سانپ نے کہا تو میری طرف دیکھ میں ابھی جاکر دکھاتا ہوں" لومڑی نے کہا یہ بات ٹھیک ہے ۔ اس کے بعد میں فیصلہ کردنگی لہذا سانپ پٹاری میں گھس گیا تو شہزادے نے جلدی سے پٹاری کا منہ بند کرکے اسے آگ میں پھینک دیا اور اس طرح سانپ کو اپنے کئے کا انجام مل گیا ۔

نفس مضمون	طریقہ تدریس
	۳۔ شہزادے نے پٹاری کو کہاں پھینکدیا؟ (آگ میں) ۴۔ آگ میں گرنے کے بعد سانپ پر کیا گذری؟ (جل کر مرگیا) **اشارہ نمبر ۶** لومڑی کے فیصلہ پر شہزادے کا سانپ کو آگ میں پھینکدینا۔
نتیجہ ہمیں کسی کو فریب نہیں دینا چاہیئے اور مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کرنی چاہیئے اور کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔	**نتیجہ** اس کہانی سے آپنے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ اس کہانی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے احسان کا صلہ ادا کرنا چاہیئے اور مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آنا چاہیئے۔
	عمل انشاء تصویر اور اشارات کی مدد سے کسی طالبعلم سے کہانی سنی جائے گی اس کے بعد دوسرے لڑکوں کو لکھنے کے لئے کہا جائے گا۔ **اصلاح انشاء** کہانی لکھنے کے دوران طلبہ سے جو غلطیاں ہوں گی ان کی اصلاح کرائی جائے گی۔ **اعادہ** جس نے پوری کہانی لکھی ہوگی اس سے سنی جائے گی۔ **گھر کا کام** جو طلبہ پوری کہانی نہیں لکھ سکے ہیں وہ اسے گھر سے مکمل کرکے لائیں گے۔

فہرست مآخذ

۱۔ ادب و لسانیات ________ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

۲۔ ادبی مقالات ________ مبشر علی صدیقی

۳۔ آدابِ اُردو ________ حکیم گلچیں کرنالی

۴۔ اُردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم ________ مولوی عبد الحق

۵۔ اُردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات ________ میجر آفتاب حسن

۶۔ اُردو املا کا آسان طریقہ ________ عبد الغفار مدھولی

۷۔ اُردو زبان اور اسالیب ________ مخمور اکبر آبادی

۸۔ اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ ________ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

۹۔ اُردو زبان اور اس کا رسم الخط ________ مسعود حسن رضوی ادیب

۱۰۔ اُردو کیسے پڑھائیں ________ سلیم عبد اللہ

۱۱۔ اُردو زبان کی تعلیم ________ سلیم فارانی

۱۲۔ اُردو زبان کا ارتقاء ________ ڈاکٹر شوکت سبزواری

۱۳۔ ابتدائی مدرسوں کی نصابی کمیٹی کی سفارشات مطبوعہ حکومت پاکستان ۱۹۵۹ء

۱۴۔ اصولِ تعلیم ________ غلام السیدین

۱۵۔ پنجاب میں اُردو ________ حافظ محمود خاں شیرانی

۱۶۔ تدریس علوم ________ مطبوعہ پنجاب ایڈوائزری بورڈ لاہور

۱۷۔ تعلیمی نفسیات ________ عبد الحی علوی

۱۸۔ ثانوی مدرسوں کی نصابی کمیٹی کی سفارشات مطبوعہ حکومت پاکستان ۱۹۵۸ء

۱۹۔ خطاطی اور ہمارا رسم الخط ________ سید یوسف بخاری

۲۰۔ خطبات عبد الحق ________ مولوی عبد الحق

۲۱ ۔ دلی کا دبستان شاعری ـــــــ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

۲۲ ۔ دکن میں اردو ـــــــ نصیرالدین ہاشمی

۲۳ ۔ رومن رسم الخط اور پاکستان ـــــــ سید عبدالقدوس ہاشمی

۲۴ ۔ زبان اور علم زبان ـــــــ عبدالقادر سروری

۲۵ ۔ کھیل میں تعلیم ـــــــ محمد داؤد

۲۶ ۔ کیفیہ ـــــــ پنڈت دتاتریا کیفی

۲۷ ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ـــــــ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۲۸ ۔ لسانی مطالعے ـــــــ پروفیسر معین الدین دردائی

۲۹ ۔ مادری زبان کی تعلیم ـــــــ (اردو ترجمہ) مصنفہ ڈبلو، ایم، رائیپرن

۳۰ ۔ مادری زبان کی تعلیم ـــــــ یونس حسن فروغ علوی

۳۱ ۔ مقالات اردو تدریس کانفرنس ـــــــ مرتبہ پروفیسر وقار عظیم

۳۲ ۔ مجلدات ثانوی تعلیم اور تعلیم و تدریس ـــــــ مرتبہ ڈاکٹر محمد عبدالعزیز

۳۳ ۔ نقوش سلیمانی ـــــــ علامہ سید سلیمان ندوی

۳۴ ۔ نظم و نسقِ مدرسہ ـــــــ مطبوعات پنجاب ایڈوائزری بورڈ لاہور

۳۵ ۔ وضع اصطلاحات ـــــــ مولوی وحیدالدین سلیم

THE ORAL METHOD OF TEACHING BY PALMER ۔ ۳۶

HOW TO TEACH READING BY STANLEY HALL ۔ ۳۷

THE PRACTICAL STUDY OF LANGUAGES BY SWEET ۔ ۳۸

THE TEACHING OF THE MOTHER TONGUE BY BALLARD ۔ ۳۹

VACUBULARY BUILDING BY TAYLOR ۔ ۴۰

LANGUAGE ITS NATURE AND DEVELOPMENT ۔ ۴۱
BY OTTO JESPERSON

BASIC PRINCIPLES OF WRITING BY OTTO BIRK ۔ ۴۲

THE SENTENCE METHOD OF TEACHING -۴۳
BY JAGGER.

ON WRITING OF ENGLISH BY WARNER. -۴۴

THE PLAY WAY BY H. CALDWELL COOK. -۴۵

HOW TO TEACH ENGLISH COMPOSITION -۴۶
BY FINCH.

HOW TO TEACH FOREIGN LANGUAGE -۴۷
BY JASPERSON.

ٹائیٹل پرنٹ
مرکنٹائل پرنٹنگ پریس فون : ۷۲۸۶۴

RS. 11.50